اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور • کراچی • پاکستان

پروفیسر مفتی منیب الرحمن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد نہم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
	چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
	صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
کمپوزنگ	محمد جمشید ہاشمی
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	بار اول جنوری 2017ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ9

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com
ziaulquranpublications@gmail.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرس

آغازِ تکلُّم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَحْمَةٍ لِّلْعٰلَمِيْنَ، سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَعَلٰى صَحَابَتِهِ الصِّدِّيْقِيْنَ الْكَامِلِيْنَ، وَعَلٰى اَوْلِيَاءِ اُمَّتِهٖ وَعُلَمَاءِ مِلَّتِهٖ مِنَ الْفُقَهَاءِ الْمُجْتَهِدِيْنَ وَالْمُفَسِّرِيْنَ وَالْمُحَدِّثِيْنَ اَجْمَعِيْنَ

الحمدللہ علیٰ احسانہ! تفہیم المسائل کی نویں جلد پیشِ خدمت ہے۔ ربِ ذوالجلال کا شکر ہے کہ تسلسل کو قائم رکھنے میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اس جلد کی تدوین وتبویب اور حوالہ جات نکالنے میں مفتی عبدالرزاق نقشبندی کا تعاون شاملِ حال رہا ہے۔ حوالہ جات کی اصل سے تطبیق، تراجم اور نفسِ مسائل پر نظرِ ثانی اور نہایت باریک بینی سے پروف ریڈنگ اور تصحیح کا کام مولانا بختیار احمد نے کیا ہے۔ کمپیوٹر پر تصحیح کا آخری مرحلہ حافظ محمد جمشید ہاشمی نے انجام دیا ہے۔ میں اپنے ان تمام معاونین کا تہہِ دل سے شکرگزار ہوں اور ان کی علمی صلاحیت، قابلیت اور استعداد میں اللہ تعالیٰ کے حضور برکات کے لیے دعا گو ہوں۔

ہمارے شیخ الحدیث علامہ احمد علی سعیدی نے بھی اس جلد کے تمام مندرجات کو پڑھا ہے، مکررات کی نشاندہی کی اور بعض مقامات پر مسائل کی تصحیح بھی کی، میں بطورِ خاص ان کا شکرگزار ہوں۔ علامہ مفتی محمد الیاس رضوی نے حسبِ معمول آخر میں اسے بہ نظرِ عمیق دیکھا اور ضروری ترمیمات واضافے تجویز کیے، میں ان کا ممنون ہوں۔ بشری استطاعت کی حد تک یہ کتاب اغلاط سے پاک ہے، لیکن تسامحات کا امکان ہمیشہ رہتا ہے، اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کسی بھی فروگزاشت پر مطّلع ہوں تو ضرور نشاندہی فرمائیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ یہ سلسلۂ خیر جاری رکھے اور اس کی افادیت میں برکت عطا فرمائے۔

المفتقر الی اللہ الغنی

منیب الرحمٰن

عقائد کے مسائل

کُتُبِ الٰہیہ

سوال:

ہمارے خاندان میں ایک صاحب کا عقیدہ ہے کہ "آسمانی جتنی بھی کتابیں ہیں، سب قابلِ عمل ہیں، نہ وہ منسوخ ہوئیں اور نہ اس کا ثبوت ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کتابیں منسوخ ہوگئیں، وہ کافر ہے"۔ یہ صاحب قادیانیوں کو اہلِ حق اور مسلمان شمار کرتے ہیں۔ کیا ان عقائد کا حامل شخص مسلمان ہے اور اُس کا نکاح قائم ہے؟۔

(خلیل احمد، بلاک 6 گلشن اقبال کراچی)

جواب:

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ختم المرسلین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاءِ کرام ورُسلِ عظام علیہم السلام دینِ اسلام ہی کے داعی اور علم بردار تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

ترجمہ: "بے شک اللہ کے نزدیک (مقبول) دین، اسلام ہی ہے"۔ (آلِ عمران:19)

(۲) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝

ترجمہ: "اور جس نے اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو پسند کیا، تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا"۔ (آلِ عمران:85)

(۳) شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ ؕ اَللّٰهُ یَجْتَبِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ۝

ترجمہ: "اس (اللہ) نے تمہارے لیے اُسی دین کو مشروع (مقرر) کیا ہے، جس کا حکم اُس

نے نوح کو دیا تھا اور جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم وموسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو حکم دیا تھا (اس تاکید کے ساتھ) کہ تم اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا، جس دین (توحید) کی طرف آپ مشرکوں کو دعوت دے رہے ہیں، یہ اُن پر بہت بھاری اور گراں گزرتا ہے، اللہ ہی جسے چاہتا ہے اس (پسندیدہ) دین کے لیے منتخب فرمالیتا ہے، اور جو اُس کی طرف رجوع کرتا ہے، وہ اُسے اس کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔ (شوریٰ:13)

الغرض دین اسلام کی بنیادی عقائد (توحید ورسالت وآخرت وکتب الٰہی پر ایمان، تقدیر پر ایمان، عبادات وغیرہ) تمام انبیاء کرام کی تعلیمات کا حصہ رہے ہیں۔ البتہ مختلف رسولوں کی شریعتوں اور تفصیلی احکام میں فرق رہا ہے۔ دین اسلام کبھی منسوخ نہیں ہوا ہے، شریعتیں یعنی تفصیلی احکام میں نسخ اور تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا

ترجمہ: ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شریعت اور واضح راہِ عمل بنائی ہے''۔ (مائدہ:48)

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ دینِ اسلام اور اصولِ دین ہمیشہ ایک رہے ہیں، اسلام کے بنیادی اصول وعقائد دائمی ہیں اور غیر متبدل (Unchangeable) ہیں اور ناقابلِ تنسیخ (Irrevocable) ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ، آیت:48 میں واضح فرمادیا کہ رسولوں کی شریعت اور منہاج یعنی تفصیلی احکام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت تفاوت رہا ہے، اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ اور خاتم الکتب الالٰہیہ قرآنِ مجید کے نزول کے بعد دینِ اسلام قائم ودائم رہا، مگر سابق انبیاء کرام کی شریعتیں یعنی تفصیلی احکام منسوخ ہوگئیں اور اب شریعتِ مصطفوی ہی قیامت تک نافذ العمل (Implemented) اور معمول بہا (Applicable) رہے گی۔

مندرجہ ذیل اَحادیثِ مبارکہ اس پر شاہدِ عدل ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ سابق انبیائے کرام کی شریعتوں کو منسوخ ماننے والا کافر ہے، تو مسلمان کو کافر کہنے والا خود کافر ہو جائے گا۔ اِسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر (بفرضِ محال) موسیٰ علیہ السلام میرے عہدِ نبوت میں، جو کہ قیامت تک کے لیے ہے، آجائیں تو اُن کے لیے میری اتباع کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔ اب اَحادیثِ مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ حِيْنَ اَتَاهُ عُمَرُ فَقَالَ: اِنَّا نَسمَعُ أَحَادِيثَ مِنَ الیَهُوْدِ تُعْجِبُنَا أَفَتَرَى أَن نَكْتُبَ بَعْضَهَا، فَقَالَ: أَمُتَهوِّكُونَ اَنتُم كَمَا تَهَوَّكَتِ اليَهُودُ وَالنَّصَارَى، لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيضَاءَ نَقِيَّةً، وَلَوْكَانَ مُوسىٰ حَيًّا مَاوَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِي۔

ترجمہ: ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو عرض کی: بے شک ہم لوگ یہود سے بہت سی باتیں سنتے ہیں جو ہمیں اچھی لگتی ہیں، کیا آپ مناسب سمجھتے اور رائے دیتے ہیں کہ ہم لوگ ان میں سے کچھ لکھ لیا کریں؟، آپ ﷺ نے زجر و انکار کے طور پر فرمایا: کیا تم لوگ دین اسلام کے بارے میں اس طرح حیرت میں ہو (اور اس کے کامل دین ہونے میں تمہیں شک ہے)۔ جس طرح یہود و نصاریٰ حیرت و شبہات کی وادیوں میں بھٹکنا شروع ہوگئے تھے۔ بے شک میں تمہارے پاس ایک صاف و روشن شریعت لے کر آیا ہوں۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا یعنی اب میری شریعت کے آنے کے بعد سابق شرائع منسوخ ہوگئی ہیں“۔

(مسند احمد بن حنبل:15156)

(۲) عَنْ جَابِرٍ اَنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ اَتٰی رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاةِ فَسَكَتَ فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَوَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ يَتَغَيَّرُ، فَقَالَ اَبُوبَكرٍ: ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ اَمَا تَرٰى مَابِوَجْهِ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ فَنَظَرَ عُمَرُ اِلٰى وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَغَضَبِ رَسُولِهٖ ﷺ رَضِيْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِالِاسلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ

نَبِيًّا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوسٰى فَاتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِي۔

ترجمہ:'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رسول اللہ ﷺ کے پاس تورات کا ایک نسخہ لائے، آپ ﷺ خاموش رہے اور وہ اُسے پڑھنے لگے اور رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر ناراضی کے آثار ظاہر ہونے لگے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیری ماں تجھ کو روئے، تو رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک (کے تاثرات) کو نہیں دیکھتا، حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھا اور کہا: میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے غضب سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، بے شک ہم اللہ کو رب ماننے، اسلام کو دین کی حیثیت سے اختیار کرنے اور محمد ﷺ کی رسالت پر راضی ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے، اگر آج موسیٰ علیہ السلام آجائیں تو کیا تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو گے، (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم گمراہ ہو جاؤ گے، اگر موسیٰ (آج) زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو ان کے لیے میری پیروی لازم ہوتی''۔ (سنن دارمی:439)

(۳) كَيْفَ بِكُمْ إِذَا نَزَلَ بِكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ فَأَمَّكُمْ أَوْ قَالَ: وَإِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔

ترجمہ:'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ (منظر تمہارے لیے) کتنا عظیم ہوگا جب مسیح ابن مریم تمہارے درمیان نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا، (مسند احمد بن حنبل: 7680)'' (یعنی وہ اُس وقت مستقبل بالذات نبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ آپ ﷺ کے اُمتی کی حیثیت میں آئیں گے)۔

جو شخص دینِ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی پیروی کرے گا، وہ کافر و مرتد ہے اور کافر کو کافر سمجھنا ہی اسلام ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے، اس کے رسول مکرم ﷺ نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ میں کافر کو کافر کہا اور خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرینِ زکوٰۃ اور منکرینِ ختمِ نبوت کو مرتد قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کیا۔ مذکورہ

شخص اگر اپنے کفریہ عقائد سے عَلانیہ توبہ کرے، تجدیدِ ایمان کے بعد (اگر شادی شدہ ہے تو تجدیدِ نکاح بھی ضروری ہے) اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا میل جول رکھنا جائز ہوگا۔

قرآن مجید سے پہلے کی الہامی کتب اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں، ان کا برحق ماننا قرآن پر ایمان لانے کا لازم ہے، کیونکہ قرآن مجید اپنے (سے پہلی) کُتب کا مُصدِّق (تصدیق کرنے والا) ہے۔ اسی لیے ہمارے ایمانیات اور بنیادی عقائد میں تمام کُتُبِ الٰہی پر ایمان شامل ہے، کیونکہ نبوت و رسالت ایک تسلسل کا نام ہے۔ البتہ خاتم الکتب قرآن مجید کے نزول کے بعد ان کی شریعت اب معمول بہا یا نافذ العمل نہیں ہے۔ ان میں تحریف بھی ہو چکی ہے اور قرآن مجید یہود کی تحریف پر شاہد ہے، قرآن اُن کی اصل کُتبِ الٰہیہ کا مصدِّق ہے، نہ کہ تحریف شدہ کتب کا۔ ہمارے لیے ایک جامع ضابطہ یہ ہے کہ سابق کُتبِ سماوی، جو موجودہ شکل میں ہمارے سامنے ہیں، ان کی جو تعلیمات قرآن کریم کے مطابق ہیں، ہم اُن کی تصدیق کریں گے اور جو قرآن کریم کے خلاف ہیں، اُن کو رَد کردیں گے اور جو نہ موافق ہیں نہ مخالف، اُن کے بارے میں سُکوت اختیار کریں گے۔

قادیانی شرعی اور آئینی طور پر دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ کو آخری نبی ماننا اُمتِ مسلمہ کا متفقہ، قطعی حتمی اور لازمی عقیدہ ہے، ایمان کی اساس ہے، قادیانی اِس عقیدے سے منحرف ہیں۔ تمام علماء کا مُتفقہ فتویٰ ہے کہ قادیانی کافر ہیں، پاکستان کی پارلیمنٹ نے بھی 4 ستمبر 1974ء کو دوسری آئینی ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو مرتد قرار دیا۔ قادیانیوں کو مسلمان کہنا پاکستان کے دستور سے بھی غداری ہے اور ایسا شخص مسلمان نہیں رہتا، کیونکہ قادیانیوں کو مسلمان سمجھنا عقیدۂ ختم نبوت کے انکار کو مستلزم ہے اور عقیدۂ ختمِ نبوت کا منکر کافر ہے، ختمِ نبوت پر اُمّت کا اجماع ہے، لہٰذا اس عقیدہ کے بارے میں کوئی بھی تاویل یا توجیہ قابلِ قبول نہیں ہے۔

عَلانیہ گناہ کی توبہ عَلانیہ ہوگی

سوال: ایک شخص عَلانیہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، کیا تنہائی میں کی گئی اُس شخص کی توبہ قبول

ہو جائے گی؟۔(منور احمد نعیمی، ملیر کراچی)۔

جواب: عَلانیہ طور پر کیے گئے گناہ کی توبہ بھی عَلانیہ کی جائے گی اور جو گناہ پوشیدہ کیے ہوں، اُن کی توبہ پوشیدہ ہوگی اور جس فعل میں کسی بندے کی حق تلفی ہوئی ہو، اس کی تلافی شریعت کے مطابق کرنی ہوگی اور جہاں اُس شخص سے معافی مانگنے سے تلافی ہوسکتی ہو، وہاں معافی مانگنی ہوگی۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں: ''اُس کی توبہ صرف یہی نہ ہوگی کہ اللہ عزوجل کے حضور تائب ہو، بلکہ لازم ہوگا کہ عَمرو سے اپنے قصور کی معافی مانگے کہ وہ نہ صرف حق اللہ بلکہ حق العبد میں بھی گرفتار ہے اور تنہائی میں توبہ بھی کافی نہ ہوگی، اس نے مجمع میں گناہ کیا ہے، مجمع ہی میں توبہ کرے۔ حدیث میں ہے: نبی ﷺ فرماتے ہیں:

اِذَا عَمِلْتَ سَیِّئَۃً فَاَحدِث عِندھَا تَوبَۃً اَلسِّرُّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃُ بِالْعَلَانِیَۃِ، وَاللہ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

ترجمہ: ''جب تو کوئی گناہ کرے تو چھپے گناہ کی خفیہ اور برملا گناہ کی اعلانیہ توبہ کرو، واللہ تعالیٰ اعلم''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد23، ص:324)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ''اور جو گناہ علانیہ کیا ہو، اُس کی توبہ بھی علانیہ چاہیے اور پوشیدہ کی پوشیدہ''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد22، ص:258)

مکمل حدیث مبارک یہ ہے:

عَنْ عَطَاءٍ اَنَّ رَسُولَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ لَہٗ مُعَاذٌ: اَوْصِنِی یَارَسُولَ اللہِ، قَالَ: عَلَیْكَ بِتَقْوَی اللہِ مَا اسْتَطَعْتَ، وَاذْکُرِ اللہَ عِنْدَ کُلِّ شَجَرٍ وَحَجَرٍ، وَاِذَا عَمِلْتَ سُوْءًا فَاَحْدِثْ لَہٗ تَوْبَۃً، اَلسِّرُّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃُ بِالْعَلَانِیَۃِ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو (قاضی بنا کر) یمن کی طرف بھیجا، حضرت معاذ نے عرض کی: یارسول اللہ! مجھے وصیت فرمائیے، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ پر کاربند رہو اور ہر شجر وحجر کے پاس (یعنی ہر جگہ) اللہ کو یاد کرو

اور جب (کسی بشری کمزوری کے تحت) تم سے گناہ صادر ہو جائے، تو اس پر توبہ کرو۔ جو گناہ خلوت میں کیا ہو، اس کے لیے خلوت میں توبہ کرنا کافی ہے اور جو گناہ علانیہ (برسرِ عام) کیا ہو، اس پر علانیہ توبہ کرنی ہوگی"۔ (احادیث اسماعیل بن جعفر، جلد 1، ص:455)

جنت کی اہمیت کو کم کرنا

سوال: فاروقی مسجد گلشن اقبال میں دورانِ محفل یہ شعر پڑھا گیا:

کوئی مر رہا ہے بہشت پر، کوئی چاہتا ہے نجات کو
میں تجھی کو چاہوں خدا کرے، میری اس دعا کا سلام لو

محفل میں موجود مفتی صاحب نے فرمایا: یہ شعر درست نہیں اور سب کو تجدید ایمان کروایا۔ اس بارے میں دینی رائے کیا ہے؟، (محمد ابراہیم میمن، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر جنت کے حسن ورعنائی کو انتہائی خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے اور جابجا اہلِ ایمان کی رغبت کے لیے اُس کے دلکش نظاروں اور بے پایاں نعمتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ جنت کی دائمی نعمتوں کا بیان کیا گیا ہے تاکہ اُن کے دل میں جنت کی خواہش پیدا ہو اور اُس کے حصول کے لیے اعمالِ خیر کا جذبہ پیدا ہو۔ سورۃ الرحمٰن میں "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ" کو 31 مرتبہ تکرار کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے اور اِس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں، خاص طور پر جنت کے انعامات کا تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

جَنَّتَانِ مِن فِضَّةٍ آنِیَتُھُمَا وَمَا فِیھِمَا وَجَنَّتَانِ مِن ذَھَبٍ آنِیَتُھُمَا وَمَا فِیھِمَا وَمَا بَینَ القَومِ وَبَینَ أَن یَنظُرُوا اِلَی رَبِّھِم اِلَّا رِدَاءَ الکِبرِ عَلَی وَجھِهٖ فِی جَنَّةِ عَدنٍ۔

ترجمہ: "دو جنتیں چاندی کی ہیں، ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے (وہ چاندی کا ہے) اور دو جنتیں سونے کی ہیں، اُن کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے (وہ سونے کا ہے) اور جنت عدن میں لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے دیدار کے درمیان اُس کی کبریائی کی چادر ہے یعنی اللہ

تعالیٰ کی ذات بندوں کے لیے ایک (غیر مادی) حجاب میں ہے''۔(صحیح بخاری:4878)

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی تجلیات کے دیدار کی بشارت دی ہے، ارشاد فرمایا:''اور (اہلِ جنت) کے چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی تجلیات کا دیدار کررہے ہوں گے''۔(القیامہ:23-22)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے جن محبوب بندوں کو اپنے دیدار سے نوازتا ہے، اُن کے اندر اس کی استعداد بھی پیدا فرمادیتا ہے، جیسا کہ معراج النبی ﷺ کی شب رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا دیدار فرمایا۔

اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے جابجا جنت کی بشارت دی ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (توبہ:72)

ترجمہ:''اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے، جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور دائمی جنتوں میں پاکیزہ رہائش گاہوں کا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ کی رضا (ان سب سے) بڑی ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے''۔

پس قرآن مجید میں جنت کی صفات اور اس میں عطا کی جانے والی نعمتوں کو بار بار اور تکرار کے ساتھ بیان کرنے سے یہی مراد سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں میں حصولِ جنت کا ذوق وشوق پیدا ہو، حدیث پاک میں ہے:

اِنَّ الْجَنَّةَ حُفَّتْ بِالْمَكَارِهِ وَاِنَّ النَّارَ حُفَّتْ بِالشَّهَوَاتِ۔

ترجمہ:''جنت ناگواریوں اور مشقتوں سے گھری ہوئی ہے اور جہنم شہوتوں سے گھری ہوئی ہے''۔(مصنف ابن ابی شیبہ:34527)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جنت کا حصول کوئی آسان بات نہیں ہے، اس کے لیے راہِ حق میں طرح طرح کی عزیمتوں اور مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے، جب کہ اس کے برعکس جو اپنے نفس کی خواہشات کے تابع اور اسیر ہوجاتے ہیں، وہ دنیا میں تو ممکن ہے راحت

پالیں، لیکن انجامِ کار اُن کے لیے جہنم ہے۔ جنت مومن کا مطلوب ومقصود ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

ترجمہ: ''بے شک اللہ نے ایمان والوں سے اُن کی جانوں اور اُن کے مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا''۔ (توبہ:111)

علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''سب سے عظیم نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار اور اس کی رضا ہے لیکن یہ نعمت بھی جنت میں حاصل ہوگی۔ بعض جاہل شعراء اور جعلی اور بناوٹی صوفیہ جنت کی بہت تحقیر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دیدار اور اس کی رضا کی اہمیت بیان کر کے جنت کی طلب کو بہت گھٹیا اور بہت خسیس کہتے ہیں، حالانکہ قرآن اور حدیث میں جنت کی بہت فضیلت ذکر فرمائی گئی ہے اور اس کی طلب کی ترغیب دی گئی ہے اور جنت کو طلب کرنے کا حکم دیا ہے۔ نبی ﷺ نے خود بھی جنت کا سوال کیا ہے اور ہمیں بھی جنت الفردوس کی دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کا طلب گار مؤنث ہے، جنت کا طلبگار مخنث (ہیجڑا) ہے اور مولیٰ کا طلب گار مذکر ہے، اسی طرح یہ لوگ مدینہ منورہ کی طلب کے مقابلہ میں بھی جنت کی طلب کو گھٹیا اور خسیس کہتے ہیں ان کے اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں:

تیری میری چاہ میں زاہد بس اتنا فرق ہے
تجھ کو جنت چاہیے، مجھ کو مدینہ چاہیے

حالانکہ رسول اللہ ﷺ جس جگہ آرام فرما ہیں، وہ بلا مبالغہ جنت سے بھی افضل ہے، وہ بھی جنت کا ایک ٹکڑا ہے اور آخرت میں بھی آپ جنت کے سب سے نمایاں مقام میں ہوں گے، جسے دعا بعد الاذان کی حدیث میں ''مقامِ وسیلہ'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ تو حضور ﷺ کی قیام گاہ اول وآخر جنت ہی ہے۔ ہماری نظر میں مدینہ منورہ اور جنت میں تقابل کا یہ شِعار اختیار نہیں کرنا چاہیے اور اس کی آڑ میں عام مسلمانوں کے دلوں میں جنت کی اہمیت کو کم کرنے کا شِعار ترک کر دینا چاہیے، بلکہ دونوں کی فضیلت کو کسی تقابل کے بغیر

مثبت انداز میں بیان کرنا چاہیے۔ آج بھی مدینہ منورہ میں زمین کے جس حصے پر آپ تشریف فرما ہیں، اس کی افضلیت تو مسلّم ہے، لیکن یہ آپ کی عارضی قیام گاہ ہے اور آپ کی دائمی قیام گاہ جنت ہے اور روضۂ رسول بھی جنت میں جائے گا۔ پھر آپ کی دائمی قیام گاہ کے درجہ میں التزاماً کمی کرنا، کیا یہی آپ ﷺ سے عشق ومحبت کا تقاضا ہے۔ کبھی اللہ کی رضا کے مقابلہ میں بھی جنت کو کم درجہ کا اور گھٹیا کہا جاتا ہے کہ ہم کو جنت نہیں اللہ کی رضا چاہیے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جس جنت کی اللہ تعالیٰ نے بہت تعریف کی ہے اور اسکی طرف دوڑنے کا حکم دیا ہے تو اس کی اہمیت کو کم کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا یا ناراض؟۔ سب سے بلند درجہ اللہ تعالیٰ کا دیدار اور اس کی رضا کا ہے اور اس کے بعد جنت کا درجہ ہے لیکن یہ بلند درجات جنت ہی میں حاصل ہوں گے۔ اس لیے عام مسلمانوں کو ایمانِ کامل اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے جنت کے حصول کی طرف راغب کرنا کرنا چاہیے اور جنت کے حصول کی دعا کرتے رہنا چاہیے، حدیث میں ہے:

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَقَابُ قَوْسٍ فِي الجَنَّةِ، خَيْرٌ مِمَّا تَطْلُعُ عَلَيْهِ الشَّمْسُ وَتَغْرُبُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کمان کے ایک سر کے برابر جنت میں جگہ ان تمام جگہوں سے بہتر ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے''۔

(صحیح بخاری:2793، مسلم:1882، سنن نسائی:3118)

(۲) مَوْضِعُ سَوْطٍ فِي الجَنَّةِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا۔

ترجمہ: ''حضرت سہل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جنت میں ایک چابک کے برابر جگہ بھی دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے''۔

(صحیح بخاری:2792,3250، مسلم:1881)

جنت کو کم تر قرار دینے والے جاہل شعراء اور جعلی صوفیہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حصولِ جنت کی

دعا کی ہے: وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾

ترجمہ: ''اور (اے اللہ!) مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے بنا دے''۔

(الشعراء:85)

اور ہمارے نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی جنت کے حصول کی دعا کی ہے:

وَاَسْئَلُكَ الدَّرَجَاتِ الْعُلٰى مِنَ الْجَنَّةِ آمِيْن

ترجمہ: ''اور میں تجھ سے جنت کے بلند درجات کا سوال کرتا ہوں، آمین''۔

(المعجم الکبیر، جلد 23، ص:316)

اور جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے حصولِ جنت کی دعا کی ہے تو پھر جنت کی دعا کی اہمیت کو اپنا مدعا و مقصود بنانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ حدیث کافی ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَأَلَ اللهَ الْجَنَّةَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ الْجَنَّةُ: اَللّٰهُمَّ أَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ، وَمَنِ اسْتَجَارَ مِنَ النَّارِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ النَّارُ: اَللّٰهُمَّ أَجِرْهُ مِنَ النَّارِ

ترجمہ: ''جس شخص نے تین مرتبہ اللہ سے جنت کا سوال کیا تو جنت کہتی ہے: اے اللہ! اس کو جنت میں داخل کردے اور جس نے تین مرتبہ دوزخ سے پناہ طلب کی تو دوزخ کہتی ہے: اے اللہ! اسے آگ کے عذاب سے اپنی پناہ عطا فرما''۔

(سنن ترمذی:2572)، (تبیان القرآن، جلد 7، ص:221)

مسجدِ نبوی مدینۂ منورہ میں ہے۔ مدینۂ منورہ سے اہلِ ایمان کو بے پناہ عقیدت ومحبت ہے اور مسجدِ نبوی میں عبادت کا اجر بعض روایات کی رُو سے ہزار گنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

صَلَاةٌ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَام

ترجمہ: ''مسجدِ حرام کے سوا دیگر مساجد کے مقابلے میں میری مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب ہزار گنا ہے، (صحیح بخاری:1190)''۔ ایک اور روایت میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: گھر

میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گنا ہے اور جامع مسجد میں پانچ سو گنا اور مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی میں پچاس ہزار گنا اور مسجدِ حرام میں ایک لاکھ گنا ہے، (سنن ابن ماجہ: 1413)''۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

مَابَیْنَ بَیْتِی وَمِنْبَرِی رَوْضَةٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِی عَلٰی حَوْضِی۔

ترجمہ:'': میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض (یعنی حوضِ کوثر) پر ہے، (صحیح بخاری: 1888)''۔ ہر مسلمان، جسے مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہو، کی خواہش ہوتی ہے کہ چند لمحے ریاض الجنہ میں بیٹھنے، نماز پڑھنے اور تلاوت واذکار ودرود پڑھنے کا شرف نصیب ہوجائے، کیونکہ یہ جنت کا ٹکڑا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یقیناً یہ جنت میں جائے گا اور شاید یہاں بیٹھنے والوں کو اِس کی برکت سے جنت نصیب ہوجائے۔ امام احمد رضا قادری نے الملفوظ میں لکھا ہے:

''کعبۂ معظمہ اور تمام مساجد جنت میں جائیں گی اور روضۂ نبوی ﷺ کعبۂ معظمہ سے افضل ہے، تو روضۂ رسول بدرجۂ اَولیٰ جنت میں جائے گا اور تمام انبیاءِ کرام کی تُربتیں (یعنی قبریں) بھی جنت میں جائیں گی''۔ (الملفوظ، حصہ چہارم، ص: 528، ملخصاً)

صحابۂ کرام تو رسول اللہ ﷺ کے زیرِ سایہ اور آپ کی معیت میں مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور اس کے باوجود جنت کے طلب گار ہوتے تھے۔ حدیث مبارک میں ہے:

''غزوۂ اُحد کے موقع پر ایک شخص نے (جو میدانِ جنگ سے کچھ دیر کے لیے اپنی توانائی کو مجتمع کرنے آیا، وہ چند کھجوریں ہاتھ میں لے کر کھا رہا تھا کہ اس) نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''(یا رسول اللہ!) مجھے بتایئے کہ اگر میں (میدانِ جنگ میں لڑتے لڑتے) شہید ہوجاؤں تو میرا ٹھکانا کہاں ہوگا؟''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں''، تو (یہ سن کر) اس نے اپنے ہاتھ سے کھجوریں رکھ دیں (اور میدانِ جنگ میں کود پڑا) اور لڑتے لڑتے شہید ہوگیا''۔ (صحیح بخاری: 3820)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب صحابیِ رسول کو رسالت مآب ﷺ کی زبانِ

مبارک سے شہادت کی صورت میں جنت ملنے کا یقین ہوگیا تو اس نے مدینے میں رہتے ہوئے اتنی دیر بھی جنت سے دور رہنا پسند نہ کیا کہ وہ آرام سے چند کھجوریں کھا کر میدانِ جنگ میں کودتا بلکہ جنت کے حصول کے اشتیاق کا اس پر اتنا غلبہ ہوا کہ فی الفور میدانِ جنگ میں کود پڑا اور شہادت کا اعزاز پا کر جنت میں جا پہنچا۔

مدینۂ منورہ سے اظہارِ محبت کے ہزاروں انداز اختیار کیے جاسکتے ہیں، لیکن کیا اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا جنت سے تقابل کیا جائے اور جنت کو اہلِ محبت وعقیدت کی نظر میں کم تر کر کے پیش کیا جائے۔ یہ شِعار ان لوگوں نے عام کیا، جنہوں نے محبت وعشقِ رسول اللہ ﷺ کو مشن کی بجائے معاش بنالیا اور پھر اس طرح ابتذال پر مبنی اشعار ترتیب دیے تاکہ عوام کی عقیدت کو اپنے مقاصد کے لیے ابھارا جائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنت کے حصول کی تلقین وترغیب دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران:133)

ترجمہ: ''اور اپنے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جلدی کرو، جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے، اور وہ پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے''۔

مذکورہ بالا شعر پر کفر کا اطلاق تو نہیں ہوتا لیکن تقابل کا ایسا انداز کہ جس سے جنت کی بے توقیری کا تصور پیدا ہو یا اس کی اہمیت کم معلوم ہو، بہر حال ناپسندیدہ ہے اور اس شِعار کو ترک کرنا چاہیے۔ کلمہ پڑھ کر ایمان تازہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی ''تبیین المحارِم'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''(وہ اُمور جن کا جاننا ضروری ہے، اُن میں سے) حرمت اور کُفر کا سبب بننے والے کلمات ہیں۔ اور میری جان کی قسم! اس زمانے میں یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، کیونکہ آپ عوام کو غفلت (اور نادانی) میں اکثر کفریہ کلمات کہتے ہوئے سنتے ہیں اور احتیاط اِسی میں ہے کہ (دینی مسائل سے) نابلد شخص ہر روز تجدیدِ ایمان کرے اور وقتاً فوقتاً تجدیدِ نکاح کرے،

کیونکہ عورتوں سے بھی اکثر (نادانی میں) اس طرح کے کلمات سرزد ہوتے ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1 ص:122 ملخصاً)

شاید اِسی لیے برِّصغیر پاک وہند کے بعض علاقوں میں علماء نے نکاح کے موقع پر کلمے پڑھانے کا شِعار رائج کیا کہ مبادا کبھی بے خیالی اور نادانی میں کوئی کفریہ کلمہ سرزد ہوگیا ہوتو تجدیدِ ایمان ہوجائے۔

گنبدِ خضرا کی شبیہ کا حکم

سوال:

مسجد اقصیٰ اور مسجدِ حرام کے بعد کیا ہمارے آقا کریم ﷺ کے روضۂ مبارک کے گنبدِ خضریٰ سے کل کائنات میں کسی کا افضل واعلیٰ مقام ہے؟۔آج کل کاروباری مقاصد کے لیے پینا فلیکس پر اشتہار بنائے جاتے ہیں، اکثر اشتہارات میں انسانی تصویروں کے ساتھ گنبدِ خضریٰ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ انسانی تصاویر کبھی گنبد کے اوپر کبھی دائیں بائیں ہوتی ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟۔اِسی طرح دینی محافل میں اسٹیج پر بڑی بڑی پینا فلیکس اسکرین کعبۃ اللہ اور گنبدِ خضریٰ کی لگائی جاتی ہیں، اسٹیج پر بیٹھنے والے عکس کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھتے ہیں، کیا یہ بے ادبی ہے؟۔گنبدِ خضریٰ پر مبنی تصویر پر جب نظر پڑے تو کیا یہ تصور لازم نہیں ہے کہ اس کے نیچے رسول اللہ ﷺ کا روضہ ہے؟

(پیر خواجہ عبدالسلام نقشبندی، عظیم ٹاؤن، خانیوال)

جواب:

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا الْمَدِیْنَۃَ کَحُبِّنَا مَکَّۃَ أَوْ أَشَدَّ، اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَافِی صَاعِنَا وَفِی مُدِّنَا، وَصَحِّحْھَالَنَا، وَانْقُلْ حُمَّاھَا اِلَی الْجُحْفَۃِ۔

ترجمہ:''اے اللہ! ہمارے نزدیک مدینہ کو اس طرح محبوب بنادے، جس طرح ہمیں مکہ

محبوب ہے یا اس سے بھی زیادہ، اے اللہ! ہمارے صاع (چار کلو کا پیمانہ) میں اور ہمارے مُد (دو کلو کا پیمانہ) میں برکت دے اور مدینہ کی ہوا کو صحت آفریں بنادے اور اس کے بخار کو الجحفہ کی طرف منتقل کردے"۔ (صحیح بخاری:1889)

(۲) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

اَللّٰھُمَّ اجعَل بِالمَدِینَةِ ضِعفَیْ مَابِمَکَّةَ مِنَ البَرَکَةِ۔

ترجمہ: "اے اللہ! جتنی برکتیں مکہ میں نازل کی ہیں، اس کی دوگنی برکتیں مدینہ میں نازل فرما"۔ (صحیح مسلم:3313)

(۳) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

مَابَینَ بَیْتِی وَمِنْبَرِی رَوضَةٌ مِن رِیَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِی عَلٰی حَوضِی۔

ترجمہ: "میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے"۔ (صحیح بخاری:1888)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَمَکَّةُ افضلُ مِنهَا عَلَی الرَّاجِحِ، اِلَّا مَاضَمَّ أَعْضَائَہُ عَلَیہِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ فَاِنَّہٗ أفضلُ مُطْلقاً حَتّٰی مِنَ الْکَعْبَةِ وَالْعَرْشِ وَالْکُرْسِیِّ۔

ترجمہ: "راجح قول یہ ہے کہ مکہ افضل ہے، مگر وہ جگہ جو رسول اللہ ﷺ کے جسمِ اقدس سے متصل ہے، وہ مطلقاً (تمام جگہوں سے) افضل ہے، یہاں تک کہ کعبہ، عرش اور کرسی سے (بھی) افضل ہے"۔ (جلد 4، ص:47، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری نے الملفوظ میں لکھا ہے: "کعبۂ معظمہ اور تمام مساجد جنت میں جائیں گی اور روضۂ نبوی ﷺ کعبۂ معظمہ سے افضل ہے، تو روضۂ رسول بدرجۂ اَولیٰ جنت میں جائے گا اور تمام انبیاءِ کرام کی تُربتیں (یعنی قبریں) بھی جنت میں جائیں گی"۔

(الملفوظ، حصہ چہارم، ص:528، ملخصاً)

مسجدِ نبوی میں عبادت کا اجر بعض روایات کی رُو سے ہزار گنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ

کا فرمان ہے:

صَلَاۃٌ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ صَلَاۃٍ فِیْمَا سِوَاہُ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامِ

ترجمہ: ''مسجدِ حرام کے سوا دیگر مساجد کے مقابلے میں میری مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب ہزار گنا ہے''۔ (صحیح بخاری:1190)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

صَلَاۃُ الرَّجُلِ فِیْ بَیْتِہٖ بِصَلَاۃٍ، وَصَلَاتُہٗ فِیْ مَسْجِدِ الْقَبَائِلِ بِخَمْسٍ وَعِشْرِیْنَ صَلَاۃً، وَصَلَاتُہٗ فِی الْمَسْجِدِ الَّذِیْ یُجْمَعُ فِیْہِ بِخَمْسِ مِائَۃِ صَلَاۃٍ وَصَلَاتُہٗ فِی الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰی بِخَمْسِیْنَ/ اَلْفِ صَلَاۃٍ وَصَلَاتُہٗ فِیْ مَسْجِدِیْ بِخَمْسِیْنَ أَلْفَ صَلَاۃٍ، وَصَلَاتُہٗ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَۃِ أَلْفِ صَلَاۃٍ۔

ترجمہ: ''گھر میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گنا ہے اور جامع مسجد میں پانچ سو گنا اور مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی میں پچاس ہزار گنا اور مسجدِ حرام میں ایک لاکھ گنا ہے''۔ (سنن ابن ماجہ:1413)

امام احمد رضا قادری نے لکھا:

طیبہ نہ سہی افضل، مکہ ہی بڑا زاہد
ہم عشق کے بندے ہیں، کیوں بات بڑھائی ہے

یعنی ہوسکتا ہے کہ شرعی ضابطے کی رُو سے نماز کے اجر کی مقدار کے اعتبار سے مکہ افضل ہے، لیکن ایک افضل (Superior) چیز کے مقابلے میں مفضول (Inferior) چیز زیادہ محبوب ہوسکتی ہے، جیسے باپ افضل ہے لیکن بیٹا محبوبیت میں زیادہ ہوتا ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''شیخ ابن تیمیہ اور ان کے موافقین کے سوا تمام مُتقدمین اور متاخرین علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کائنات کی ہر جگہ سے افضل ہے، حتّٰی کہ کعبہ اور عرش سے بھی افضل ہے۔

قاضی عیاض مالکی متوفّٰی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

وَلَا خِلَافَ اَنَّ مَوْضِعَ قَبْرِهٖ اَفْضَلُ بِقَاعِ الْاَرْضِ

ترجمہ: ''اس بات میں علماء کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی جگہ تمام روئے زمین سے افضل ہے''۔ (شفاء جلد 2 ص:91، دارالفکر بیروت)

تمام علماء تسلسل اور تواتر کے ساتھ قبرانور کی تمام روئے زمین پر فضیلت کا اظہار کرتے رہے تا آنکہ آٹھویں صدی میں شیخ ابن تیمیہ حنبلی نے اس کا سب سے پہلے انکار کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرانور کی افضلیت پر میرے شیخ علامہ سید سعید احمد کاظمی قدس سرہٗ نے یہ دلیل دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر ہیں، اور وہ اللہ کے شکر گزار بندے ہیں کیونکہ تمام انبیاء شاکرین ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم:7) ''اگر تم شکر کرو تو میں تمہاری نعمتوں میں زیادتی کروں گا''۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو زمین سے چوتھے آسمان کی بلندی پر لے گیا اگر اس سے زیادہ بلندی اور عظمت عرش پر ہوتی تو اللہ تعالیٰ آپ کو عرش پر لے جاتا کیونکہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو زمین پر لاکر قرب قیامت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں دفن کرائے گا، معلوم ہوا کہ عظمت اور بلندی عرش پر نہیں آپ کے قُرب اور جوار میں ہے اور اس جگہ ہے جہاں آپ مدفون ہیں اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی قبرِ انور عرشِ معلیٰ سے افضل ہے۔

میرے استاذ علامہ عطا محمد بندیالوی مدظلہ نے فرمایا: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ (سورۃ البلد:2-1) ''میں اس شہر کی قسم صرف اس وجہ سے کھاتا ہوں کہ آپ اس شہر میں چلتے پھرتے ہیں''۔ مکہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ کی وجہ قسم بننے کی عزت اور کرامت صرف اس وجہ سے ملی ہے کہ آپ اس شہر میں ہیں اور جب آپ مدینہ منورہ گئے تو وہ فضیلت مدینہ کو حاصل ہوئی، جب آسمانوں پر گئے، تو آسمانوں کو عزت ملی، عرش پر پہنچے تو عرش کو کرامت ملی اور اب جس جگہ آرام فرما ہیں وہ جگہ سب سے افضل ہے۔ مجھے یہ سمجھ آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ مدفون ہیں (خواہ اس کو بیت قرار دیں یا قبر) اس کے متعلق آپ نے فرمایا: یہ جنت کے باغات میں سے ایک

باغ ہے اور جنت کے بارے میں حضرت سہل بن ساعدی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَوضِعُ سَوْطٍ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِنَ الدُّنیا وَمَافِیْھَا۔ ''ایک چابک کے برابر بھی جنت کی جگہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے''۔اس سے واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جس جگہ آرام فرما ہیں، وہ جگہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے، پس کعبہ، بیت المقدس وغیرہ ہر جگہ سے افضل وہ جگہ ہے جہاں آپ آرام فرما ہیں''۔

(شرح صحیح مسلم، جلد3،ص:747,750-751)

مگر یہ تمام فضیلتیں قبرِانور کو حاصل ہیں، یعنی زمین کا وہ مبارک حصہ جسے آپ کے بدنِ اطہر سے مَس ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گنبدِ خضرا اگرچہ آپ ﷺ کی نسبت کی وجہ سے لاکھوں درجے قابلِ عزت وتکریم ہے، لیکن اسے قبرِ انور والی فضیلت کے مقام ومرتبے پر سمجھنا درست نہیں ہے اور اس پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے اور نہ ہی اکابر اُمت نے اس درجے میں اس کی فضیلت کو بیان کیا ہے اور گنبدِ خضریٰ تو عہدِ رسالت مآب ﷺ کے بہت بعد میں بنایا گیا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ پہلے گنبد کا رنگ سفید تھا، بعد میں اس پر ہرا رنگ کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے گنبد بنانے کا حکم ہی نہیں فرمایا، اس لیے گنبد کے رنگ کے انتخاب کو آپ کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔

اسلام میں جاندار چیزوں کی تصاویر بنانے کی ممانعت ہے اور بے جان چیزوں کی تصویر بنانے کی اجازت ہے۔ البتہ تمدّنی، عمرانی اور معاشی ضروریات، جن کے لیے تصویر ضروری ہے، مثلاً شناختی کارڈ، پاسپورٹ، ویزا، ڈومیسائل، ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ، ان ضروریات کے لیے تصویر بنوانا جائز ہے۔ تعظیم وتکریم کے لیے فوٹو کھینچنا ناجائز وحرام ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَلَّذِینَ یَصْنَعُوْنَ الصُّوَرَ یُعَذَّبُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ، یُقَالُ لَھُمْ: أَحْیُوا مَا خَلَقْتُمْ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو

لوگ ان (جانداروں کی) تصویروں کو بناتے ہیں، ان کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا، اُن سے کہا جائے گا کہ جن کو تم نے بنایا تھا، ان کو اب زندہ کرو"۔(صحیح مسلم:5501)

اگر چہ تصویر کا حکم اصل کا نہیں ہوتا، مگر جس طرح آج کل شِعار بن گیا ہے کہ جا بجا کعبۃ اللہ، گنبدِ خضرا اور مزارات اولیائے کرام کی شبیہیں بنائی جاتی ہیں اور اس میں کافی حد تک ابتذال ہوگیا ہے، یہ درست نہیں ہے، کیونکہ لوگ انہیں اُسی عقیدت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تاہم فقہی اعتبار سے شرعی حکم یہی ہے کہ گنبدِ خضرا کی شبیہہ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا خلافِ ادب نہیں ہے یا تصویر کا گنبد سے اوپر ہونے کا بھی یہی حکم ہے، نعت خوانوں، واعظین اور پیرانِ عظام کی تصاویر پر مشتمل لاکھوں روپے کے جو پینا فلیکس آویزاں کیے جاتے ہیں، تصاویر کے شرعی حکم سے قطع نظر، ہمارے نزدیک یہ اسراف ہے، کیونکہ عوام یہ رقم دین کے نام پر دیتے ہیں اور اسے دین کے ترجیحی مصارف پر صرف کرنا چاہیے۔ جلسے کے لیے تو اعلان اور اطلاعِ عام مقصود ہوتی ہے اور وہ کم سے کم مصارف پر ہونی چاہیے۔ لہٰذا جس انداز سے یہ اِسراف ہورہا ہے، یہ ناجائز وناپسندیدہ ہے۔ جہاں تک حقیقی گنبدِ خضراء کا تعلق ہے، وہ روضۂ رسول کے چھت کے حکم میں ہے اور جب آپ ﷺ کی تدفین حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں ہوئی، اُس وقت بھی اس کی چھت موجود تھی، پس حجرہ یا بیت کی جو حرمت ہے تو اس میں چھت بھی شامل ہے۔ لیکن شبیہہ گنبدِ خضراء کا وہ حکم نہیں ہے، کیونکہ حرمت وتقدیس اصل کے لیے ثابت ہے نہ کہ شبیہہ کے لیے۔

علامہ مفتی محمد وقار الدین سے سوال ہوا:

"جائے نماز یعنی مصلے پر جو خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی علی صاحبھا افضل الصلوات والتسلیمات کی تصویریں ہوتی ہیں، اُن پر نماز پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟ نیز ایسے مصلے پر بیٹھنا یا پاؤں رکھنا کیا حکم رکھتا ہے اور ان تصاویر کی تعظیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟"،

انہوں نے جواب میں لکھا: "تصاویر اصل شے کا حکم نہیں رکھتیں۔ لہٰذا ایسی جائے نمازوں پر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ دھیان بٹنے کا احتمال نہ ہو اور اگر ایسی

تصاویر پر پاؤں وغیرہ پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں اور تصاویر کی تعظیم بے سود ہے۔ (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص:514)''۔ ذرا سوچیے! اگر کسی کو بیت اللہ میں داخلے کی سعادت نصیب ہوجائے تو وہ اپنے قدموں کے ساتھ اندر جائے گا اور نماز پڑھے گا، البتہ بیت اللہ کی چھت پر نماز پڑھنے کے خلافِ ادب ہونے کی وجہ سے حدیث پاک میں منع فرمایا ہے''۔ (سنن ترمذی:346)

مُقدّس دینی علامات اور شعائر کو کاروبار کے لیے استعمال کرنا پسندیدہ بات نہیں ہے۔ بعض لوگ مقدس مقامات کی تصاویر یا شبیہ کو اشتہارات میں استعمال کرتے ہیں اور اگر اُن کا مقصد اس سے برکت حاصل کرنا ہے، تو پھر اُن کا احترام بھی کرنا چاہیے، ایسے بل بورڈ کے نیچے خلافِ شرع کوئی کام نہیں ہونا چاہیے اور دیانت وامانت سے کام لینا چاہیے، ورنہ ان شعائر کے ساتھ دل سے عقیدت کا رشتہ رکھنا ہی بہتر ہے۔ اسلامی اَحکام اصول تیسیر پر مبنی ہیں، چنانچہ ہمارے فقہائے کرام نے لکھا کہ اگر انسان کسی طرف پاؤں پھیلا کر لیٹا ہے اور اسی جانب قرآن مجید الماری کے اندر بند ہے یا بلند اوطاق پر رکھا ہوا ہے، تو یہ بے ادبی نہیں ہے۔

طہارت کے مسائل

واشنگ مشین میں کپڑوں کی دھلائی

چند اہم اور ضروری سوالات کے جوابات مطلوب ہیں، (محمد معروف، وارنگٹن۔ یو کے)

سوال: پاک اور ناپاک کپڑے ایک ساتھ کسی برتن میں بھگو دینا یا مشین میں ڈال دینا کیسا ہے؟۔ واشنگ مشین کے دھلے ہوئے کپڑوں کا شرعاً کیا حکم ہے، نیز بعض مشینوں کا سسٹم سارے پانی کو خارج نہیں کرتا، خود نکالنا بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اکثر مشینوں میں آج کل ایسا سیفٹی لاک سسٹم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے درمیان میں مشین کو کھولنا ممکن نہیں ہوتا اور اگر کسی وجہ سے کھولنا بھی پڑے تو مشین کو مکمل بند کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے کچھ مشینیں نئے سرے سے کپڑے دھونا شروع کر دیتی ہیں، اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟۔

جواب: پاک و ناپاک کپڑوں کو ایک ساتھ کسی برتن یا مشین میں دھونے سے تمام کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں، اُنہیں پاک کرنے کے لیے پہلے سے استعمال شدہ ناپاک پانی نکال کر دوبارہ سہ بارہ تازہ پانی میں دھو کر نچوڑا جائے۔ اگر مشین میں یہ سہولت ہو کہ استعمال شدہ پانی خارج کر کے تازہ پانی ڈال لیا جائے، تو کپڑے پاک ہو جائیں گے۔ عام طور پر گھروں میں استعمال ہونے والی واشنگ مشینیں آٹو میٹک ہوتی ہیں اور اُن میں یہ سہولت موجود ہوتی ہے۔ لیکن اگر واشنگ مشین میں ایسی سہولت موجود نہ ہو تو ایسے کپڑوں کو پاک کرنے کے لیے مشین سے نکال کر پاک صاف پانی میں ایک دو بار بھگو کر نچوڑا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جن مشینوں میں استعمال شدہ پانی خارج ہونے کا سسٹم نہ ہو اور اُسی ناپاک پانی میں کپڑے دھلتے رہتے ہوں، اُن تمام کپڑوں کو بھی پاک کرنے کے لیے مشین سے باہر نکال کر صاف پانی ڈال کر نچوڑنا ہوگا۔

سوال: مشین میں مقررہ وزن سے زیادہ کپڑوں کی طہارت کا کیا حکم ہوگا، نیز اگر کسی مشین میں پانی دو یا تین دفعہ خارج نہیں ہوتا، تو اس صورت میں شرعاً کپڑے پاک ہوں گے یا نہیں؟۔

جواب: یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جن مشینوں میں استعمال شدہ پانی خارج ہونے کا سسٹم نہ ہو اور اُسی ناپاک پانی میں کپڑے دھلتے رہتے ہوں، اُن تمام کپڑوں کو پاک کرنے کے لیے باہر نکال کر صاف پانی میں ایک دو مرتبہ بھگو کر نچوڑنا ہوگا۔

سوال: غیر مسلم دھوبی سے کپڑے دھلوانا یا استری کروانا کیسا ہے؟۔

جواب: اگر اُس کے ہاتھ پاک وصاف ہوں تو غیر مسلم ملازم سے تمام جائز کام لیے جا سکتے ہیں، کپڑے دھلوانے اور استری کروانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال: ناپاک کپڑے پاک کیے بغیر پھینک دینا یا کسی خیراتی ادارے میں دینا کیسا ہے؟۔

جواب: اگر کسی ضرورت مند شخص یا کسی ادارے کو استعمال شدہ کپڑے دینا ہوں تو بہتر صورت یہ ہے کہ کپڑے پاک کرنے کے بعد دیے جائیں۔ لیکن اگر ضائع کرنا یا پھینکنا ہی مقصود ہے تو دھونے کی ضرورت نہیں۔ کسی ضرورت مند کو دینے ہوں تو احتیاطاً یہ کہہ دیں کہ یہ ناپاک کپڑے ہیں، انہیں استعمال کرنے سے پہلے پاک کر لیا جائے۔

قالین کی طہارت

سوال: قالین کے پاک کرنے کا شرعی طریقہ بیان فرما دیں کہ اکثر اس حوالے سے خلش رہتی ہے کہ آیا قالین پاک ہو گیا یا نہیں؟، (محمد ابدال، سرجانی)

جواب: قالین (Carpet) پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کا ناپاک حصہ ایک بار دھو کر لٹکا دیں، یہاں تک کہ پانی ٹپکنا بند ہو جائے، پھر دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اسی طرح کریں، قالین پاک ہو جائے گا۔ اس طریقے پر پاک کرنے کے بعد مطمئن رہیں کہ قالین پاک ہو گیا، اُس مقام پر کسی خلش کے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: "وَالنَّجَاسَةُ ضَرْبَانِ: مَرْئِيَّةٌ. وَغَيْرُ مَرْئِيَّةٍ فَمَا كَانَ مِنْهَا مَرْئِيًّا فَطَهَارَتُهُ زَوَالُ عَيْنِهَا"۔

ترجمہ: اور نجاست کی دو قسمیں ہیں: (۱) جو نظر آئے (۲) جو نظر نہ آئے، پس جو نجاست نظر آئے تو اس کو زائل کرنا ہی اس کا پاک ہونا ہے۔

اور مزید لکھتے ہیں: ''وَمَا لَيْسَ بِمَرْئِيٍّ فَطَهَارَتُهُ أَنْ يُغْسَلَ حَتّٰى يَغْلِبَ عَلٰى ظَنِّ الْغَاسِلِ أَنَّهُ قَدْ طَهُرَ''۔

ترجمہ: ''اور جو نجاست نظر نہ آئے (یعنی جذب ہوگئی ہو یا خشک ہوگئی ہو) تو اس کو دھویا جائے یہاں تک کہ دھونے والے کا گمانِ غالب یہ ہو کہ وہ چیز پاک ہوگئی، تو یہ اس کی طہارت ہے''۔ (فتح القدیر، ج:1، ص:210)

فتح القدیر میں ہے:

''كَالْحَصِيْرِ مَثَلًا فَإِنَّ اَبَايُوْسُفَ يَقُوْلُ: يُغْسَلُ ثَلَاثًا وَيُجَفَّفُ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ فَيَطْهُرُ لِاَنَّ لِلتَّجْفِيْفِ اَثَرًا فِي اِسْتِخْرَاجِ فَيَقُوْمُ مقامَ الْعَصْرِ اِذْ لَا طَرِيْقَ سِوَاهُ وَالْحَرَجُ مَوْضُوْعٌ. وَمُحَمَّدٌ يَقُوْلُ: لَا يَطْهُرُ اَبَدًا لِاَنَّ الطَّهَارَةَ بِالْعَصْرِ وَهُوَ مِمَّا لَا يُنْعَصَرُ''

ترجمہ: ''دری یا چٹائی کے متعلق امام ابو یوسف فرماتے ہیں: اس کو تین مرتبہ دھویا جائے گا اور ہر بار سکھایا جائے گا تو یہ پاک ہوجائے گی، کیونکہ خشک کرنے کا اثر نجاست باہر نکالنے میں ظاہر ہے تو یہ نچوڑنے کے قائم مقام ہوگیا، جب کہ اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہ ہو اور حرج درپیش ہو۔ امام محمد فرماتے ہیں کہ کبھی بھی پاک نہیں ہوگی، کیونکہ طہارت نچوڑنے سے حاصل ہوگی اور (دری یا چٹائی) ان چیزوں میں سے ہے جس کو نچوڑا نہیں جاسکتا''۔

(فتح القدیر، ج:1، ص:213)

بدائع الصنائع میں ہے:

''وَإِنْ كَانَ مِمَّا لَا يُمْكِنُ عَصْرُهُ، كَالْحَصِيرِ الْمُتَّخَذِ مِنَ الْبُورِيِّ وَنَحْوِهِ، أَيْ مَا لَا يَنْعَصِرُ بِالْعَصْرِ إِنْ عُلِمَ أَنَّهُ لَمْ يَتَشَرَّبْ فِيهِ، بَلْ أَصَابَ ظَاهِرَهُ يَطْهُرُ بِإِزَالَةِ الْعَيْنِ، أَوْ بِالْغَسْلِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ غَيْرِ عَصْرٍ، فَأَمَّا إِذَا عُلِمَ أَنَّهُ تَشَرَّبَ فِيهِ فَقَدْ قَالَ أَبُو يُوسُفَ: يُنْقَعُ فِي الْمَاءِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، وَيُجَفَّفُ فِي كُلِّ مَرَّةٍ فَيُحْكَمُ بِطَهَارَتِهِ''۔

ترجمہ: ''اور اگر کسی چیز کا نچوڑ نا ممکن نہ ہو جیسے دری یا چٹائی (یا صورتِ مسئولہ میں قالین) جو بوری سے بنی ہو یا اس جیسی اور چیزیں جن کو نچوڑا نہ جاسکتا ہو، اگر دھونے والا جانتا ہے کہ

نجاست اس میں جذب نہیں ہوئی بلکہ ظاہر کو لگی ہے تو نجاست کو کھرچ کر دور کرنے سے یا نچوڑے بغیر تین مرتبہ دھونے سے وہ چیز پاک ہو جائے گی۔ پس اگر وہ جانتا ہے کہ نجاست اس چیز میں جذب ہو چکی ہے تو امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ پانی میں تین مرتبہ بھگو لیا جائے اور ہر بار خشک کیا جائے تو اس کی طہارت کا حکم دیا جائے گا، (بدائع الصنائع، ج:1،ص:132) آج کل اگر نچوڑے کے لیے مشین دستیاب ہو جس کے ذریعے دبا کر نچوڑا جا سکتا ہو، تو اس کا استعمال مستحسن ہے۔ یعنی ایک مرتبہ پانی ڈالا، دھویا اور نچوڑا اور گندا پانی نکالا، پھر صاف پانی ڈالا، دھویا اور نچوڑا اور گندا پانی نکالا، پھر تیسری مرتبہ اس کا اعادہ کیا، تو اس سے ہر شبہے کا ازالہ ہو جائے گا۔

دائمی معذور کی نماز اور مسجد میں جانے کا حکم

سوال: ڈاکٹرز نے میرے مثانے میں ٹیومر، جو کینسر کا سبب ہوتا ہے، تشخیص کیا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ آپریشن کے ذریعے مثانے کو نکال دیا جائے، ورنہ زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ آپریشن کی صورت میں معدے سے ایک نالی کے ذریعے پلاسٹک بیگ جسم کے باہر جوڑ دیا جائے گا اور معدے سے غیر محسوس طور پر پیشاب رِس رِس کر اُس پلاسٹک بیگ میں آئے گا۔ اُس پلاسٹک بیگ کو دو تین گھنٹے کے بعد خالی کرنا ہوگا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرے وضو اور طہارت کی صورت کیا ہوگی اور اس بیگ کے ساتھ، جس میں پیشاب جمع ہوگا، میرا مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھنا خلافِ ادب تو نہیں ہوگا۔ ازراہِ کرم شرعی حکم بیان کریں۔

جواب: جو صورت آپ نے بیان کی ہے، اس میں آپ پر شرعی معذور کی تعریف صادق آتی ہے اور وضو و نماز کے لیے رخصت شرعی پر عمل کریں گے۔ ایسا شخص جس کو کوئی ایسی بیماری ہے جس سے وضو زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے، مثلاً پیشاب کے قطرے مسلسل آنے کا مرض یا ریح (ہوا) خارج ہونے یا دکھتی آنکھ سے پانی بہنے یا پھوڑے یا ناسور سے رطوبت یا پیپ بہنے یا کان، ناف اور پستان سے بیماری کی وجہ سے مواد رسنے کا مرض لاحق ہو، ایسا شخص فقہی

اصطلاح میں ''شرعی معذور'' ہے، بشرطیکہ اس کے یہ اَعذار ایک نماز کے پورے وقت کو اس طرح گھیر لیتے ہوں کہ اس عذر کے بغیر وہ ایک وقت کی فرض نماز بھی ادا نہ کرسکتا ہو اور اتنی دیر تک اپنا وضو قائم رکھنے پر قادر نہ ہو کہ ایک وقت کی پوری نماز پڑھ لے۔ لہٰذا بار بار عذر لاحق ہونے کی وجہ سے اُسے شرعاً یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ ہر وقت کی نماز کے لیے تازہ وضو کرے اور اس دوران اس عذر کی وجہ سے پیشاب نکلنے کے باوجود اُس وقت کے فرض، واجب، سنّت کے علاوہ قضا نماز، نوافل اور تلاوت، الغرض جو عبادات ادا کرنا چاہے، کرسکتا ہے۔ لیکن جب دوسری نماز کا وقت آئے تو پھر تازہ وضو کرکے اسی طرح پڑھے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْمُسْتَحَاضَةُ ومَن بِهٖ سَلَسُ البَول أَواِستِطلَاقُ البَطن أَو انفلَاتُ الرِّیحِ أَو رُعَافٌ دَائِمٌ أَو جُرحٌ لَایَرقأ، یَتوضَّؤن لِوقتِ کُلِّ صلاۃٍ وَیُصَلُّونَ بِذٰلِك الوضوءِ فِی الوَقتِ مَاشَاءُوْا مِنَ الفَرَائِضِ وَالنَّوافلِ ھٰکَذَافِی ''البَحرُالرَّائِق''۔

ترجمہ: ''مستحاضہ (یعنی وہ خاتون جسے حیض ونفاس کے علاوہ رحم سے خون جاری ہونے کی بیماری لاحق ہے) اور جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا مسلسل دست کی بیماری (Diarrhoea) ہو یا مسلسل ریح (یعنی ہوا) خارج ہوتی ہو یا دائمی نکسیر جاری ہو یا زخم مسلسل رِستا رہتا ہو، تو ایسے معذور لوگ ہر نماز کے وقت کے لیے تازہ وضو کریں اور اُس وقت کے اندر فرائض ونوافل جس قدر چاہیں اُسی وضو سے ادا کرلیا کریں، جیسا کہ ''البحرالرائق'' میں ہے۔۔ مزید لکھتے ہیں: وَیَبْطُلُ الوُضوءُ عِندَ خُروجِ وقتِ المفروضةِ بِالحدَثِ السَّابِقِ ھٰکذا فی ''الھدایۃ''۔ ترجمہ: ''دائمی معذور کا وضو سابقہ حدث (ناپاکی) کی وجہ سے فرض نماز کا وقت نکل جانے سے ٹوٹ جاتا ہے، جیسا کہ 'ہدایہ' میں ہے''، یعنی ہر وقت کی نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ہوگا''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص: 41)

شرعی معذور پر جماعت کا التزام نہیں ہے، لیکن اگر مذکورہ Urine Bag کپڑوں میں چھپا ہوا ہے اور نظر نہیں آتا کہ لوگوں کو اس سے کراہت محسوس ہو، اسی طرح اس بیگ

سے بدبو بھی نہیں نکلتی اور نماز کے ارکان کی ادائیگی کے وقت مسجد کی تلویث کا احتمال بھی نہیں ہوتا، تو وہ مسجد میں جاکر باجماعت نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اگر معذوری ایسی ہے کہ مسجد کے نجاست سے آلودہ ہونے کا اندیشہ ہو یا اس کی حالت دوسرے نمازیوں کے لیے کراہت اور نفرت کا سبب بنے تو پھر اسے مسجد میں نہیں آنا چاہیے اور اس کے لیے ہم اس حدیثِ مبارک سے استدلال کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے کچی پیاز، لہسن یا کوئی بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا، حَتّٰى يَذْهَبَ رِيْحُهَا يَعْنِي الثُّوْمَ

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس ترکاری یعنی لہسن کو کھائے، وہ اس وقت تک ہماری مساجد کے قریب نہ آئے، جب تک اُس کے منہ سے بدبو نہ چلی جائے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1136)

ایسے شخص کو مسجد میں آنے سے روکنے کی حکمت لوگوں کو اس کے منہ سے نکلنے والی بدبو کی اذیت سے بچانا ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ، الثُّوْمِ وَقَالَ مَرَّةً: مَنْ أَكَلَ الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَالْكُرَّاثَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَأَذّٰى مِمَّا يَتَأَذّٰى مِنْهُ بَنُوْ آدَمَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس ترکاری یعنی لہسن کو کھائے اور ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے لہسن، پیاز اور گندنا کھایا ہو، وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو بھی اُن چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے، جن سے انسانوں کو ایذا پہنچتی ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1141)

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو اذیت سے بچانا ضروری ہے، خواہ اس کا سبب کوئی بھی ہو اور یہ اصول زیرِ بحث صورتِ حال پر بھی صادق آتا ہے۔

نماز کے مسائل

عورتوں کی نماز کی ہیئت

سوال:

الحمدللہ کل عمرے سے وطن واپسی ہوئی، ایک سوال دریافت کرنا ہے، کہ پاکستان میں بچپن سے لڑکیوں کو سمٹ کر اور مردوں کو مختلف انداز سے نماز کی تعلیم دی جاتی ہے، مگر جب میں یہاں آئی تو عرب عورتیں مردوں کی طرح نماز ادا کرتی دکھائی دیں۔ مستند احادیث کے حوالے سے وضاحت فرمادیں کہ کون سا طریقہ درست اور احادیث سے ثابت ہے؟،

(رمشا عمر، کراچی)

جواب:

اس موضوع پر ہم تفصیلی فتویٰ جاری کر چکے ہیں، تفہیم المسائل جلد پنجم، جلد ہشتم میں اضافاتِ جدیدہ کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں مختصراً احادیث درج کی جارہی ہیں۔

نماز میں عورتوں کے سجدہ کرنے اور بیٹھنے کا طریقہ اور ہیئت مردوں سے جدا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی نماز کی ادائیگی کا جو طریقہ ارشاد فرمایا، اُس میں عورت کے سجدہ کرنے کا طریقہ اور صورت مرد کے سجدہ کرنے کی ہیئت سے جدا ہے، ضروری نہیں کہ ہر حدیث صحیح بخاری یا صحاح ستہ کی کُتب میں موجود ہو۔ اور بھی احادیث کی بہت سی کُتب ہیں، جو اُمت میں متداول اور مقبول ہیں، پھر یہ اعتقادی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق عبادت کے طریق ادا سے ہے۔ جس کے لیے ضعیف حدیث بھی کافی ہے، مگر یہاں تو متعدد احادیث ہیں، جو ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث ہیں۔ جیسا کہ درجِ ذیل احادیثِ مبارکہ میں ارشاد فرمایا:

(۱) عَنْ یَزِیْدَ بْنِ اَبِیْ حَبِیْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ مَرَّ عَلٰی اِمْرَأَتَیْنِ تُصَلِّیَانِ فَقَالَ اِذَا سَجَدْتُمَا فَضُمَّا بَعْضَ اللَّحْمِ اِلَی الْاَرْضِ فَاِنَّ الْمَرْأَۃَ لَیْسَ فِیْ ذٰلِکَ کَالرَّجُلِ۔

ترجمہ: ''یزید بن ابی حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے

گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کے بعض حصے کو زمین سے لگایا کرو کیونکہ اس میں عورت مرد کی طرح نہیں ہے''۔

(مراسیل ابوداؤد، ص:8)

(۲) علامہ علی متقی بن حسام الدین برہان پوری متوفی 975ھ روایت فرماتے ہیں:

عَنْ ابْنِ عُمَرَ اِذَا جَلَسَتِ الْمَرْأَةُ فِی الصَّلٰوۃِ وَضَعَتْ فَخِذَ ھَا عَلٰی فَخِذَھَا الْاُخْرٰی فَاِذَا سَجَدَتْ اَلْصَقَتْ بَطْنَھَا فِی فَخِذَیْھَا کَاَسْتَرَمَا یَکُوْنُ لَھَا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران دوسری ران پر رکھ لے اور جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں کے ساتھ چمٹائے، اس میں اُس کے ستر کی زیادہ رعایت ہے۔

(کنز العمال، جلد 7، ص:549، رقم الحدیث:20203، موسسۃ الرسالہ بیروت)

علامہ غلام رسول سعیدی عورتوں کی نماز میں سجدہ کی بابت لکھتے ہیں: عورتوں کی نماز کے طریقہ کے متعلق احادیث اور آثار:

محدث امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ نے عورت کی رکوع اور سجدے کی کیفیت اور ہیئت کے بارے میں باقاعدہ باب باندھے ہیں اور عنوان قائم کیے ہیں:

(۱) امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی حضرت وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں:

قَالَ لِی رَسُوْلُ اللہ ﷺ: یَاوَائِلَ بنَ حجرٍ اِذَاصَلَّیْتَ فَاجْعَل یَدَیْکَ حِذَاءَ اُذُنَیْکَ، وَالْمَرْأَۃُ تَجْعَلُ یَدَیْھَا حِذَاءَ ثَدْیَیْھَا۔

ترجمہ: ''انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے وائل بن حجر! جب تم نماز پڑھو تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں کے مقابل اٹھاؤ اور عورت اپنے ہاتھ اپنے سینہ کے مقابل اٹھائے''۔

(معجم کبیر، جلد 22، ص:19، رقم الحدیث:28، مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، مجمع الزوائد، جلد 1، ص:103)

(۲) ''عَنْ خَالِدِ بْنِ اللَّجْلَاجِ قَالَ: کُنَّ النِّسَاءُ یُؤْمَرْنَ اَنْ یَتَرَبَّعْنَ اِذَا جَلَسْنَ فِی

الصَّلَاۃِ، وَلَا یَجْلِسْنَ جُلُوسَ الرِّجَالِ عَلٰی أَوْرَاکِهِنَّ،

ترجمہ:''خالد بن لجلاج بیان کرتے ہیں کہ عورتوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ نماز میں چارزانو (آلتی پالتی مارکر) بیٹھیں اور مردوں کی طرح سرین پر نہ بیٹھیں''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:2783،مکتبۃ الرشد،ریاض)

(۳)عَنْ نَافِعٍ :أَنَّ صَفِیَّةَ کَانَتْ تُصَلِّیْ وَهِیَ مُتَرَبِّعَةٌ۔

ترجمہ:''نافع بیان کرتے ہیں کہ صفیہ رضی اللہ عنہا نماز میں چارزانو بیٹھتی تھیں''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:2784،مکتبۃ الرشد،ریاض)

اس حدیث میں جس صفیہ کا ذکر ہے، یہ ابوعبید کی بیٹی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی زوجہ ہیں۔

(۴)عَنْ قَتَادَةَ قَالَ:تَجْلِسُ کَمَا تَرٰی أَنَّهُ أَیْسَرُ۔

ترجمہ:''قتادہ نے کہا:عورت کو جس طرح آسانی ہو،اس طرح بیٹھے''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:2803)

(۵)عَنْ نَافِعٍ قَالَ:کُنَّ نِسَاءُ ابْنِ عُمَرَ یَتَرَبَّعْنَ فِی الصَّلَاۃِ۔

ترجمہ:''نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ازواج نماز میں چار زانو بیٹھتی تھیں''۔(مصنف ابن ابی شیبہ:2805)

(۶)عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ قَالَ:قُلْتُ لِعَطَاءٍ:أَتَجْلِسُ الْمَرْأَةُ فِی مَثْنٰی عَلٰی شِقِّهَا الْأَیْسَرِ؟، قَالَ: نَعَمْ،قُلْتُ: هُوَأَحَبُّ اِلَیْكَ مِنَ الْاَیْمَنِ؟، قَالَ: نَعَمْ، تَجْتَمِعُ جَالِسَةً مَا اسْتَطَاعَتْ۔

ترجمہ:''ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطا سے پوچھا:کیا عورت دورکعت کے بعد اپنے بائیں کولہے پر بیٹھے؟،انہوں نے کہا:ہاں!میں نے کہا:کیا یہ ہیئت آپ کے نزدیک دائیں کولہے پر بیٹھنے کی بہ نسبت احسن ہے؟،انہوں نے کہا:ہاں،جس قدر ہوسکے سمٹ کر بیٹھے''۔(مصنف ابن ابی شیبہ:2807،2791،دارالکتب علمیہ،بیروت)

نماز میں عورت کے سجدہ کرنے کا طریقہ

(۱) عَنِ الْحَارِثِ، عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: اِذَا سَجَدَتِ الْمَرْأَةُ فَلْتَحْتَفِزْ، وَلِتَضُمَّ فَخِذَيْهَا۔

ترجمہ: ''حارث بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنے جسم کو سمیٹے اور اپنی رانوں کو (اپنے پیٹ کے ساتھ) ملائے''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:2793، مجلس علمی، بیروت)

(۲) عَن ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ صَلَاةِ الْمَرْأَةِ؟، فَقَالَ: تَجْتَمِعُ وَتَحْتَفِزُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عورت کی نماز کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ اپنے اعضاء کو جمع کرے اور سمیٹے''۔ (مصنف ابن ابی شیبہ:2794، مجلس علمی، بیروت)

(۳) عَنْ اِبْرَاهِيمَ قَالَ: اِذَا سَجَدتِ الْمَرْأَةُ فَلْتَضُمَّ فَخِذَيْهَا، وَلِتَضَعَ بَطْنَهَا عَلَيْهِمَا۔

ترجمہ: ''ابراہیم نخعی نے کہا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنی رانوں کو ملائے اور اپنا پیٹ ان پر رکھے''۔ (مصنف ابن ابی شیبہ:2795، مجلس علمی، بیروت)

(۴) عَنْ اِبْرَاهِيمَ قَالَ: اِذَا سَجَدتِ الْمَرْأَةُ فَلْتَلْزَقْ بَطْنَهَا بِفَخِذَيْهَا، وَلَا تَرْفَعْ عَجِيزَتَهَا، وَلَا تَجَافَى كَمَا يُجَافِي الرَّجُلُ۔

ترجمہ: ''ابراہیم نے کہا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو اپنی رانوں کے ساتھ ملائے اور اپنے کولہوں کو اوپر نہ اٹھائے اور اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے دور نہ رکھے، جس طرح مرد دور رکھتا ہے''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:2798، مجلس علمی، بیروت)، (نعمۃ الباری شرح صحیح البخاری، جلد2، ص:754)

فقہی عبارات:

(۱) مُصنف ہدایہ، علامہ ابوالحسن بن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی، (۲) مُصنف بنایہ، علامہ بدرالدین عینی حنفی، (۳) مُصنف مبسوط، علامہ ابو بکر محمد بن احمد السرخسی، (۴) مُصنف المحیط البرہانی، علامہ محمود بن صدرالشریعہ (۵) مُصنف تلخیص الحبیر، علامہ عثمان بن علی زیلعی حنفی (۶) مُصنف تبیین الحقائق، علامہ عثمان بن علی زیلعی حنفی (۷) مُصنف ردالمحتار، علامہ

سید ابن عابدین شامی (۸) مُصنف فتاویٰ عالمگیری، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۹) مُصنف الفقہ الاسلامی، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے اس مسئلے پر فقہی دلائل پیش کیے ہیں۔

اذان کا جواب دینے کا طریقہ

سوال:

اذان کے جواب دینے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟، (رفعت محمود، راولپنڈی)

جواب:

حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ فَقُولُوا مِثْلَ قَوْلِهِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مؤذن کو اذان کہتے ہوئے سنو تو جو وہ کہتا ہے، (اس کی مثل) تم بھی کہو''۔

(سنن ابن ماجہ: 718)

(۲) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ اَللهُ أَكْبَرُ اَللهُ أَكْبَرُ، فَقَالَ أَحَدُكُمْ: اَللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ قَالَ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، قَالَ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، ثُمَّ قَالَ: أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، قَالَ: أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، ثُمَّ قَالَ: حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، قَالَ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ، ثُمَّ قَالَ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، قَالَ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ، ثُمَّ قَالَ: اَللهُ أَكْبَرُ اَللهُ أَكْبَرُ، قَالَ: اَللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، مِنْ قَلْبِهِ۔ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مؤذن ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' کہے تو تم میں سے کوئی بھی شخص دل سے اس کے جواب میں ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' کہے، پھر مؤذن ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ'' کہے تو وہ بھی ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ'' کہے، پھر مؤذن ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ'' کہے تو وہ بھی ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ'' کہے، پھر مؤذن ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' کہے تو وہ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ'' کہے،

پھر مؤذن کہے: ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' تو وہ کہے: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' پھر مؤذن کہے: اللہ اکبر اللہ اکبر، تو وہ بھی کہے اللہ اکبر اللہ اکبر، پھر مؤذن کہے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، تو وہ بھی کہے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، (صحیح مسلم: 385)''۔

(۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ، ثُمَّ صَلُّوا عَلَيَّ، فَإِنَّهُ مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا، ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيلَةَ، فَإِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِي إِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ، وَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ، فَمَنْ سَأَلَ لِيَ الْوَسِيلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم مؤذن سے اذان سنو تو اس کی مثل کلمات کہو، پھر مجھ پر درود پڑھو، کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ پھر میرے لیے جنت میں ''مقامِ وسیلہ'' کی دعا مانگو، کیونکہ وہ جنت کا ایک ایسا مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ شخص میں ہوں گا اور جو شخص میرے لیے اس مقام کی دعا مانگے گا، اس کے حق میں میری شفاعت واجب ہو جائے گی''۔ (صحیح مسلم: 384)

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَيَجِبُ عَلَى السَّامِعِيْنَ عِنْدَ الْأَذَانِ الْإِجَابَةُ، وَهِيَ أَنْ يَقُوْلَ مِثْلَ مَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ، إِلَّا فِي قَوْلِهِ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، فَإِنَّهُ يَقُوْلُ مَكَانَ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَمَكَانَ قَوْلِهِ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ، كَذَا فِي ''مُحِيطِ السَّرَخْسِي''، وَهُوَ الصَّحِيْحُ كَذَا فِي ''فَتَاوَى الْغَرَائِبِ'' وَكَذَا فِي قَوْلِ الْمُؤَذِّنِ اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، لَا يَقُوْلُ السَّامِعُ مِثْلَهُ وَلٰكِنْ يَقُوْلُ: صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ كَذَا فِي ''مُحِيطِ السَّرَخْسِي''۔

ترجمہ: ''سننے والوں پر اذان کا جواب دینا واجب ہے، جو کلمات مؤذن کہتا ہے، جواب

میں وہی کلمات کہے، مگر جب مؤذن "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ" اور "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" کہے تو سننے والا "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ" کے جواب میں "لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ" کہے اور حی علی الفلاح کے جواب میں کہے: مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ، محیط سرخسی میں اسی طرح ہے اور یہی صحیح ہے، جیسا کہ فتاویٰ غرائب میں ہے، اسی طرح جب مؤذن "اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ (نماز نیند سے بہتر ہے)" کہے، تو سننے والا اُس کی مثل نہ کہے، بلکہ "صَدَقْتَ وَبَرِرْتَ (آپ نے سچ کہا اور اپنی ذمے داری سے بری ہوئے)" کہے، محیط سرخسی میں اسی طرح ہے"۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:57)

ایک سے زائد اذان کا جواب دینا

سوال:

کیا صرف قریبی مسجد سے آنے والی اذان کا جواب دینا کافی ہے؟۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے قریب ودور کی کئی مساجد کی آواز دیر تک آتی رہتی ہے، کیا اُن سب کا جواب دینا ہوگا، (رفعت محمود، راولپنڈی)

جواب:

اگر چند اذانیں سنے، تو اس پر پہلی ہی اذان کا جواب لازم ہے اور بہتر یہ ہے کہ سب کا جواب دے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(أَجَابَ الْأَوَّلَ) سَوَاءٌ کَانَ مُؤَذِّنَ مَسْجِدِہٖ أَوغَیْرَہٗ، "بحر" عَنِ "الْفَتْحِ" بَحثًا، وَیُفِیْدُہٗ مَافِي "الْبَحْرِ" أَیْضًا عَنِ "التَّفَارِیْقِ": (إِذَا کَانَ فِی الْمَسْجِدِ أَکْثَرُ مِنْ مُؤَذِّنٍ أَذَّنُوْا وَاحِدًا بَعْدَ وَاحِدٍ فَالْحُرْمَۃُ لِلْأَوَّلِ)

ترجمہ: "(پہلی اذان کا جواب دے) خواہ وہ اس کی مسجد کے مؤذن نے اذان دی ہو یا کسی دوسرے نے۔ "البحر الرائق" میں مزید بحث کرتے ہوئے لکھا: جب کسی مسجد میں ایک سے زیادہ مؤذن ہوں، جو یکے بعد دیگرے اذان دیتے ہوں (جیسے مسجد نبوی میں پہلے ہوتا تھا)، تو پہلے مؤذن کی اذان کا احترام کیا جائے"۔ (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 2، ص:622، دمشق)

صلوٰۃ کی اہانت

سوال:

نومبر 2015ء کو میری شادی سید اسعد نقوی کے ہمراہ ہوئی، شادی کے تیسرے دن میں شوہر کے ساتھ ترکی چلی گئی، جو کہ معاش کے سلسلے میں وہاں مقیم ہیں۔ میں صوم وصلوٰۃ کی پابند ہوں، اپنے شوہر کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا، میں نے انہیں نماز پڑھنے کو کہا تو جواب دیا: ''ہمیں کیا ضرورت ہے نماز پڑھنے کی؟، ہم نے تو خود لوگوں کو نماز سکھائی ہے۔ ہم سید ذات ہیں ہمیں جنت میں جانے سے کون روک سکتا ہے، نماز تو منافق پڑھتے ہیں''، کیا ایسے عقائد کے حامل شخص کے ساتھ میرا رہنا جائز ہے؟۔

(اریبہ حسن، ناظم آباد 1، کراچی)

والد کا بیان: میں جاوید حسن اریبہ کا والد ہوں۔ میری بیٹی کے سسر نے ایک دن فون پر مجھ سے کہا: ''تم لوگ نماز پڑھتے ہو، مجھے دیکھو میں نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا لیکن میں کہاں ہوں اور تم لوگ کہاں ہو، جو نماز پڑھتے ہیں وہ منافق ہوتے ہیں۔ ہم لوگ نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی روزہ رکھتے ہیں۔ جناب سے گزارش ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

(جاوید حسن، ناظم آباد 1، کراچی)

جواب:

نماز اسلام کا اہم بنیادی رکن ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(1) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ۔

ترجمہ: ''بندے اور کفر کے درمیان فرق نماز کا ترک ہے''۔ (صحیح مسلم: 82)

(2) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ،

وَالحَجّ، وَصَومِ رَمضَانَ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، (۱) یہ شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) حج کرنا (۵) اور رمضان کے روزے رکھنا''۔ (صحیح بخاری:8)

(3) عَنْ عَبدِ اللّٰہِ بنِ شَقِیقٍ قَالَ: کَانَ أَصحَابُ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ لَا یَرَوْنَ شَیْئًا مِنَ الاَعْمَالِ تَرکُہٗ کُفرٌ غَیرَ الصَّلٰوۃِ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نماز (کی فرضیت کے انکار) کے علاوہ کسی بھی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے''۔ (سنن ترمذی:2622)

اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے، وہ کافر ومرتد ہے۔ کیونکہ نماز کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماع کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

(ھِیَ فَرضُ عَینٍ عَلٰی مُکَلَّفٍ۔۔۔وَیُکَفَّرُ جَاحِدُھَا) لِثُبُوتِھَا بِدَلِیلٍ قَطعِیٍّ (وَتَارِکُھَا عَمَدًا مَجَانَۃً) أَیْ تَکَاسُلًا فَاسِقٌ (یُحْبَسُ حَتّٰی یُصَلِّیَ) لِاَنَّہٗ یُحْبَسُ لِحَقِّ الْعَبْدِ فَحَقُّ الْحَقِّ أَحَقُّ۔الخ

ترجمہ:''ہر مکلف یعنی عاقل وبالغ مسلمان پر نماز فرض عین ہے، اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے، کیونکہ نماز کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے اور جو سستی کی بنا پر نماز کو قصداً چھوڑے، وہ فاسق ہے، (جو نماز نہ پڑھتا ہو) اسے قید کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ نماز پڑھنے لگے، کیونکہ جب بندے کے حق کی وجہ سے قید کیا جاتا ہے تو اللہ کا حق سب سے بڑھ کر ہے، (کہ اس کی نافرمانی پر) اسے قید کیا جائے''۔ (جلد2ص:6,7)

جنت میں داخل ہونے کا مدار نسب پر نہیں ہے، بلکہ ایمان واعمالِ صالحہ پر ہے۔ وہ احادیث جن میں ترکِ نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے، انہیں نماز کی فرضیت کے انکار پر محمول کیا

جائے گا، یعنی جو نماز کی فرضیت کا منکر ہو اس کے کفر پر اجماع ہے، ایسا شخص ملتِ اسلام سے خارج ہے، البتہ جو شخص نماز کی فرضیت کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن کوتاہی کی بنا پر نماز کا تارک ہے تو وہ ائمۂ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک فاسق ہے۔ حدیث میں جو ترکِ نماز کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں اس سے مراد اعتقاداً ترک کرنا ہوگا، یعنی فرضیت کے انکار یا تارکِ صلوٰۃ کے ظاہر حال کو بیان کیا گیا ہے کہ عملاً اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

سوال میں درج دونوں بیان اگر درست ہیں تو آپ کے شوہر اور سسر کا یہ قول کہ ''نماز تو منافق پڑھتے ہیں، ہمیں کیا ضرورت ہے نماز پڑھنے کی ہم تو سید ذات ہیں، ہمیں جنت میں جانے سے کون روک سکتا ہے، نماز تو ہم نے لوگوں کو سکھائی ہے، وغیرہ''، اس میں اگرچہ نماز کی فرضیت کا صراحتہً انکار نہیں ہے، لیکن نماز کی فرضیت کا انکار اس سے یقیناً لازم آتا ہے نیز ان کے ان کلمات میں نماز کا واضح استخفاف ہے، اہانت ہے، اسے شعارِ منافقین قرار دیا گیا ہے، لہٰذا فقہی اعتبار سے یہ کفر ہے۔ تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

وَفِي ''الْفَتْحِ'' مَنْ هَزَلَ بِلَفْظِ كُفْرٍ ارْتَدَّ، وَإِنْ لَمْ يَعْتَقِدْهُ لِلِاسْتِخْفَافِ فَهُوَ كَكُفْرِ الْعِنَادِ۔

ترجمہ: '''' فتح القدیر'' میں ہے: جس نے بطور استہزاء اور خوش طبعی کے کفریہ الفاظ کہے، اگرچہ اُس کا اعتقاد نہ ہو، تخفیف کے سبب وہ مرتد ہوگیا، یہ کفرِ عنادی کی مانند ہے''۔

(جلد6،ص:270)

شوہر کے ارتداد کی وجہ سے بیوی نکاح سے نکل گئی، اس لیے عدت گزارنے کے بعد عورت دوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہے۔ آپ کے شوہر پر لازم ہے کہ ان کلمات سے توبہ کریں اور تجدیدِ ایمان کریں اور تجدیدِ نکاح بھی کریں۔

نمازوں کی قضا

سوال:

مجھے قضا نمازوں کی ادائیگی کے اوقات کے بارے میں آگاہ کردیں اور قضا نمازوں کی ادائیگی کی نیت دن کا نام لے کر کرسکتے ہیں کیا (فلاں دن اور فلاں وقت کی نماز) اور بہت عرصہ گزر جانے کے بعد قضا شدہ نمازوں کی ادائیگی کا خیال آئے اور یاد نہ ہو کہ کتنی نمازیں کس کس وقت کی قضا ہوئیں تو اس صورت میں کیا نیت ہوگی؟ اِس مسئلے کے بارے میں کیا احکامات ہیں؟ (ایس بتول، کراچی)۔

جواب:

انسان کے عاقل وبالغ ہونے کے بعد پانچ وقت کی نماز اس پر فرض ہوجاتی ہے۔ ان میں سے جو نمازیں وہ وقت پر ادا نہیں کرسکا، وہ سب اس کے ذمے باقی ہیں اور ان سب کی قضا لازم ہے۔ قضا پڑھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اپنی اس غفلت اور کوتاہی پر توبہ کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ ایک بھی فرض نماز کسی عذر کے بغیر جان بوجھ کر چھوڑ دینا گناہِ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝

ترجمہ: ''پس اُن نمازیوں کے لیے خرابی ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ (الماعون:5)

حدیث پاک میں ہے: ''جو نمازوں کی پابندی نہیں کرے گا تو (نماز) اس کے لیے (آخرت کی ظلمتوں میں) نور اور (حساب کے موقع پر) برہان اور وسیلۂ نجات نہیں بنے گی''۔ (سنن دارمی:2721)

پانچوں فرض نمازوں کی قضا فرض اور وتر کی قضا واجب ہے، سنتوں کی قضا واجب نہیں بلکہ سنت ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَالْقَضَاءُ فَرْضٌ فِي الْفَرْضِ وَوَاجِبٌ فِي الْوَاجِبِ وَسُنَّةٌ فِي السُّنَّةِ۔

ترجمہ: ''فرض (نماز) کی قضا فرض ہے اور واجب کی قضا واجب ہے اور سنت کی قضا سنت

ہے (یعنی واجب نہیں ہے)۔ (عالمگیری، جلد: 1 ص: 121)

قضا نمازوں کی ادائیگی فرض ہے، غزوۂ احزاب میں کفارِ مکہ کے ساتھ مسلسل حالت جنگ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام چند نمازیں وقت پر ادا نہ کر سکے، تو رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے ساتھ قضا نمازوں کو با جماعت ادا فرمایا۔ عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں:

اِنَّ الْمُشْرِکِیْنَ شَغَلُوْا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنْ أَرْبعِ صَلواتٍ یَومَ الْخَنْدَقِ، حَتّٰی ذَهَبَ مِنَ اللَّیْلِ مَا شَاءَ اللهُ: فَأَمَرَ بِلَالًا فَاَذَّنَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الظُّهْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الْعَصْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الْمَغْرِبَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الْعِشَاءَ۔

ترجمہ: ''غزوۂ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ مشرکین (کے محاصرے) کے سبب چار نمازیں (بروقت) ادا نہ کر سکے، یہاں تک کہ رات کا کچھ حصہ گزر گیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، اُنہوں نے اذان دی اور پھر اقامت کہی تو، رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی، پھر اقامت کہی تو عصر کی نماز پڑھائی پھر اقامت کہی تو مغرب کی نماز پڑھائی، پھر اقامت کہی تو عشاء کی نماز پڑھائی''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 179)

اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ تین نمازیں (ظہر، عصر، مغرب) قضا ہو چکی تھیں اور عشاء کی نماز مستحب وقت سے مؤخر ہو چکی تھی، کیونکہ عشاء کی نماز کا مستحب وقت رات کی پہلی تہائی ہے، ایسا شخص پہلے قضاء شدہ نمازیں پڑھے اور پھر وقتی نماز پڑھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ فقہائے کرام نے بتایا ہے کہ جس شخص کی مسلسل چھ نمازیں قضا نہ ہوئی ہوں، وہ صاحبِ ترتیب ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نسیان کی صورت میں نماز کا وقت نکل بھی سکتا ہے اور اسی کو قضا کہتے ہیں، اس سے بادی النظر میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید نسیان کی بنا پر تاخیر یا قضا کی صورت میں اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں فرمائے گا۔

(۲) مَنْ نَسِیَ صَلٰوۃً فَلْیُصَلِّهَا اِذَا ذَکَرَهَا، لَا کَفَّارَةَ لَهَا اِلَّا ذَالِكَ

ترجمہ: جس کی نماز بھولے سے رہ جائے تو جیسے ہی اسے یاد آئے پڑھ لے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے(صحیح بخاری:597)''۔ یاد آتے ہی پڑھنے کا حکم قضا پر ہی محمول ہوگا۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

وَمَنْ شَغَلَتْ ذِمَّتَهُ بِأَيِّ تَكْلِيفٍ لَا تَبْرَأُ إِلَّا بِتَفْرِيغِهَا أَدَاءً أَوْ قَضَاءً، لِقَوْلِهِ ﷺ: ''فَدَيْنُ اللهِ اَحَقُّ اَنْ يُّقْضٰى''، فَمَنْ وَجَبَتْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ، وَفَاتَتْهُ بِفَوَاتِ الْوَقْتِ الْمُخَصَّصِ لَهَا، لَزِمَهُ قَضَاؤُهَا فَهُوَ اٰثِمٌ بِتَرْكِهَا عَمَدًا، وَالْقَضَاءُ عَلَيْهِ وَاجِبٌ، لِقَوْلِهِ ﷺ: فَاِذَا رَقَدَ اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْ غَفَلَ عَنْهَا، فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا، فَاِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: ''وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، (طٰہٰ:۲۰/۱۴)وَلِلْبُخَارِيِّ: ''مَنْ نَسِيَ صَلٰوةً فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا اِلَّا ذٰلِكَ'' وَمَجْمُوْعُ الْحَدِيْثِ الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ بَيْنَ الْبُخَارِيِّ وَمُسْلِمٍ: ''مَنْ نَامَ عَنْ صَلٰوةٍ اَوْنَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا'' فَمَنْ فَاتَتْهُ الصَّلٰوةُ لِنَوْمٍ أَوْ نِسْيَانٍ قَضَاهَا، وَبِالْاَوْلٰى مَنْ فَاتَتْهُ عَمَدًا بِتَقْصِيْرٍ يَجِبُ عَلَيْهِ قَضَاؤُهَا۔

ترجمہ: ''کسی بھی مشکل کے سبب دینی فریضہ بروقت ادا نہ کرسکے تو جب تک ادا یا قضا کی صورت میں ادائے فرض نہ کرے، آخرت کی جوابدہی سے بری الذمہ نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے فَدَيْنُ اللهِ اَحَقُّ اَنْ يُّقْضٰى، (ترجمہ: ''اللہ کا قرض (یعنی فریضہ) ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے، صحیح بخاری:1953)، تو جس پر نماز فرض ہے اگر اُس نے اُسے مقررہ وقت پر ادا نہ کی ہو تو اس پر اس کی قضا لازم ہے اور دانستہ ترک کرنے پر گنہگار ہوگا اور اس پر قضا بہر حال واجب ہوگی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: فَاِذَا رَقَدَ اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْغَفَلَ عَنْهَا، فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا، فَاِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: ''وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، طٰہٰ:14'' ترجمہ: پس جب تم میں سے کسی کی نماز سوتے میں یا غفلت سے رہ جائے تو جب بھی یاد آئے ادا کرلے، کیونکہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کیجیے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1454)''۔

اور بخاری ومسلم کی متفق علیہ حدیث میں ہے کہ جو نماز کے وقت سوگیا یا بھول گیا تو جب یاد آئے تو اُسے پڑھ لے۔تو جس کی نماز نیند یا غفلت کی وجہ سے فوت ہو جائے تو وہ اس کی قضا کرے اور جس کی نماز قصداً فوت ہو جائے تو اُس پر اس کی قضا واجب ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:2،ص:1148)۔یعنی سوتے رہنے سے نماز قضا ہو جائے تو نیند سے بیدار ہوتے ہی، وضو کر کے نماز پڑھ لے، بشرطیکہ مکروہ تحریمی وقت نہ ہو۔نیند میں مسلسل غافل رہنے سے اگر بیدار ہوتے ہی نماز پڑھ لے تو امید ہے کہ اس پر قضا کرنے کے گناہ کا وبال نہیں ہوگا،لیکن اگر نیند کے دوران ایک بار بیدار ہوگیا اور پھر نیند کی غفلت میں چلا گیا تو پھر یقیناً گنہگار ہوگا۔

قضا نمازیں مکروہ اوقات (طلوعِ آفتاب کے بعد احتیاطاً بیس منٹ تک، نصف النہار شرعی (زوال) اور غروبِ آفتاب سے قبل کے بیس منٹ) کے علاوہ جب بھی فرصت ملے،ادا کرتے رہنا چاہیے اور ہر وقت کی نماز کے ساتھ یعنی وقتی نماز سے پہلے یا بعد میں اس وقت کی نماز کی کم از کم ایک قضا پڑھ لیں اور نیت اس طرح کریں مثلاً فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء اور وتر کی پہلی یا آخری نماز جو میرے ذمے باقی ہے،اُسے بطور قضا ادا کرتا ہوں۔نیت زبانی کرنا ضروری نہیں ہے، دل میں ارادہ کافی ہے۔اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قضا نماز کے بارے میں واضح تاکیدات نہیں ہیں،تو اُس کا سبب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تربیت یافتہ صحابۂ کرام کے بارے میں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ عذر شرعی کے بغیر دانستہ نماز قضا کر دیتے ہوں، جن دو صورتوں (یعنی نیند یا غفلت) کا بشری تقاضے کے تحت وقوع کا امکان تھا،تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کا حکم مذکورہ بالا احادیث میں واضح طور پر بیان فرما دیا۔اور ایک صورت (یعنی حالتِ جنگ میں دشمن کا محاصرہ) جو خود آپ کو صحابۂ کرام سمیت غزوۂ خندق میں پیش آئی،تو اُس میں آپ نے قضا نماز باجماعت پڑھی، لہٰذا خود آپ کے عمل سے قضا نماز پڑھنا ثابت ہے۔حالتِ جنگ پر اور بھی ایسی صورتوں کو قیاس کر سکتے ہیں جہاں کسی خوف یا خطرے سے اتنی بھی فرصت نہ ملے

کہ اُس وقت کی فرض نماز ادا کی جاسکے۔

مسجد کے عملے کی رہائش مصالحِ مسجد میں سے ہے

سوال:

میں ٹنڈو اللہ یار میں محکمۂ اوقاف کی مسجد میں گریڈ 6 میں امام ہوں، ماہانہ مشاہرہ 12000 روپے اور رہائش اوقاف کی طرف سے ہے، یہ رہائش امام کی ملکیت نہیں ہے۔ مسجد میں جمعۃ المبارک کا چندہ بھی جمع ہوتا ہے۔ امام کی رہائش گاہ میں تعمیری کام کی ضرورت ہے، کیا یہ تعمیری کام مسجد کے چندے سے ہوسکتا ہے؟۔ پہلے بھی تعمیراتی کام مسجد عطیات سے ہوتے رہے ہیں۔ (محمد ضیاء الحق، مرکزی عیدگاہ ضلع ٹنڈو الہیار سندھ)

جواب:

امامت کا منصب چونکہ کل وقتی ہے، کسی بھی وقت امام کی خدمات کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اس لیے مساجد کے ساتھ عملے کے مکانات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں عرف عام میں بھی اسے لازم وملزوم سمجھا جاتا ہے۔ فقیہ العصر علامہ محمد نور اللہ نعیمی (فتاویٰ نوریہ جلد 1 ص: 184) لکھتے ہیں: ''تکمیل تعمیر کے بعد ضروریات مسجد میں سے امام اول نمبر میں ہے کیونکہ مسجد کی صرف ظاہری تعمیر کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ اس کی معنوی اور حقیقی تعمیر نہ ہو حتیٰ کہ مسجد کے لیے روشنی پانی وغیرہ کے وسیع تر انتظام سے امام کی ضروریات مقدم ہیں''۔

مسجد کی جمع شدہ رقم مالِ وقف ہے، جو صرف مصارفِ مسجد مثلاً مسجد کے عملے کا مشاہرہ اور ضروریات ومصالح مسجد کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ مسجد کے عطیات صدقاتِ نافلہ ہوتے ہیں۔ آج کل مساجد کے لیے عوام سے جو عمومی چندہ یا عطیات لیے جاتے ہیں، ان میں یہ امر معروف ہے کہ یہ مسجد کے مصارف جاریہ کے لیے ہیں، ان میں مساجد کی تعمیر ومرمت، یوٹیلٹی بلز (بجلی، لاؤڈ اسپیکر، گیس اور پانی وغیرہ) ضرورت کے وقت رنگ وروغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی وسیوریج کا انتظام اور مسجد کے عملے کی تنخواہیں اور دیگر مصارف شامل ہوتے ہیں، البتہ جو رقم تعمیر یا کسی معینہ مصرف کے لیے دی جائے یا لی

جائے، اسے صرف اسی معیّن مصرف پر خرچ کرنا ضروری ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ثُمَّ اِلٰی مَاهُوَاَقْرَبُ اِلَی الْعِمَارَةِ وَاَعَمُّ لِلْمَصْلَحَةِ كَالْاِمَامِ لِلْمَسْجِدِ وَالْمُدَرِّسُ لِلْمَدْرَسَةِ يُصْرَفُ اِلَيْهِمْ بِقَدْرِ كِفَايَتِهِمْ ثُمَّ السِّرَاجُ وَالْبُسُطُ كَذٰلِكَ اِلٰی اٰخِرِ الْمَصَالِحِ، هٰذَا اِذَا لَمْ يَكُنْ مُعَيَّنًا، فَاِنْ كَانَ الْوَقْفُ مُعَيَّنًا عَلٰی شَیْءٍ يُصْرَفُ اِلَيْهِ بَعْدَ عِمَارَةِ الْبِنَاءِ كَذَا فِي الْحَاوِي الْقُدْسِيِّ

ترجمہ: ''پھر وقف کے مال کو اُن امور پر ضرورت کے مطابق خرچ کیا جائے، جن سے مسجد کی زیادہ آبادکاری ہو اور مسجد کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں جیسے مسجد کے لیے امام اور مدرسے کے لیے مُدَرِّس جن پر اس قدر رقم خرچ کی جائے جو ان کی ضروریات کے لیے کفایت کرے، پھر چراغ (یعنی روشنی) اور دَریوں وچٹائیوں کا انتظام اور اسی طرح دوسری مفید چیزیں۔ وقف کے مال کو خرچ کرنے میں یہ (وسعت) اس صورت میں ہے کہ اس کا مصرف (واقف کی طرف سے) مُعَیَّن نہ ہو، لیکن اگر وقف کا مَصرف (واقف کی طرف سے) مُعَیَّن ہے تو عمارت کی تعمیر کے بعد اسی مصرف پر صرف کیا جائے گا ''الحاوی القدسی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:368، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

ہماری رائے میں مسجد کے ضروری عملے کے مکانات بھی مصالحِ مسجد میں شامل ہیں، مصالح سے مراد وہ اُمور یا اشیاء جو تعمیرِ مسجد کے مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہوں یا مُمِد ومعاون ہوں اور ان میں سہولت کا سبب بنیں۔ آج کل مسجد کو دیے جانے والے عطیات میں یہ معروف ہے۔

وضوخانے اور استنجا خانے کے لیے بالعموم معین طور پر الگ چندہ نہیں لیا جاتا اور مسجد کے عمومی فنڈ سے یہ کام انجام پاتے ہیں۔ اب مساجد میں بالعموم ٹوائلٹ بھی بنائے جارہے ہیں، کیونکہ صفائی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے۔ شاہراہوں پر سرِ راہے جو مساجد ہیں یا شہروں کی مساجد میں اجنبی نمازیوں کے لیے یہ ضرورت بن گئی ہے۔ اسی طرح

امام وخطیب اور خدام کی رہائش گاہوں کا مسئلہ ہے۔ انتظامیہ کو چاہیے کہ شرعی احتیاط کے پیشِ نظر چندے کی رسید پر لکھ دیا کریں: ''مسجد سے متعلق جملہ مصارف کے لیے'' اور اعلان بھی اسی طرح کیا کریں۔ ہاں! جو عطیات کسی خاص مد میں لیے جائیں، اُنہیں انہی مدات پر خرچ کیا جائے۔ علامہ نور اللہ بصیر پوری کے فتوے میں ''معنوی تعمیر'' سے یہی مراد ہے کہ مسجد کی عمارت ہی مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اس کو عبادت گزاروں سے آباد کرنا اور اس مقصد کے لیے سہولتیں فراہم کرنا بھی مقاصدِ تعمیر میں شامل ہے۔ اسی لیے مُفسرین کرام نے سورۂ توبہ آیت: 18 میں ''عِمَارَةُ الْمَسْجِد'' کو اسی عموم میں لیا ہے۔ علامہ محمد طاہر پٹنی لکھتے ہیں: ''عَمَرَ الْمنزلَ وَعَمَرَ الْمَنْزِلَ'' کے معنیٰ ہیں: گھر بسانا اور آباد کرنا''۔

(مجمع بحار الانوار، جلد 2، ص: 678)

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: ''عمارۃ مسجد کے دو معنیٰ ہیں: (۱) مسجد میں کثرت سے آنا اور مسجد کو لازم پکڑ لینا (۲) مسجد کو بنانا اور اس کی تعمیر کرنا، (تفسیر کبیر، جلد 6، ص: 9)''۔ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں: ''بعض مُفسرین نے عمارت مسجد سے مراد مسجد میں آنا اور عبادت کے لیے بیٹھنا مراد لیا ہے، امام احمد، امام ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے ابو سعید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم دیکھو کہ ایک شخص مسجد (عبادت کے ذریعے) آباد رکھتا ہے، تو اس کے ایمان کی شہادت دو اور پھر اس آیت (توبہ: 18) کا حوالہ دیا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''عمارت مسجد سے مراد یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ عبادت کی جائے، ذکر الٰہی اور قرآن کی تعلیم وتعلّم کا سلسلہ جاری ہو۔

(تفسیر مظہری، جلد 4، ص: 147-146)

یہ امر واضح ہے کہ مسجد کے عملے کے مکانات و دیگر متعلقات مسجد کے عمومی وقف کا حصہ ہوتے ہیں، امام وخطیب کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے اور وہ اُن سے اسی وقت تک استفادہ کرنے کے مُجاز ہوتے ہیں، جب تک وہ اس منصب پر فائز ہیں اور یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

نوٹ: جامع مسجد مصطفیٰ KBR بفرزون کراچی کی انتظامیہ نے نماز سے متعلق چند سوالات ارسال کیے ہیں، جوسوال وجواب کی صورت میں درجِ ذیل ہیں:

نماز کی نیت اور تکبیرِ تحریمہ کا طریقہ

سوال:

ایک شخص نماز کی نیت کرتے وقت شرعی تقاضے پورے نہیں کرتا، یعنی اُس کی انگلی وہتھیلی کا رُخ کعبہ کی طرف نہیں ہوتا، تو ایسے شخص کا نماز ادا کرنا کیسا ہے۔

(انتظامیہ جامع مسجد مصطفیٰ، KBR بفرزون کراچی)

جواب:

نیت دل کے ارادے کا نام ہے، زبان سے نیت کے کلمات، جو ہمارے ہاں معروف ہیں، کا ادا کرنا نہ حدیث سے ثابت ہے، نہ شرعاً ضروری ہے، ہمارے متاخرین فقہاءِ کرام نے حضورِ ذہنی (Presence of Mind) کے لیے زبانی نیت کو مستحب قرار دیا ہے۔ تکبیر نماز کا رُکنِ اول ہے اور فرض ہے۔ نماز کی نیت سے اللہ اکبر کہنے سے انسان نماز میں داخل ہوجاتا ہے، اسے تکبیرِ تحریمہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اُمور (مثلاً کلام وطعام وغیرہ) جو نماز میں داخل ہونے سے پہلے حلال تھے، اب وہ نماز سے فراغت تک حرام ہوگئے ہیں، نماز کے اندر رکوع میں جانے، سجدہ میں جانے اور اٹھنے کے لیے جو تکبیرات کہی جاتی ہیں، اُنہیں تکبیراتِ انتقال کہتے ہیں، یہ تکبیرات سُنّت ہیں، اگر بھولے سے رہ جائیں تو نماز صحیح طور پر ادا ہوجاتی ہے، البتہ جان بوجھ کر نہیں چھوڑنی چاہییں، اِس سے ترکِ سنت لازم آئے گا اور نماز کے اجر میں کمی واقع ہوگی۔

نیت کرتے وقت تکبیرِ تحریمہ کے لیے ہاتھ اٹھانا اور ہتھیلی اور انگلیوں کا پیٹ قبلہ رُو ہونا نماز کی سنتوں میں سے ہے اور سنت یہ ہے کہ ہاتھوں کی انگلیاں اپنے حال پر چھوڑ دے یعنی نہ بالکل ملائے اور نہ بہ تکلف کشادہ رکھے بلکہ اپنے حال پر چھوڑ دے۔ اس کا ترک خلافِ سنت ہے، لیکن نماز ادا ہوجائے گی۔ بلکہ اگر بھول کر کوئی شخص تکبیرِ تحریمہ کے لیے

ہاتھ نہ اٹھائے تو اُس کی نماز بھی درست ہوگی ،علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں :

وَلَوکَبَّرَ وَلَم یَرفَعْ یَدَیهِ حَتّٰی فَرَغَ مِنَ التَّکْبِیْرِ لَمْ یَأْتِ بِهٖ وَاِنْ ذَکَرَهٗ فِیْ اِثْنَاءِ التَّکْبِیْرِ یَرفَعُ

ترجمہ:''اگر تکبیر کہہ لی اور (بھول کر) ہاتھ نہ اٹھائے یہاں تک کہ تکبیر پوری کہہ لی تو اب ہاتھ نہ اٹھائے اور اگر تکبیر پوری کہنے سے پہلے یاد آ گیا تو ہاتھ اٹھا لے''۔

(فتاویٰ عالمگیری ،جلد 1 ،ص:73)

بے وضو شخص کی اذان کا حکم

سوال:

اگر مؤذن بغیر وضو اذان پڑھتا ہے تو کیسا ہے؟۔

جواب:

بغیر وضو اذان نہ دی جائے، حدیث پاک میں ہے: لَایُؤَذِّنُ اِلَّا مُتَوَضِّیءٌ۔

ترجمہ:''کوئی شخص بغیر وضو اذان نہ دے''۔(سنن ترمذی:200)

(۲)لَایُنَادِی بِالصَّلَاۃِ اِلَّا مُتَوَضِّیءٌ۔

ترجمہ:''کوئی مؤذن نماز کے لیے بغیر وضو نہ پکارے''۔(سنن ترمذی:201)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَیُکْرَہُ أَذَانُ جُنُبٍ وَاقامتُهٗ وَاِقَامَةُ مُحدِثٍ لَاأذانُهٗ)عَلَی الْمَذھَبِ۔

ترجمہ:''جُنب کی اذان اور اقامت مکروہ ہے اور صحیح مذہب کے مطابق بے وضو کا اقامت کہنا مکروہ ہے، (عندالضرورت) اذان مکروہ نہیں ہے، (جلد2،ص:605،دمشق)''۔لیکن بے وضو اذان دینے کو عادت بنالینا بہرحال قابلِ ملامت وقابلِ مذمت ہے، کیونکہ حدیث پاک میں اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

نماز کے بعد امام کے بیٹھنے کی ہیئت

سوال:

امام کا نماز ختم ہوتے ہی دعا سے پہلے مُصَلّٰی پر اپنی پیٹھ قبلے کی طرف کر کے بیٹھنا کیسا ہے اور اس کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟۔

جواب:

فرض نماز سے سلام پھیرنے کے بعد سنت یہ ہے کہ امام دائیں یا بائیں کو انحراف کرے، دائیں طرف افضل ہے۔ اگر سامنے کوئی شخص نماز نہ پڑھ رہا ہو تو قبلے کی طرف پیٹھ اور مقتدیوں کی جانب منہ کر کے بھی بیٹھ سکتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا صَلّٰى صَلٰوةً اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ۔

ترجمہ: ''حضرت سمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب نماز پڑھ لیتے تو ہماری طرف منہ کر کے بیٹھتے''۔ (صحیح بخاری:845)

نماز پڑھانے کے بعد امام پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کسی ایک جانب مڑ کر بیٹھے، وہ دائیں طرف بھی مڑ کر بیٹھ سکتا ہے اور بائیں طرف بھی اور قبلے کی طرف پیٹھ کر کے بھی بیٹھ سکتا ہے۔

وَكَانَ اَنَسٌ يَنْفَتِلُ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ يَسَارِهٖ وَيَعِيْبُ عَلٰى مَنْ يَتَوَخّٰى، أَوْ مَنْ يَعْمِدُ الِانْفِتَالَ عَنْ يَمِيْنِهٖ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ (نماز کے بعد) کبھی دائیں طرف مڑ کر بیٹھتے تھے اور کبھی بائیں طرف اور جو دائیں طرف مڑنے کا التزام کرتا، اس کو ناپسند کرتے تھے''۔

(صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الانفتال والانصراف عن الیمین والشمال)

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا:

لَا يَجْعَلْ أَحَدُكُمْ لِلشَّيْطَانِ شَيْئًا مِنْ صَلَاتِهٖ يَرٰى أَنَّ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ لَا يَنْصَرِفَ اِلَّا عَنْ يَمِيْنِهٖ، لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ كَثِيْرًا يَنْصَرِفُ عَنْ يَسَارِهٖ۔

ترجمہ:''تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کا کوئی حصہ نہ بنائے، یعنی وہ یہ نظریہ رکھتا ہو کہ اُس پر دائیں طرف مڑ کر بیٹھنا لازم ہے، کیونکہ میں نے بہت دفعہ نبی ﷺ کو بائیں طرف مڑتے ہوئے دیکھا ہے''۔(صحیح بخاری:852)

اس حدیث مبارک کے ان الفاظ،''کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام پھیرنے کے بعد اکثر بائیں جانب مڑتے ہوئے دیکھا''، کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی ایک رُخ پر مُڑنے کا التزام نہیں فرماتے تھے، بلکہ اپنی سہولت کے مطابق کسی ایک جانب رخ پھیر لیتے تھے۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز سے سوال کیا گیا:''نماز کے بعد چاروں جہات میں سے کسی ایک جانب رُخ کر کے دعا کرنا درست ہے یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا:''جہتِ قبلہ ہر جگہ افضل ہے، مگر امام کے لیے (نہیں) کہ بعد سلام اُسے قبلہ رُو رہنا مکروہ ہے، دائیں یا بائیں پھر جائے یا (قبلے کی جانب پشت کر کے) مقتدیوں کی طرف منہ کر لے، اگر سامنے کوئی نماز نہ پڑھتا ہو''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 6،ص:190، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نماز میں سلام پھیرتے وقت''السلام علیکم'' کہنا چاہیے

سوال:

نماز میں سلام پھیرتے وقت السلام علیکم کہنا چاہیے یا سلام علیکم کہنا ٹھیک ہے؟۔

جواب:

سلام کے الفاظ کہنا واجب ہیں اور دونوں طرف چہرہ پھیرنا سنت ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يُسَلِّمُ عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ يَسَارِهِ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ (نماز کے اختتام پر) دائیں اور بائیں جانب سلام پھیرتے اور فرماتے: السلام علیکم و رحمۃ اللہ''۔ امام ترمذی نے کہا:

مُتعدد صحابۂ کرام سے اس عنوان پر روایات منقول ہیں''۔(سُنن ترمذی:295)

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ أَنَّہٗ کَانَ یُسَلِّمُ عَنْ یَمِیْنِہٖ وَعَنْ شِمَالِہٖ حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ خَدِّہٖ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نماز کے اختتام پر) دائیں اور بائیں جانب سلام پھیرتے، یہاں تک کہ (آپ کے اطراف میں صف میں بیٹھے ہوئے صحابۂ کرام کو) آپ کے رخسارِ مبارک کی سفیدی بھی نظر آتی (اور فرماتے:) اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ،(سُنن ابن ماجہ:914)

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(وَلَفْظ اَلسَّلَامُ) مَرَّتَیْنِ، فَالثَّانِي وَاجِب عَلَی الْأَصَحِّ، بُرھَان''،دُوْنَ عَلَیْکُمْ، وَتنقَضِی قُدْوۃٌ بِالْأَوَّلِ قَبلَ ''عَلَیْکُم''عَلَی الْمَشْھُورِ عِنْدَنَا

ترجمہ:''اور لفظ''السلام'' دومرتبہ کہنا واجب ہے، یہی قول صحیح ترین ہے، بحوالہ'' برہان شرح مواہب الرحمٰن''۔ لفظ''علیکم'' کہنا واجب نہیں ہے اور امام کی نماز پہلے لفظ پر (یعنی ''السّلام'' کہنے سے) مکمل ہوجاتی ہے، صاحبین کے نزدیک یہی مشہور قول ہے۔علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا: بعض نے لفظ''السلام'' کو سنّت کہا ہے''۔(جلد2،ص:143)

ہمارے فقہاء کرام نے نماز کے ارکان بیان کرتے ہوئے آخر میں کہا:''اور نمازی کا اپنے کسی ایسے فعل کے ذریعے جونماز کے منافی ہو، نماز سے خارج ہونا''۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أَيْ بِصنْعِ الْمُصَلِّيْ أَيْ فِعلِہِ الِاخْتِیَارِيِّ بِأَيِّ وَجہٍ کَانَ مِنْ قَولٍ أَوفِعلٍ یُنَافِي الصَّلَاۃَ بعدَ تَمَامِھَا کَمَا فِي ''الْبَحرِ''وَذٰلِکَ بِأَن یُبْنِیَ عَلٰی صَلَاتِہٖ صَلَاۃٌ مَا فرضًا أونفلاً، أَوْیَضْحَکَ قَھْقَھَۃً، أَوْیُحْدِثَ عَمَداً، أَوْیَتَکَلَّمَ أَوْیَذْھَبَ أویُسَلِّمَ،''تاترخانیۃ''۔

ترجمہ:''یعنی نمازی کا تکمیلِ نماز پر اپنے اختیار سے قولاً یا فعلاً ایسا کام کرنا، جونماز کے منافی ہو، جیسا کہ''البحرالرائق'' میں ہے اور یہ اٹھ کرکسی دوسرے فرض یا نفل کی نیت کرنے کی

صورت میں بھی ہوسکتا ہے یا قہقہہ لگانا یا دانستہ بے وضو ہو جانا یا کلام کرنا یا اُٹھ کر چلے جانا یا سلام کرنا،بحوالہ''تتارخانیہ''، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد:1،ص:121 ،داراحیاء التراث العربی)''۔مگر قہقہہ وغیرہ کو تنویر الابصار مع الدرالمختار میں مکروہ تحریمی قرار دیا گیا ہے،لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی اِتباع میں ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللہ'' دائیں بائیں رُخ کر کے کہنا چاہیے اور بعض علماء نے اسے سنّت اور بعض نے واجب کہا ہے۔نماز کے اندر قہقہہ ناقضِ وضو بھی ہے۔

امام کا اقامت سے پہلے مصلّٰی پر بیٹھنا ضروری نہیں ہے

سوال:

امام کو جماعت سے کتنی دیر قبل مصلے پر بیٹھنا افضل ہے،امام کا پیچھے بیٹھ کر باتیں کرنا کیسا ہے؟۔امام کا فجر میں جماعت سے ایک منٹ قبل یا اس سے بھی کم وقت میں آنا پھر سنت جلدی جلدی ادا کرنا اور جماعت تاخیر سے کرانا کیسا عمل ہے؟۔

جواب:

اقامت کے وقت امام کا مصلے پر موجود ہونا کوئی ضروری نہیں، نہ ہی افضلیت کا کوئی معیار اِس سے قائم ہوگا۔صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا: ''امام مصلّٰی پر نہیں ہے،مسجد کے صحن میں کھڑا یا بیٹھا ہے یا بیرونِ مسجد حجرہ میں ہے اور مکبّر نے اقامت شروع کردی، یہ جائز ہے یا نہیں؟''،آپ نے جواب میں لکھا:''تکبیر شروع کردینا جائز ہے اور یہی طریقہ زمانۂ رسالت میں تھا کہ حضور اقدس ﷺ حجرہ میں ہوتے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ تکبیر کہہ دیا کرتے تھے،اقامت کے وقت امام کا مصلّٰی پر ہونا نہ واجب، نہ سنّت، نہ مستحب، مُصلّٰی پر ہو یا نہ ہو دونوں برابر''۔(فتاویٰ امجدیہ جلد 1 ،ص:67)

لہٰذا خود سے شریعت میں اضافہ کرنا درست نہیں ہے کہ اقامت سے پہلے امام سے مُصلّٰی پر بیٹھنے کا تقاضا کیا جائے۔مسجد میں دنیاوی غیر ضروری گفتگو کرنا منع ہے،ہاں شرعی مسائل وغیرہ سمجھانے کی لیے کسی سے گفتگو کر رہا ہے تو جائز ہے،لیکن اس کے لیے بھی بہتر یہ

ہے کہ علیحدہ سے نشست رکھے۔

جماعت کے وقت کی تعیین شارع کی طرف سے نہیں ہے، بندوں نے اپنی آسانی کے لیے اوقات مقرر کیے ہیں، لیکن یہ شریعت کی بیان کی ہوئی ابتدائی وانتہائی مُقررہ حد کے اندر ہونے چاہییں۔ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صرف نماز کے ابتدائے وقت اور انتہائے وقت کی نشاندہی فرمائی ہے اور مستحب وقت کو بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝

ترجمہ: ''بے شک ایمان والوں پر نماز وقت مقررہ میں فرض کی گئی ہیں''۔(نساء:103)

امام پنج وقتہ نماز پڑھانے کا پابند ہے، اُسے وقت کی پابندی کرنی چاہیے، جماعت کا وقت ہونے سے پہلے سکون ووقار کے ساتھ سنت ادا کرنی چاہییں۔

امام کا سنتِ غیر مؤکَّدہ کا التزام نہ کرنا

سوال:

کیا امام کے لیے غیر مؤکدہ سنت پڑھنا منع ہے، چونکہ یہ حضرات پڑھتے ہوئے نظر نہیں آتے، بلکہ عشاء کی نماز تو مستقل طور پر گیارہ یا تیرہ رکعت بھی ہمیشہ پڑھنا ایک امام کے لیے کیسا عمل ہے؟۔

جواب:

نمازِ عشاء کی ابتدائی چار رکعات سنّتِ غیر مؤکدہ ہیں اور چار رکعت فرض کے بعد دو رکعات سنّت مؤکدہ ہیں اور تین رکعات وتر واجب ہے۔ بعض سنتیں مؤکدہ ہیں جن کی ادائیگی کی تاکید آئی ہے، بغیر کسی عذر کے چھوڑنے پر گنہگار اور ترک کی عادت پر مستحقِ عذاب ہے۔ سنتِ غیرِ مُؤکّدہ (جنہیں ''سننِ زوائد'' بھی کہتے ہیں) پر شریعت میں اس قدر تاکید نہیں آئی، تاہم سُنَنِ غیرِ مُؤکّدہ اور نوافل پڑھنے پر جو اجر اور برکات ہیں، وہ اُسی کو عطا ہوں گی، جسے پڑھنے کی سعادت نصیب ہوگی۔

ایسے علماء ومفتیانِ کرام جو دین کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اور لوگ

اُن کی جانب رجوع کرتے ہیں، اُنہیں کثرتِ مشاغل کے سبب سنتیں ادا نہ کرنے کی رخصت ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَلَایَجُوْزُ تَرْکُھَا لِعَالِمٍ صَارَ مَرْجِعًا فِی الفتاوٰی بخلافِ بَاقِی السُّنَن فَلَہٗ تَرْکُھَا لِحَاجَۃِ النَّاسِ اِلٰی فَتْوَاہ

ترجمہ:''فجر کی دو رکعات سنت کا ترک کرنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی عالم مرجع فتویٰ ہو کہ لوگوں کی حاجت کے سبب فتویٰ دینے میں اُسے سنت پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، تو (نمازِ فجر کی سنت کے علاوہ) باقی سنتیں ترک کرسکتا ہے''۔(جلد 4،ص:265، دمشق)

آپ نے لکھا:''یہ حضرات پڑھتے ہوئے نظر نہیں آتے''، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام ائمہ کے بارے میں آپ نے بدگمانی کی کہ سنتیں نہیں پڑھتے، شریعت میں مومن کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، ممکن ہے کہ مذکورہ امام صاحب اپنے گھر میں پڑھتے ہوں۔ سنتوں اور نوافل کا گھر پر پڑھنا بہتر ہے۔ احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) فَاِنَّ خَیْرَصَلَاۃِ الْمَرْءِ فِیْ بَیْتِہٖ اِلَّا الصَّلَاۃَ الْمَکْتُوْبَۃَ۔

ترجمہ:''فرض نمازوں کے سوا (کہ اُن کا مسجد میں باجماعت پڑھنا افضل ہے) بہترین نماز وہ ہے، جو کوئی شخص اپنے گھر میں پڑھتا ہے''۔(سُنن ابوداؤد:1442)

(۲) اِجْعَلُوْا فِیْ بُیُوْتِکُمْ مِنْ صَلَاتِکُمْ، وَلَاتَتَّخِذُوْھَا قُبُوْرًا۔

ترجمہ:''اپنی (نفلی) نمازیں اپنے گھروں میں بھی پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ (کہ گھروں میں نمازیں بالکل نہ پڑھی جائیں)''۔(سُنن ابوداؤد:1445)

(۳) اَفْضَلُ صَلَاتِکُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِلَّا الْمَکْتُوْبَۃَ۔

ترجمہ:''فرض نمازوں کے علاوہ نفلی نماز کا گھر میں پڑھنا افضل ہے''۔(سُنن ترمذی:450)

(۴) اِذَاقَضٰی اَحَدُکُمُ الصَّلَاۃَ فِیْ مَسْجِدِہٖ، فَلْیَجعَل لِبَیْتِہٖ نَصِیبًا مِنْ صَلَاتِہٖ، فَاِنَّ اللہَ جَاعِلٌ فِی بَیْتِہٖ مِن صَلَاتِہٖ خَیْرًا۔

ترجمہ:''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں فرض) نماز پڑھ لے تو اپنی نماز کا ایک حصہ اپنے

گھر کے لیے رکھ لے، اللہ تعالیٰ اس کی نماز کے سبب سے اس کے گھر میں خیر رکھنے والا ہے''۔(صحیح مسلم:1791)

آپ نوافل اور سُنّتِ غیر مؤکّدہ نہ پڑھنے پر کسی کو ملامت نہیں کرسکتے، البتہ پڑھنے والے کی تحسین کرنا اچھی بات ہے، آج کل ایک اَخلاقی بیماری اپنی بڑائی اور پارسائی کے زَعم میں مبتلا ہونے کی ہے، اس کے لیے دوسروں کے عیوب تلاش کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى

ترجمہ:''سوتم اپنی پارسائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ متقین کو خوب جانتا ہے''۔(نجم:32)

حدیث پاک میں ہے:

(۱)وَلَا تَتَّبِعُوا عَوَرَاتِهِم، فَاِنَّهُ مَن تَتَبَّعَ عَورَةَ أَخِيهِ الْمُسلِمِ تَتَبَّعَ اللهُ عَورَتَهُ،

ترجمہ:''مسلمانوں کے پوشیدہ احوال کا سراغ نہ لگاؤ، کیونکہ جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کے دَرپے ہوگا، اللہ اس کی پردہ دری فرمائے گا''۔(سُنن ترمذی:2032)

(۲)مَنْ سَتَرَ عَورَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، سَتَرَ اللهُ عَورَتَهُ يَومَ الْقِيَامَةِ۔ وَمَنْ كَشَفَ عَورَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، كَشَفَ اللهُ عَورَتَهُ حَتّٰى يَفْضَحَهُ بِهَا فِي بَيْتِهِ۔

ترجمہ:''جو اپنے مسلمان بھائی (کے عیوب) پر پردہ ڈالے گا، اللہ تعالیٰ (اس کی جزا میں) قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کرے گا، اللہ اس کا پردہ فاش فرمائے گا، یہاں تک کہ اسے اس کے گھر میں رسوا کردے گا۔

(سُنَنِ ابن ماجہ:2546)

ہمیں اپنی اصلاح پر توجہ دینی چاہیے، دوسروں کی پردہ پوشی اچھی بات ہے، سوائے اس کے کہ کسی کی بدعملی اتنی ظاہر وباہر ہو کہ اس کے شر سے پورا معاشرہ متاثر ہورہا ہو۔ بہادر شاہ ظفر نے کہا ہے:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

عادی طور پر ہیر پھیر کا مرتکب ہونا

سوال: ایک ایسا شخص جو جھوٹ، دھوکا، بددیانتی اور پیسے کے ہیر پھیر کا مرتکب ہوا ہو، لوگوں کے سامنے توبہ کرکے آئندہ ان حرکتوں کو ترک کرنے کا وعدہ بھی کرے، پھر اگلے روز انہی حرکتوں کا ارتکاب کرے تو کیا ایسا شخص مؤذن بن سکتا ہے، اُس کے پیچھے تراویح پڑھی جاسکتی ہیں۔ (انتظامیہ جامع مسجد محمدی، ناتھا خان گوٹھ)

جواب:

سچائی، دیانت وامانت مومن کی صفات بھی ہیں اور تعلیماتِ مصطفیٰ ﷺ کا منشا بھی۔ دین سے وابستہ افراد کو تو ان کمالات سے مُتصف ہونا ہی چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے:

قِيْلَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا، فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهُ: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلًا، فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهُ: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا، فَقَالَ: لَا۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے، فرمایا: نہیں، (موطا امام مالک:3630،شعب الایمان، جلد 10، ص: 326، رقم الحدیث: 4622)''۔ اسی طرح کسی کو دھوکا دینا شرعاً حرام اور ناجائز ہے، حدیث مبارک میں اِس کی شناعت کو یہ بیان فرمایا:

مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔

ترجمہ: ''جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں''۔ (صحیح مسلم: 279)

کثیر آیاتِ قرآنِ کریم واحادیثِ مبارکہ دیانت وامانت اور ایفائے عہد کے وجوب کے بارے میں موجود ہیں۔ اگر آپ کا بیان درست ہے کہ سوال میں ایک شخص کے ایسے رذیل خصائل بیان کیے گئے ہیں، جو فسق کے ذیل میں آتے ہیں، مثلاً جھوٹ، خیانت،

دھوکا دہی وغیرہ اور پھر توبہ کر کے بار بار ان کا اعادہ کرنا، ان عادات کا مرتکب فاسق ہے، تاوقتیکہ سچی توبہ کرے اور آئندہ ان حرکات سے اجتناب کرے۔ فاسق کو مسجد میں باقاعدہ مؤذن مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ فاسق کی اذان کے بارے میں فقہی احکام یہ ہیں:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''وَیُکْرَہُ اَذَانُ الْفَاسِقِ وَلَا یُعَادُ، ھٰکَذَا فِی ''الذخیرۃ''، وَکُرِہَ اَذَانُ الْجُنُبِ وَاِقَامَتُہٗ بِاِتِّفَاقِ الرِّوَایَاتِ وَالْاَشْبَہُ اَنْ یُّعَادَ الْاَذَانُ وَلَا تُعَادَ الاقامۃ''۔

ترجمہ: ''فاسق کی اذان مکروہ ہے اور اس کا اعادہ نہیں کیا جائے گا، ''ذخیرہ'' میں اسی طرح ہے اور جنبی (یعنی جس پر غسل واجب ہے) کی اذان واقامت بہ اتفاقِ روایات (فقہی) مکروہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اذان کا اعادہ کیا جائے اور اقامت کا اعادہ نہ کیا جائے''۔

(عالمگیری، ج:1، ص:54)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَیُکْرَہُ اَذَانُ جُنُبٍ وَاِقَامَتُہٗ وَاِقَامَۃُ مُحدِثٍ، لا اذانہ عَلَی الْمَذْھَبِ وَاَذَانُ اُمْرَأَۃٍ وَخُنْثٰی و (فَاسِقٍ) وَلوعَالِمًا، لٰکِنَّہٗ اَولٰی بامامۃٍ وَاذانٍ من جَاھِلٍ تَقِیٍّ''۔

ترجمہ: ''جُنب کی اذان واقامت اور بے وضو کی ''اقامت'' مکروہ ہے، مذہب مختار کے مطابق بے وضو کی اذان مکروہ نہیں ہے، اور عورت، خُنثٰی اور فاسق کی اذان مکروہ ہے، خواہ وہ عالم ہو، لیکن (اگر امامت کا صحیح اہل دستیاب نہ ہو تو) جاہل متقی کے مقابلے میں فاسق عالم اذان واقامت کا زیادہ حق دار ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین، جزء:2، ص:606، دار الثقافۃ والتراث، دمشق)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فاسق کو مستقل امام بنایا جائے، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کہیں باجماعت نماز کا موقعہ آجائے اور جملہ فقہی شرائط کا اہل امام دستیاب نہ ہو تو جاہل متقی کی بجائے فاسق عالم کو امامت میں ترجیح دی جائے۔

اسی طرح جس امام سے مقتدی دینی وجوہ کی بنا پر ناراض ہو، اس کو امام مقرر کرنا

درست نہیں ہے۔تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

(وَلَوأَمَّ قوماًوَهُمْ لهٗ كَارِهُون،اَنَّ)الْكَرَاهَةَ(لِفَسَادٍفِيهِ أَوْلِاَنَّهُم أَحَقُّ بِالِامَامَةِ مِنهُ كُرِهَ)لَهٗ ذٰلِكَ تَحرِيمًا لحديثِ أبِي داؤدَ''لايقبَلُ اللهُ صَلاۃَ من تَقَدَّمَ قوماً وهُمْ لهٗ كارهون''(وإن هوأحَقُّ،لا)والكراهةُعليهم۔

ترجمہ:''اگرکسی شخص نے کسی ایسی قوم کی امامت کی جواُسے(کسی دینی خرابی کے سبب) ناپسند کرتے ہیں یااس لیے کہ وہ اس کے مقابلے میں(شرعی اعتبار سے)امامت کے زیادہ حق دار ہیں،توسنن ابوداؤد کی حدیث کی رُو سے اُس کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔

سنن ابوداؤد کی حدیث یہ ہے:

''اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا جوکسی ایسی قوم کی امامت کے لیے آگے بڑھے جواسے ناپسند کرتے ہوں''۔(سنن ابوداؤد:589)

اوراگروہ شخص(شریعت کی رُو سے)امامت کا زیادہ حق دار ہے،تواس کی امامت مکروہ نہیں ہےاورکسی شرعی سبب کے بغیرامام سے نفرت کاوبال مقتدیوں پرہوگا''۔

(جلد2،ص:254مطبوعہ:داراحیاءالتراث العربی،بیروت)

اگرآپ کا بیان درست ہے کہ مؤذن نے ان غلطیوں کاارتکاب کیاہےاورتوبہ کرنے کے بعدپھراُن کاارتکاب کررہاہے،تواُس کومنصب سے ہٹایاجاسکتاہے،رسول اللہ ﷺ کاارشادہے:

اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ، اَللّٰهُمَّ أَرْشِدِ الْأَئِمَّةَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ۔

ترجمہ:''امام(مقتدیوں کی نماز کا)ضامن ہےاورمؤذن(اوقات صلوٰۃ کے شروع ہونے کااعلان کرنے میں)امین ہے،اے اللہ!اماموں کوہدایت عطافرمااورمؤذنوں کی مغفرت فرما''۔(سنن ترمذی:207)

بشری کمزوریاں توسب میں ہوتی ہیں اور مُتنبّہ کرکے ان کواصلاح کا موقع دینا چاہیے۔لیکن جب کوئی ان اخلاقی جرائم پرجری ہوجائے،تواس کامؤذن اورامامِ تراویح

کے منصب پر برقرار رکھنا ان مَناصِب کے شرعی وقار کے منافی ہے۔

مسجد سے نمازیوں کو روکنے کا حکم

سوال:

جامع مسجد الفلاح (کونکر گڈاپ ٹاؤن ملیر) میں نمازِ با جماعت کے دوران چند افراد مسجد کے گیٹ پر کھڑے ہوکر نمازیوں کو جماعت میں شامل ہونے سے روکتے ہیں، جماعت ختم ہوتے ہی مسجد کے ایک کونے میں اپنی الگ جماعت کرتے ہیں۔ کیا اس طرح نمازیوں کو روکنا، عمداً جماعت میں شامل نہ ہونا اور علیحدہ جماعت کرانا شرعاً جائز ہے؟

(محمد رمضان گبول، خطیب وامام مسجد الفلاح، کونکر گڈاپ ٹاؤن، ضلع ملیر، کراچی)

جواب:

سورۃ القلم آیت نمبر:12 میں ایک دشمنِ رسول کی مذموم صفات میں ایک صفت ''مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ'' بیان کی گئی ہے، جس کے معنی ہیں: ''نیکی سے بہت زیادہ روکنے والا''۔ اور ارشاد فرمایا: اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ ترجمہ: ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے (ہمارے) بندے کو جب وہ نماز پڑھے''۔ (العلق:10-9)

محلے کی مساجد میں جہاں امام مقرر ہو، امام نے اذان واقامت کے ساتھ مسنون طریقے پر جماعت ادا کر لی ہو تو اذان واقامت کے ساتھ ہیئتِ اولیٰ پر دوبارہ جماعت قائم کرنا مکروہ ہے، شارعِ عام کی مساجد، اسٹیشنز اور سرائے کی مساجد اِس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَيُكْرَهُ تَكْرَارُ الْجَمَاعَةِ بِأَذَانٍ وَاِقَامَةٍ فِيْ مَسْجِدِ مَحَلَّةٍ، لَافِي مَسْجِدِ طَرِيقٍ أو مسجدٍ لَا اِمَامَ لَهُ وَلَا مؤَذِّنَ۔

ترجمہ: ''محلہ کی مسجد میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر شارعِ عام کی مسجد اور وہ مسجد جہاں امام وموذن مقرر نہ ہوں''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''(قوله باذان واقامة)۔۔۔ يكرهُ تكرارُ الجماعةِ في مَسْجِدِ مَحَلَّةٍ بأذانٍ واقامةٍ، اِلّا اِذَا صلّٰى بهما فيه أوّلاً غيرُ أهلهِ، أو أهلُهُ لكنْ بمُخَافَتَةِ الأذانِ، ولو كرّر أهلُهُ بدُونِهمَا، أوْكَانَ مَسْجِدَ طريقٍ جَازَ اِجْمَاعًا كَمَا فِيْ مَسْجِدٍ لَيْسَ لَهُ اِمَامٌ وَلَا مُؤَذِّنٌ وَيُصَلِّي النَّاسُ فِيْهِ فوجًا فوجًا، فَاِنَّ الأَفْضَلَ أَنْ يُصَلِّيَ كُلُّ فَرِيْقٍ بِأذَانٍ وَاِقَامَةٍ عَلٰى حِدَةٍ كما في ''أمالي قاضي خان''۔

ترجمہ: ''محلہ کی مسجد میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر جب کہ پہلے غیر مقامی باشندوں نے اذان واقامت کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی ہو یا مقامی باشندوں نے چپکے سے اذان دے کر پڑھی ہو۔ مقامی باشندوں کا اذان واقامت کے بغیر یا شارع عام کی مسجد ہے، تو اجماعاً جماعت کی تکرار جائز ہے جیسا کہ ایسی مسجد جہاں امام ومؤذن مقرر نہیں اور لوگ جوق در جوق اُس میں نماز پڑھتے ہوں، ان کے لیے افضل یہ ہے کہ ہر فریق نئی اذان واقامت سے جماعت کرے، جیسا کہ ''امالی قاضی خان'' میں ہے''۔ (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 3، ص:503، دمشق)

اس سے مراد یہ ہے کہ بعض لوگ یا مسافر کسی مسجد میں ضرورتاً جلد باجماعت اذان و اقامت کے ساتھ نماز پڑھ کر اپنے کام کے لیے نکل جاتے ہیں، اسے مستقل شعار بنانا درست نہیں ہے کیونکہ ایسا عام طور پر انتشار پسند لوگ کرتے ہیں تاکہ لوگ مختلف الخیال ہو جائیں اور یہ مقصد جماعت کے منافی ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْمَسْجِدُ اِذَاكَانَ لَهُ اِمَامٌ مَعْلُومٌ وَجَمَاعَةٌ مَعلُومَةٌ فِيْ مَحَلَّةٍ، فَصَلّٰى اهلُهُ فِيهِ بِالجَمَاعَةِ، لَايُبَاحُ تكرارُهَا فِيهِ بِاذَانٍ ثَانٍ، أمَا اِذَا صَلَّوا بِغَيْرِ اَذَانٍ يُبَاحُ اِجْمَاعًا۔

ترجمہ: ''محلہ کی مسجد میں جہاں امام اور جماعت مقرر ہوں، پس جب مقامی لوگوں نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کر لی تو اب اذانِ ثانی کے ساتھ اُس مسجد میں جماعت کی تکرار جائز نہیں ہے، پس اگر اذانِ ثانی کے بغیر پڑھی تو بالاتفاق جائز ہے''۔۔۔ مزید لکھتے ہیں:

وَفِی ''الْاَصْلِ'' لِلصَّدرِ الشَّھِیدِاَمَّا اِذَاصَلَّوا بِجَمَاعَۃٍ بِغَیرِ اَذَانٍ وَاِقَامَۃٍ فِی نَاحِیَۃِ الْمَسجِدِ لَایُکرَہُ۔

ترجمہ:''صدرالشہید کی ''اصل'' میں ہے کہ اگر اذان واقامت کے بغیر مسجد کے ایک گوشے میں جماعت قائم کی ہو تو کراہت نہیں ہے''۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1ص:83)

شیخ حافظ الدین محمد بن محمد بن شہاب المعروف ابن بزاز کردری حنفی لکھتے ہیں:

عَنِ الثَّانِیْ اِذَالَمْ یَکُنْ عَلَی الْھَیْئَۃِ الْاُوْلٰی لَایُکْرَہُ وَاِلَّا فَیُکْرَہُ وَھُوَ الصَّحِیْحُ وَبِالْعُدُوْلِ عَنِ الْمِحْرَابِ تَخْتَلِفُ الْھَیْئَۃُ۔

ترجمہ:''اور امام ابو یوسف سے منقول ہے کہ جماعت ثانی جب ہیئتِ اولیٰ پر نہ ہو، تو مکروہ نہیں ہے اور اگر ہیئتِ اولیٰ پر ہے تو مکروہ ہے اور یہی صحیح ہے اور محراب سے ہٹ کر پڑھنے سے ہیئت بدل جاتی ہے''۔(فتاویٰ بزازیہ بھامش الہندیہ، جلد 4، ص:56)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''عَنْ أَبِی یُوسُفَ'':أَنَّہُ اِذَالَمْ تَکُنِ الْجَمَاعَۃُ عَلَی الْھَیْئَۃِ الْاُوْلٰی لَاتُکْرَہُ، وَاِلَّاتُکْرَہُ، وَھُوَالصَّحِیْحُ وَبِالْعُدُوْلِ عَنِ الْمِحْرَابِ تَخْتَلِفُ الْھَیْئَۃُ، کَذَافِی ''البَزَّازِیَّۃ''۔

ترجمہ:''امام ابو یوسف کے نزدیک جب جماعت (ثانی)ہیئتِ اولیٰ پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے، اگر ہیئتِ اولیٰ پر ہو تو مکروہ ہے، یہی صحیح ہے اور محراب سے ہٹ کر جماعت کھڑی کرنے سے ہیئت بدل جاتی ہے،''فتاویٰ بزّازیہ''میں اسی طرح ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 3، ص:505، دمشق)

مقاصدِ شرعیہ میں سے ایک سَدِّ ذرائع، دفعِ فساد اور حفظِ امن ہے۔اسی حکمت کے تحت ہمارے فقہائے کرام نے ایک محلے کی مسجد میں جہاں اذان و باجماعت نماز کا باقاعدہ اہتمام موجود ہے اور امام مُقرر ہے، تکرارِ جماعت کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے، کیونکہ ایسا کرنے والے بالعموم انتشار و فساد کی نیت سے کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے اور گروہ بندی کے لیے ایسا کرتے ہیں، یہ خوارج کا شِعار رہا ہے اور اِسی لیے امیر المومنین حضرت علی رضی

اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا: ''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ''یعنی حکم تو اللہ ہی کا چلے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور حق ہے، لیکن خوارج اس کلمۂ حق کو باطل مقصد کے لیے استعمال کررہے ہیں، اس لیے آپ نے ان کے خلاف جہاد کیا اور اُن کی سرکوبی کی۔ آپ کے سوال سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ اِسی فتنہ پرور گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ فقہائے کرام نے باقاعدہ جماعت کی ہیئتِ اولیٰ سے ہٹ کر جو جماعت کی اجازت دی ہے، یہ اس پر محمول ہے کہ کبھی اتفاقاً کچھ لوگوں کی نماز رہ گئی ہو تو وہ جماعت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے پیچھے ہٹ کر باجماعت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ گیٹ پر کھڑے ہو کر لوگوں کو باقاعدہ جماعت میں شریک نہ ہونے کی ترغیب دیں اور خود بھی شریک نہ ہوں، تو یہ فتنہ انگیزی ہے، فساد اور بے امنی کے اسباب پیدا کرنا ہے اور ان کو روکنا ضروری ہے۔ اگر مقامی آبادی کے شُرفاء کے سمجھانے سے باز آجائیں تو فبہا ورنہ انتظامیہ کی مدد لی جائے۔

چنانچہ ایسی ہی صورتِ حال کی بابت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا: ''اگر کسی نمازی کے ذریعہ حفظِ امن میں خلل واقع ہوتا ہو اور شر و فساد کا اندیشہ ہو یا عام نمازیوں کو کسی قسم کی تکلیف اور اذیت پہنچتی ہو تو ایسے شخص کو بغرضِ حفظ امن وانسدادِ شر و فساد جماعت سے روک دینا کیا شرع کے خلاف ہے؟''۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''ہاں! شرعاً حکم ہے کہ ایسے لوگ مسجد سے باز رکھے جائیں، قال اللہ تعالیٰ: ''اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہیں مساجد میں داخل نہیں ہونا چاہیے مگر ڈرتے ہوئے۔ درمختار میں ہے: ''یُمْنَعُ مِنْہُ کُلُّ مُؤْذٍ وَلَوْ بِلِسَانِہٖ (ترجمہ: ''ہر ایذا دینے والے کو مسجد سے روکا جائے گا اگرچہ وہ زبان سے ایذا پہنچائے)۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں زیرِ حدیث فَلَا یَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا (وہ ہرگز ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئیں) پھر ردالمحتار میں ہے: وَالْحِقَ بِالْحَدِیْثِ کُلُّ مَنْ اٰذَی النَّاسَ بِلِسَانِہٖ وَبِہٖ اَفْتٰی ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا وَھُوَ اَصْلٌ فِیْ نَفْیِ کُلِّ مَنْ یَّتَاَذّٰی بِہٖ۔

ترجمہ: ''اس مخالفت کے حکم میں وہ شخص بھی شامل ہے جو زبان سے لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اسی پر فتویٰ دیا اور یہ ہر اس چیز کی نفی میں اصل ہے جس سے لوگوں کو ایذا ہوتی ہے۔ مگر طریقۂ تحفظ کا لحاظ ضروری ہے اگر خود منع کرنے میں اندیشۂ فساد ہو، چارہ جوئی کر کے بند کرادیں''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 16 ،ص:413-412)

اعلیٰ حضرت کی اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مسجد کی انتظامیہ ایسی حکمت اور تدبیر اختیار کرے، جس سے مسجد میں شور وشغب نہ ہو اور فساد نہ ہو، اگر اس سے فتنہ دفع نہ ہو تو قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اِس کا سدِّ باب کریں۔

نمازِ چاشت واشراق کے اوقات

سوال:

نمازِ اشراق اور چاشت کس وقت تک پڑھی جاسکتی ہے؟

(شکیل الرحمٰن، بفرزون کراچی)

جواب:

فرض نمازوں کی ادائیگی سے عہدہ برا ہونے کے بعد بندوں کا نوافل یا اذکار وتسبیحات ودرود میں مشغول رہنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور فرشتے ایسے خوش نصیب بندوں کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، حدیث پاک میں ہے:

(1) ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''الْمَلَائِكَةُ تُصَلِّي عَلَى أَحَدِكُمْ مَا دَامَ فِي مُصَلَّاهُ الَّذِي صَلَّى فِيهِ، مَا لَمْ يُحْدِثْ، تَقُولُ: اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، اللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: تم میں سے جب تک کوئی نمازی فرض نماز پڑھ کر اپنی جگہ پر بیٹھا رہے تو فرشتے اس کے لیے اس وقت تک مغفرت کی دعا کرتے ہیں، جب تک کہ وہ بے وضو نہ ہو جائے، فرشتوں کی دعا کے کلمات یہ ہیں: اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر رحم فرما'' (صحیح البخاری:445)

(2) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

لَا يَزَالُ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاةٍ مَا دَامَ يَنْتَظِرُهَا، وَلَا تَزَالُ الْمَلَائِكَةُ تُصَلِّي عَلَى أَحَدِكُمْ مَا دَامَ فِي الْمَسْجِدِ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، اللَّهُمَّ ارْحَمْهُ، مَا لَمْ يُحْدِثْ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَمَوْتَ: وَمَا الْحَدَثُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ قَالَ: فُسَاءٌ أَوْ ضُرَاطٌ

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تک تم میں سے کوئی شخص (مسجد میں) نماز کے انتظار میں (بیٹھا) رہتا ہے، وہ ایسا ہی ہے جیسے نماز میں مشغول ہے اور تم میں سے کوئی شخص (فرض نماز سے فراغت کے بعد) جب تک مسجد میں بیٹھا رہتا ہے، جب تک کہ وہ بے وضو نہ ہو، فرشتے مسلسل اس کے لیے ان الفاظ میں دعا کرتے رہتے ہیں: ''اے اللہ! اس کی بخشش فرما، اے اللہ! اس پر رحم فرما''، حضرموت سے آئے ہوئے ایک شخص نے عرض کی: اے ابوہریرہ! بے وضو ہونے سے کیا مراد ہے، انہوں نے جواب دیا: آواز سے یا بغیر آواز کے ریح کا خارج ہوجانا''۔

(سنن ترمذی:330)

ان دونوں احادیثِ مبارکہ سے مستفاد یہ ہے کہ مسجد میں آکر کوئی نمازی جتنی دیر باوضو بیٹھ کر جماعت کا انتظار کرتا ہے یا جماعت سے فراغت کے بعد جتنی دیر اپنی نماز کی جگہ پر وضو قائم رکھتے ہوئے بیٹھا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا جماعت سے پہلے اور بعد کا یہ سارا وقت نماز ہی میں محسوب ہوتا ہے، یعنی اُسے اس پورے وقت کے لیے نماز ہی کا اجر ملتا ہے۔

نمازِ اشراق کا اول وقت وہ ہے، جب سورج ایک نیزہ کی مقدار بلند ہوجائے اور طلوعِ آفتاب کے بعد بیس منٹ گزر جائیں اور آخری وقت وہ ہوتا ہے، جب چاشت کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے، اس لیے چاشت کی نماز اس وقت پڑھنی چاہیے، جب سورج خوب گرم اور سفید ہوجاتا ہے۔ چاشت کا وقت نصف النہار شرعی (عرفِ عام میں زوال کا وقت) تک ہے اور بہتر چوتھائی دن کے حصے میں ادا کرنا ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔

(1) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ صَلَّى الْغَدَاةَ فِي

جَمَاعَةٍ، ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللهَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ كَانَتْ لَهُ كَأَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: تَامَّةٍ تَامَّةٍ تَامَّةٍ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص فجر کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد وہیں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتا رہے یہاں تک کہ آفتاب بلند ہوجائے، پھر دو رکعت (اشراق کے نوافل) پڑھے، تو اسے ایک حج اور عمرے کا ثواب ملے گا، حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا کہ پورے حج وعمرے کا ثواب ملے گا''۔ (سُنن ترمذی:586)

(2) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ صَلَّى الضُّحٰى ثِنْتَىْ عَشْرَةَ رَكْعَةً بَنَى اللهُ لَهُ قَصْرًا مِنْ ذَهَبٍ فِي الْجَنَّةِ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے چاشت کی نماز بارہ رکعات پڑھیں، (اس کی جزا کے طور پر) اللہ تعالیٰ اُس کے لیے جنت میں سونے کا محل بنائے گا''۔ (سُنن ترمذی:473)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(وَمِنَ الْمَنْدُوْبَاتِ صَلَاةُ الضُّحٰى) وَاَقَلُّهَا رَكْعَتَانِ وَاَكْثَرُهَا اِثْنَتَا عَشْرَةَ رَكْعَةً وَوَقْتُهَا مِنِ ارْتِفَاعِ الشَّمْسِ اِلٰى زَوَالِهَا۔

ترجمہ: ''نمازِ چاشت کم از کم دو رکعات اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات ہیں اور اس کا وقت سورج بلند ہونے سے زوال (یعنی زوال شروع ہونے سے پہلے) تک ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:112)

یہ امر ذہن میں رہے کہ بعض نفلی عبادات پر جو غیر معمولی اجر کی بشارت دی گئی ہے، اس کو اسلام کے مجموعی نظامِ عبادات سے الگ کر کے نہ سمجھا جائے، جیسے ہمارے ہاں بعض مُقدّس راتوں میں لوگ رات بھر یا رات کا اکثر حصہ نوافل پڑھتے ہوئے گزار دیتے ہیں، اور اسے کبھی قضائے عمری سے تعبیر کرتے ہیں یا لاعلمی کی بنا پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس ایک

رات کی عبادت برسوں کی قضا کی ہوئی فرض نمازوں کا فدیہ یا کفارہ بن جائے گی، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اسی منفی سوچ یا اپروچ کا نتیجہ ہے کہ اس کے بعد لوگ سال بھر یا سال کا اکثر حصہ فرض نمازوں سے بھی غافل رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے غیر معمولی اجر کی بشارتوں کے حق دار وہ لوگ ہیں، جو مُحرّمات سے اجتناب کرتے ہوں، فرائض وواجبات پر پابندی سے عمل پیرا ہوں اور اس پر مُستزاد یہ کہ اِن نوافل کو بھی ادا کرتے ہوں۔ اسی طرح نمازِ چاشت پر حجِ کامل اور عمرۂ کاملہ کا اجر ملنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کا فریضۂ حج ساقط ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ ترجمہ: ''جو نیک کام کرے تو اس کے لیے دس گنا اجر ہے''۔ (انعام:160)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک فرض نماز پڑھے گا تو اسے دس گنا ثواب ملے گا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک فرض نماز پڑھنے سے دس فرائض کی مسئولیت سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اسی طرح حرمِ کعبہ میں ایک نماز پر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملنے سے بھی یہی مراد ہے۔

نمازِ تراویح میں عورت کی امامت کا حکم

سوال:

کیا عورتیں کسی مسجد یا مدرسہ میں جمع ہوکر نمازِ تراویح یا صلوٰۃ التسبیح باجماعت ادا کرسکتی ہیں؟، جب کہ عورتوں کے لیے پردے کا اہتمام کیا گیا ہو۔

(مولانا محمد عبدالرحمٰن جامی، ضلع گوجرانوالہ)

جواب:

علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر تبیان القرآن، جلد: 01، ص:97-393 میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور مذاہبِ اربعہ اُن کے اصل مآخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس بحث کے شروع میں انہوں نے خلاصہ ان کلمات میں بیان فرمایا: ''جماعت کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ عورتوں کی جماعت ہے۔ امام

شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کو نماز پڑھانا اور ان کا باجماعت نماز پڑھنا جائز ہے۔ امام احمد کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کی جماعت مستحب ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ غیر مستحب ہے۔ امام مالک کے نزدیک عورتوں کا عورت کی اقتدا میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لیے امام ہونا مکروہِ تحریمی ہے، ہر چند کہ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لیے امام ہونا جائز ہے لیکن انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ عورتوں کا مردوں کے لیے امام ہونا ناجائز ہے اور مردوں کے لیے عورت کی امامت باطل ہونے پر ائمۂ اربعہ کا اجماع ہے''۔

عورت کی امامت کے بارے میں اصل یہ حدیث ہے:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ خَلَّادٍ الْاَنْصَارِیِّ، عَنْ اُمِّ وَرَقَةَ بِنْتِ نَوْفَلٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمَّا غَزَا بَدْرًا، قَالَتْ: قُلْتُ لَهٗ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! اِئْذَنْ لِیْ فِی الْغَزْوِ مَعَكَ، اُمَرِّضُ مَرْضَاكُمْ، لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِیْ شَهَادَةً، قَالَ: ''قِرِّیْ فِیْ بَيْتِكِ، فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَرْزُقُكِ الشَّهَادَةَ، قَالَ فَكَانَتْ تُسَمَّى الشَّهِيْدَةَ، قَالَ: وَقَدْ قَرَأَتِ الْقُرْآنَ، فَاسْتَاْذَنَتِ النَّبِیَّ ﷺ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْ دَارِهَا مُؤَذِّنًا، فَاَذِنَ لَهَا، قَالَ: وَكَانَتْ دَبَّرَتْ غُلَامًا وَجَارِيَةً، فَقَامَا اِلَيْهَا بِاللَّيْلِ، فَغَمَّاهَا بِقَطِيْفَةٍ لَّهَا حَتّٰى مَاتَتْ، وَذَهَبَا، فَاَصْبَحَ عُمَرُ فَقَامَ فِی النَّاسِ، فَقَالَ: مَنْ عِنْدَهٗ مِنْ هٰذَيْنِ عِلْمٌ اَوْ مَنْ رَاٰهُمَا فَلْيَجِئْ بِهِمَا فَاَمَرَ بِهِمَا فَصُلِبَا فَكَانَا اَوَّلَ مَصْلُوْبٍ بِالْمَدِيْنَةِ۔۔۔ وَفِیْ حَدِيْثٍ اٰخَرَ: قَالَ: وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَزُوْرُهَا فِیْ بَيْتِهَا، وَجَعَلَ لَهَا مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ لَهَا، وَاَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ اَهْلَ دَارِهَا۔ قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ: فَاَنَا رَاَيْتُ مُؤَذِّنَهَا شَيْخًا كَبِيْرًا

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن بن خلاد سے روایت ہے: اُمِّ ورقہ بنت نوفل بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ جب غزوۂ بدر کے لیے تشریف لے جانے لگے، تو میں نے ان سے عرض کی: یارسول اللہ! مجھے اپنے ساتھ جہاد میں جانے کی اجازت عنایت فرمائیں، میں بیماروں کی تیمارداری کروں گی، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمادے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے

گھر میں سکون سے رہو، اللہ عزوجل آپ کو یقیناً شہادت عطا فرمائے گا۔ عبدالرحمٰن بن خلاد کہتے ہیں کہ انہیں لوگ ''شہیدہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔۔۔۔۔عبدالرحمٰن کہتے ہیں: اُمِّ ورقہ بن نوفل نے قرآن پڑھا ہوا تھا، تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ وہ اپنے گھر میں ایک مؤذن رکھ لیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔

عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ اُمِّ ورقہ کا ایک غلام اور ایک باندی تھیں، ان دونوں کو انہوں نے مُدبَّر بنالیا تھا (یعنی یہ کہا کہ میری موت کے بعد تم دونوں آزاد ہو گے)، ایک رات وہ دونوں کھڑے ہوئے اور اُن کی چادر میں اُن کو لپیٹ کر دبوچ لیا، یہاں تک کہ وہ وصال فرما گئیں اور پھر وہ دونوں بھاگ گئے۔ صبح کے وقت جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُن کے قتل کی اطلاع ملی تو انہوں نے لوگوں سے کہا: جس شخص کو ان دونوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو یا جس نے ان دونوں کو دیکھا ہو، وہ انہیں پکڑ کر لے آئے (قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اِس قتل کا اعتراف کرلیا تھا)، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر اُن دونوں کو سولی چڑھادیا گیا اور مدینۂ منورہ میں یہ پہلے دو شخص تھے جنہیں سولی چڑھایا گیا۔

(نوٹ: ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جو ''شہیدہ'' قرار دیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت پوری ہوئی اور انہیں ان کے مُدبَّر غلام اور باندی نے ظلماً قتل کردیا)''۔۔۔۔اگلی حدیث میں عبدالرحمٰن بن خلاد بیان کرتے ہیں: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمِّ ورقہ بن نوفل سے ملنے اُن کے گھر جایا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لیے ایک مؤذن مقرر کردیا تھا اور اُنہیں حکم فرمایا کہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں۔۔ عبدالرحمٰن بن خلاد بیان کرتے ہیں: میں نے دیکھا کہ اُن کا مؤذن ایک بوڑھا شخص تھا، (سنن ابی داؤد: 88-587)''۔ یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری کی ''المستدرک'' اور امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی کی ''سنن کبریٰ'' میں بھی موجود ہے۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

(۱) ترجمہ: ''رائطہ حنفیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نمازوں میں عورتوں کی امامت کی اور اُن کے وسط میں کھڑی ہوئیں''۔

(۲) ترجمہ: ''عطاء بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا اذان دیتی تھیں، اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت کرتی تھیں اور ان کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں''۔

(سنن کبریٰ للبیہقی، جلد:03،ص:131،نشر السنہ، ملتان)

اسی طرح حضرتِ اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی عورتوں کی امامت کی روایت بھی سننِ کبریٰ میں موجود ہے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عورت، عورتوں کی امامت کرے اور اُن کے وسط میں کھڑی ہو۔

اس پر سب کا اجماع ہے کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کرسکتی اور جمعہ کی امامت بھی نہیں کرسکتی۔ ہمارے ائمہ میں سے علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی صاحبِ ''ہدایہ'' نے عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی کہا ہے اور علامہ کمال الدین بن ہمام صاحبِ ''فتح القدیر'' نے لکھا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ مکروہِ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ ہے۔ تاہم اگر کہیں کوئی عورت، عورتوں کی امامت کرے تو وہ آگے نہ کھڑی ہو بلکہ عورتوں کی صف کے درمیان میں کھڑی ہو۔ علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

وَتُکْرَہُ جَمَاعَتُھُنَّ، یَقِفُ الْاِمَامُ وَسَطَھُنَّ، وَلَا تَصْلَحُ اِمَامًا لِلرِّجَالِ۔

ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، عورت امام ہو تو وہ صف کے درمیان کھڑی ہو اور عورت مردوں کی امامت کی اہل نہیں ہے''۔ (الاشباہ والنظائر،ص:316)

علامہ ابن نجیم البحر الرائق میں مزید اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، کیونکہ یہ حرام کے ارتکاب سے خالی نہیں ہے اور وہ ہے عورتوں کے امام کا صف کے درمیان کھڑا ہونا، تو ننگے بدن والوں کی جماعت کی طرح یہ جماعت بھی مکروہ ہوگی، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے۔ یہ کراہتِ تحریمی پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ امام کا صف سے آگے ہونا واجب ہے، اس لیے کہ نبی ﷺ نے اس پر مُواظبت (ہمیشگی) فرمائی، اور

واجب کا ترک کراہتِ تحریمی کا سبب ہے جو گناہ ہے''۔(البحرالرائق،جلد:01،ص:614)

امام ابن ہمام کا عورتوں کے لیے عورت کی امامت کو مکروہِ تنزیہی قرار دینے کا سبب وہ احادیث ہیں، جو اوپر مذکور ہوئیں، جن میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُمِ وَرقہ کو امامت کی اجازت دی اور حضرتِ عائشہ اور حضرتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے عورتوں کی امامت فرمائی۔ امام ابن نجیم اور صاحبِ ہدایہ ودیگر فقہاءِ امت کا عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی قرار دینا فقہی اصول کی بنا پر ہے، جسے ''البحرالرائق'' میں بیان کیا گیا ہے اور شاید ان ائمہ کے نزدیک وہ اجازت اُمِ ورقہ اور بعض صحابیات کے ساتھ خاص ہوگی یا ان کے نزدیک یہ منسوخ ہے۔ ہمارے عہد کے مفتیانِ کرام دینی حکمت اور ضرورت کے تحت موقع کی مناسبت سے کسی ایک موقف پر رائے دے سکتے ہیں۔

طواف اور سعی کے دوران افضل اَذکار

سوال:

بیت اللہ کا طواف یا صفاومروہ کی سعی کرتے وقت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی منقبت، اُن سے استعانت وندا پر مشتمل اشعار پڑھنا جائز ہے، افضل کیا ہے؟

(معین الدین نوری، گلشنِ شمیم کراچی)

جواب:

احادیثِ مبارکہ میں عبادات کا طریقہ اور اُن میں پڑھی جانے والی تسبیحات، اَذکار اور دعائیں مُتعین ومقرر ہیں، یہ اوراد اوران کی تعداد کلید (چابی) کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کی ادائیگی کا اُسی طرح التزام کرنا چاہیے۔ البتہ بعض طویل دعاؤں کے یاد نہ ہونے کے سبب مختصر دعاؤں کا ذکر بھی حدیث میں ملتا ہے۔

عطاء بن ابی رباح بیت اللہ کا طواف کررہے تھے، ابن ہشام نے ان سے رکنِ یمانی کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے کہا: ''مجھ سے ابوہریرہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو شخص بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے رکنِ یمانی کے پاس مندرجہ ذیل

دعا پڑھے، تو اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جو اس دعا پر آمین کہتے ہیں، وہ دعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ العَفْوَ وَالعَافِیَةَ فِی الدُّنیَا وَالاٰخِرَةِ رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَةً وَّفِی الاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ طَافَ بِالبَیْتِ سَبْعًا وَلَایَتَکَلَّمُ اِلَّا بِسُبْحَانَ اللّٰہِ وَالحَمْدُ لِلّٰہِ، وَلَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ، وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ، مُحِیَتْ عَنْہُ عَشْرُ سَیِّئَاتٍ، وَکُتِبَتْ لَہٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ، وَرُفِعَ لَہٗ بِھَا عَشَرَةُ دَرَجَاتٍ، وَمَنْ طَافَ فَتَکَلَّمَ وَھُوَفِی تِلْکَ الحَالِ، خَاضَ فِی الرَّحْمَةِ بِرِجْلَیْہِ، کَخَائِضِ المَاءِ بِرِجْلَیْہِ۔

ترجمہ: ''جو سات پھیرے طواف کرے اور یہ پڑھے: ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالحَمْدُ لِلّٰہِ، وَلَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ، وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' اُس کے دس گناہ مٹا دیے جائیں گے اور دس نیکیاں لکھی جائیں گی اور دس درجے بلند کیے جائیں گے اور جس نے طواف میں یہی کلمات مبارکہ پڑھے، وہ رحمت میں اپنے پیروں سے چل رہا ہے، جیسے کوئی پانی میں چلتا ہے''۔

(سنن ابن ماجہ: 2957)

طواف کے پھیروں میں حجرِ اسود کے سامنے، اِستلام کرتے وقت، ملتزَم کے سامنے، میزابِ رحمت کے پاس، رُکنِ عراقی، رُکنِ شامی، رُکنِ یمانی، مقامِ مُستجاب اور سعی کے پھیروں کے دوران پڑھی جانے والی دعائیں جو اَسلافِ اُمّت سے منقول ہیں، کُتبِ فقہ میں درج ہیں، اُنہیں پڑھنا چاہیے، لیکن اگر یاد نہ ہوں، تو صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''جس کو مخصوص مواقع ومقامات کی مسنون وماثور دعائیں یاد نہ ہوں، تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور وعدے کے مطابق درود پاک پڑھتا رہے، انہوں نے اس حدیث مبارک سے استدلال کیا ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ایسا کرے گا (یعنی فرائض، واجبات اور سُنن کے علاوہ نوافل کے تمام اوقات میں صرف درود پڑھتا رہے گا)

تو اللہ عزوجل تیرے سب کام بنادے گا اور تیرے گناہ معاف فرما دے گا''۔

(بہارِ شریعت، جلد اول، ص:1098)

علامہ امجد علی اعظمی نے دعائیں یاد نہ ہونے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنے کو بہتر وافضل فرمایا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے ہم نے صدر الشریعہ کی عبارت کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

انبیاءِ کرام واولیاءِ عظام سے بالتبع استعانت اور وسیلہ کی اگرچہ شریعت میں اجازت ہے، لیکن طواف وسعی یا شعائر اللہ اور مناسکِ حج کے مراحل پر کسی طرح بھی اہلِ اسلام کے لیے شایانِ شان نہیں ہیں، کیونکہ یہ مقامات عباداتِ الٰہیہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس لیے ایسے اشعار ومنقبت کے کلمات کی جگہ مسنون دعاؤں، تسبیحات واَذکار کا ورد کرتے رہنا چاہیے، جو نبی کریم ﷺ، صحابۂ کرام علیہم اجمعین اور اسلافِ اُمّت سے منقول ہیں اور جن میں یقیناً بہت بڑی روحانی تاثیر بھی ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے انبیاءِ کرام علیہم السلام اور اولیاءِ کرام سے توسُّل اور استعانت پر مفصّل ومدلّل بحث کی ہے اور دلائل سے جائز ثابت کیا ہے، لیکن وہ علامہ عبدالحکیم شرف قادری کے حوالے سے لکھتے ہیں: ہمارے فاضل معاصر علامہ محمد عبدالحکیم شرف لکھتے ہیں: ''البتہ یہ ظاہر ہے کہ جب حقیقی حاجت روا، مشکل کشا اور کارساز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو اَحسن اور اَولیٰ یہی ہے کہ اُسی سے مانگا جائے اور اُسی سے درخواست کی جائے اور انبیاء واولیاء کا وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے، کیونکہ حقیقت، حقیقت ہے اور مجاز، مجاز ہے یا بارگاہِ انبیاء واولیاء سے درخواست کی جائے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں وہ ہماری مشکل آسان فرمادے اور حاجتیں بَر لائے، اس طرح کسی کو غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوگی اور اختلافات کی خلیج بھی زیادہ وسیع نہیں ہوگی''۔

(ندائے یارسول اللہ، ص:12، مطبوعہ: مرکزی مجلس رضا، لاہور)

خلاصہ یہ ہے کہ نداءِ غیر اللہ اعتقادِ مذکور کے ساتھ ہرچند کہ جائز ہے، لیکن اَفضل، اَولیٰ

اور احسن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے، جیسا کہ حدیثِ مذکور کا تقاضا ہے''۔

(شرح صحیح مسلم، جلد 7، ص:8990، مطبوعہ: فرید بک اسٹال، لاہور)

انبیاء علیہم السلام اور اولیاءِ کرام سے استمداد اور استغاثہ کرنا ہر چند کہ جائز ہے، لیکن افضل، احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ ہر حال میں اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے۔ امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: کُنْتُ خَلْفَ النَّبِیِّ ﷺ یَوْمًا فَقَالَ: یَاغُلَامُ اِنِّی اُعَلِّمُکَ کَلِمَاتٍ اِحْفَظِ اللّٰهَ یَحْفَظْکَ اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَکَ اِذَا سَاَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰهَ اِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَّنْفَعُوكَ بِشَیْئٍ لَمْ یَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَیْئٍ قَدْ کَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْكَ بِشَیْئٍ لَمْ یَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَیْئٍ قَدْ کَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیْكَ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ایک سواری پر نبی ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں، تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کو یاد رکھو، تم اُسے (مصیبت کے وقت اپنی مدد کے لیے) موجود پاؤ گے، جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرو اور جب تم مدد مانگو تو اللہ سے مدد مانگو اور جان لو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے کے لیے جمع ہوجائے، تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے (اپنی تقدیرِ مبرم میں) تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ اور اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہوجائیں، تو تمہیں صرف وہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھالیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہوچکے ہیں (یعنی تقدیر کے معاملات اللہ تعالیٰ کے ہاں طے پاچکے ہیں)، (جامع الترمذی، رقم الحدیث: 2516)۔ یہ حدیث مسندِ امام ابویعلیٰ (جلد:3ص: 84-85)، عمل الیوم واللیلۃ (للامام ابن سنی ص: 136) اور تمہید (للامام ابن عبدالبر، ج:4،ص:

111) میں بھی موجود ہے۔

مسجد میں امام کا مصلے پر بیٹھ کر ہنسنا

سوال:

کیا امام کو مصلے پر بیٹھے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسنے کی اجازت ہے اور کیا ایسا شخص امامت کا اہل ہے؟، (محمد شاہد، سرجانی ٹاؤن کراچی)

جواب:

اسلام دینِ فطرت ہے اور انسان کے جبلّی اور فطری تقاضوں کا پاس رکھتا ہے۔ مثبت اور تعمیری فطری جذبات کے اظہار کے مواقع عطا کرتا ہے اور منفی جذبات کی اصلاح کرتا ہے۔ انہی فطری تقاضوں میں فرحت وانبساط اور غیظ وغضب کے مواقع بھی آتے ہیں۔ انسان فطری طور پر مسرت کے موقع پر ہنستا ہے اور یہ جذبات اس کے منہ اور چہرے سے عیاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر کے روندے ڈالنے کے خطرے سے بچنے کے لیے چیونٹیوں کی ملکہ نے اپنی ہم جنس چیونٹیوں سے کہا: ''اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اُن کا لشکر بے خبری میں تمہیں کچل ڈالے، اس کی بات پر وہ (سلیمان) مسکرا کر ہنس دیے، (نمل:19-18)''۔ سلیمان علیہ السلام کا ہنسنا اظہارِ تعجب یا خوشی کے طور پر تھا''۔ (حاشیہ جلالین ص:318)

التعریفات میں لکھا ہے: اَلتَّبَسُّمُ مَالَایَکُوْنُ مَسْمُوْعًا لَهٗ وَلِجِیْرَانِهٖ، وَالضِّحْكُ مَایَكُوْن مَسْمُوْعًا لَهٗ، لَالِجِیْرَانِهٖ، القَهْقَهَةُ: مَایَكُوْنُ مَسْمُوْعًا لَهٗ وَلِجِیْرَانِهٖ

ترجمہ: ''تبسّم (مسکراہٹ) اسے کہتے ہیں کہ نہ اس کی آواز خود سنے اور نہ ہی برابر والا سنے (یعنی بے آواز ہو اور صرف ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو) اور ضحک اسے کہتے ہیں، جس کی آواز خود سنے، برابر والا نہ سنے اور قہقہہ اسے کہتے ہیں، جس کی آواز خود بھی سنے اور برابر والا بھی سنے''۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ بھی اظہارِ مسرت کے موقع پر کبھی تبسم فرماتے، کبھی ضحک

فرماتے اور صرف چند غیر معمولی مواقع پر آپ نے قہقہہ فرمایا، جس کا ذکر احادیثِ مبارکہ میں موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ مسرت کے موقع پر صرف زیرِلب مسکرایا کرتے تھے۔آپ ﷺ کی عام عادتِ مبارکہ تبسّم کی تھی یعنی صرف لبوں پر مسکراہٹ کا آجانا، بعض خاص مواقع پر آپ نے ضِحک فرمایا: ضِحک اسے کہتے ہیں کہ جس میں ہلکی آواز بھی نکلے جو اسی تک محدود ہو اور ایسا ضِحک یا قہقہہ جس میں نواجذ (ڈاڑھ مبارک) نظر آئیں، انتہائی نادر ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ مُسْتَجْمِعًا قَطُّ ضَاحِكًا حَتّٰى أَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ، اِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ۔

ترجمہ: ’’حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو اس طور پر کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کے دہنِ مبارک کا اندرونی حصہ نظر آجائے، آپ ﷺ صرف تبسم فرمایا کرتے تھے، (صحیح بخاری:6092)‘‘۔رسول اللہ ﷺ نے قہقہہ مار کر ہنسنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت جابر بن سمرہ بیان کرتے ہیں: كَانَ لَا يَضْحَكُ اِلَّا تَبَسُّمًا رسول اللہ ﷺ کا ہنسنا صرف تبسّم ہوتا تھا‘‘۔(شمائل ترمذی، ص:232)

عبداللہ بن حارث بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو تبسُّم فرماتے ہوئے نہیں دیکھا۔اس سے معلوم ہوا کہ آپ عام حالات میں اپنے اصحاب کے ساتھ خوشگوار انداز میں پیش آتے اور ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ان کا استقبال فرماتے۔حضرت ابوذر غِفاری بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اس شخص کو خوب جانتا ہوں جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا اور اسے بھی جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جائے گا۔ایک شخص کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ اس پر پیش کرو اور بڑے گناہوں کو چھپایا

جائے گا۔اس سے کہا جائے گا: تم نے فلاں فلاں دن یہ یہ گناہ کیے، وہ اقرار کرے گا اور اپنے بڑے گناہوں کے بارے میں خوف زدہ ہوگا۔ پھر (فرشتوں کو) حکم ہوگا کہ ان گناہوں کے بدلے میں اسے نیکیاں دے دو، پھر (وہ خود غرض بندہ جب رحمتِ باری تعالیٰ کو اس جولانی پر دیکھے گا تو) کہے گا: میرے بہت سے گناہ تو ابھی سامنے آئے ہی نہیں ہیں۔ابوذر بیان کرتے ہیں: (اس موقع پر) میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہنسے یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھ مبارک بھی نظر آئی''۔(شمائلِ ترمذی،ص:235)

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمتِ فراواں اور بندے کی خود غرضی اور طلب کے انداز کو دیکھ کر آپ بے ساختہ ہنسے،ظاہر ہے کہ یہ غیر معمولی خوشی کا موقع تھا۔

عباس بن مرداس اسلمی بیان کرتے ہیں کہ اُن کے والد نے اپنے والد (عباس کے دادا) سے بیان کیا کہ:''نبی ﷺ نے (حجۃ الوداع کے موقع پر) عرفہ کی شام اپنی اُمت کے (گنہگاروں) کے لیے مغفرت کی دعا کی،تو (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے آپ کو) جواب ملا: میں نے حقوق العباد کے سوا انہیں بخش دیا، میں ان سے مظلوم کا حق لے کر اسے دوں گا، آپ ﷺ نے عرض کی: اے پروردگار! اگر تو چاہے تو مظلوم کو جنت دے دے اور ظالم کو بخش دے،لیکن اُس شام یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ مزدلفہ میں صبح کے وقت آپ نے پھر دعا فرمائی،تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی،(راوی بیان کرتے ہیں): رسول اللہ ﷺ نے (یہ بشارت سن کر تبسم فرمایا یا ضحک فرمایا۔تو حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے عرض کی: (یارسول اللہ!) ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں،(گریہ وزاری کے) ایسے مواقع پر ہنسی فرمانا آپ کا طریقہ تو نہیں ہے،تو آپ کی ہنسی کا سبب کیا ہے؟، (جبکہ ہماری تو تمنا ہے کہ اس نورانی چہرے کو) اللہ تعالیٰ ہمیشہ مسکراتا رکھے،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے دشمن ابلیس کو جب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی ہے اور میری اُمت کی مغفرت فرمائی ہے،تو وہ اپنے سر پر مٹی ڈالتا ہوا اور ہائے میں ناکام ہوگیا، ہائے میں تباہ ہوگیا،کہتا ہوا فریاد کررہا ہے،تو اس کی اس بے قراری اور فریاد کو دیکھ کر مجھے ہنسی

آ گئی''۔(سنن ابن ماجہ:3013)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''وَلَاتُكْثِرِ الضَّحِكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحِكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ''۔ترجمہ:''تم زیادہ نہ ہنسا کروکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کردیتا ہے،(سُنن ترمذی:2305)''۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ موقع بے موقع یا بلاسبب ہنسنے کو معمول بنانا پسندیدہ عادت نہیں ہے۔ایک اور روایت میں ہے:
وَالْقَهْقَهَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ وَالتَّبَسُّمُ مِنَ اللّٰهِ۔
ترجمہ:''قہقہہ شیطان کی طرف سے ہے اور تبسم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے،(المعجم الکبیر للطبرانی:203)''۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں اس کا محرک شیطانی جذبہ ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ قہقہے مار کر دوسروں کی تحقیر واہانت میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد میں خاص طور پر انسان کو باادب ہوکر بیٹھنا چاہیے اور اس پر خشیتِ الٰہی کا غلبہ ہونا چاہیے۔مسجد میں غیر ضروری اور دنیوی باتیں کرنا منع ہے،حدیث پاک میں ہے:
جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِيْنَكُمْ وَشِرَاءَكُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُوْمَاتِكُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِكُمْ وَإِقَامَةَ حُدُوْدِكُمْ وَسَلَّ سُيُوْفِكُمْ۔
ترجمہ:''اپنی مسجدوں کو (بےشعور) بچوں،پاگلوں،آپس کے خرید وفروخت کے معاملات، باہمی جھگڑوں،شور شرابے،(مجرموں پر) اللہ کی حدود قائم کرنے اور ایک دوسرے پر تلواریں سونتنے سے بچاؤ''۔(سُنن ابن ماجہ:750)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:مسجد میں ہنسنا قبر میں اندھیرا لاتا ہے''۔(جامع الصغیر:5231)

الغرض مسجد کا تقدُّس واحترام ہر مسلمان پر لازم ہے۔جن اُمور کو عام زندگی میں پسندیدہ نہیں قرار دیا گیا،تو اُن کا مسجد کے اندر کیا جانا بدرجۂ اَولیٰ ممنوع ہے۔محراب ومنبر اور مصلّٰی کا تقدُّس رسول اللہ ﷺ سے نسبت کے سبب زیادہ ادب واحترام کا متقاضی

ہے۔ مسجد میں دنیاوی اور غیر ضروری گفتگو کرنا منع ہے، قرآن فہمی یا دینی مسائل سمجھانے کے لیے بھی مجلس درس منعقد کی جاسکتی ہے، لیکن اس میں بھی اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ لوگوں کی نمازوں میں خلل واقع نہ ہو۔ نماز کے اندر قہقہہ مار کر ہنسنے پر نہ صرف نماز بلکہ وضو ٹوٹنے کا حکم بھی لگایا گیا ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ ضَحِكَ فِی الصَّلٰوةِ قَهْقَهَةً فَلْيُعِدِ الْوُضُوْءَ وَالصَّلٰوةَ۔

''ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے نماز میں قہقہہ لگایا وہ اپنا وضو اور نماز دہرائے''۔(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، ج:4،ص:316)

امام صاحب کو محراب میں قہقہہ مار کر نہیں ہنسنا چاہیے، یہ بے ادبی ہے اور اُنہیں چاہیے کہ اس سے احتراز کریں۔ اس سے کوئی امامت کے لیے نااہل نہیں ہوتا لیکن چونکہ امام دوسروں کے لیے نمونۂ عمل ہوتا ہے اور لوگ دین کے معاملے میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اس لیے انہیں حد درجہ احتیاط کرنی چاہیے، مزید یہ کہ کسی کی غلطی کو مشتہر کرنے سے پہلے اس سے براہِ راست رابطہ کرکے اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

مسجد میں چارپائی ڈال کر سونا

سوال:

کیا معتکف، امام یا مؤذن مسجد کے صحن میں چارپائی ڈال کر سو سکتے ہیں۔

(عبدالمجید چانڈیو، دادو، سندھ)

جواب:

بعض مسائل عُرف کی بنا پر جانے جاتے ہیں اور اِسی اعتبار سے جواز وعدمِ جواز کا حکم دیا جاتا ہے۔ صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا: ''زید حالتِ اعتکاف میں کسی عذر کی وجہ سے مسجد کے اندر چارپائی بچھا کر لیٹتا ہے، یہ فعل ازروئے شرع کیسا ہے؟۔ جواب میں لکھتے ہیں: ''مسجد میں چارپائی پر لیٹنا اور سونا عُرف نے ادب کے خلاف قرار دیا ہے اور ایسے اُمور میں شرعِ مطہّر نے عُرف کا لحاظ کیا ہے اور اس کے نظائر کُتبِ فقہ میں کثیر

ہیں، لہٰذا بلاعذر ایسا نہ کرے اور عذر ہو تو'' اَلضَّرُورَاتُ تُبِیحُ المَحظُورَاتِ'' کی بنا پر اجازت ہے، مگر زید کو چاہیے کہ جن اوقات میں لوگ مسجد کے اندر آتے جاتے ہوں، اُن اوقات میں چار پائی کو علیحدہ کر دے تا کہ تنفیر عوام اور منازعت نہ واقع ہو کہ (یعنی عوام کے لیے نفرت اور جھگڑے کا سبب نہ بنے) اس میں لوگوں کو مبتلا کرنا بہت سخت ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ امجدیہ، اول، ص:256)''۔ یعنی اس کے سبب لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگی اور خواہ مخواہ ایک دوسرے سے الجھیں گے۔ الغرض مسجد کے اندر چار پائی بچھا کر لیٹنے میں شریعت کی رو سے فی نفسہٖ تو عدمِ جواز کا کوئی سبب نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاں عُرف میں یہ ادب کے منافی ہے، اس لیے اس سے اجتناب کرنا اَولیٰ ہے۔

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

ہمیں فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کے جواز یا شرعی حیثیت کے بارے میں جوہر ٹاؤن لاہور سے محمد سرور صاحب کا استفتاء موصول ہوا۔ اپنے سوال میں اُنہوں نے سعودی عرب کے مفتی شیخ عبداللہ بن باز کے فتوے کا حوالہ دیا کہ نبی کریم ﷺ فرض نماز پڑھا کر فوراً اٹھ جایا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے کبھی بھی فرض نماز پڑھا کر مقتدیوں کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا نہیں کی۔ پھر اُنہوں نے اِسی سوال سے متعلق ''حاصلِ کلام'' کے عنوان سے مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب کا فتویٰ بھیجا، جو درجِ ذیل ہے:

زبدۃ الکلمات مع ضمیمہ میں مندرجہ تحقیقات کا حاصل یہ ہے:

(1) نماز کے بعد اجتماعی دعا کا مروجہ طریقہ بالاجماع بدعت قبیحہ شنیعہ ہے۔

(2) دعا بعد الفرائض میں رفع یدین نہیں، اِلَّا اَن یَدعُوَ اَحیَانًا لِحَاجَۃٍ خَاصَّۃٍ۔

(3) امام مالک و امام طرطوشی اور ان دونوں کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر نماز کے بعد فارغ ہوتے ہی فوراً امام کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا لازم ہے۔

(4) عندالاحناف رحمہم اللہ تعالیٰ بھی امام کا فجر وعصر کے سوا نماز کے بعد تین بار استغفار اور دعا اَللّٰھُمَّ اَنتَ السَّلَامُ الخ سے زیادہ دیر بیٹھنا مکروہ ہے، اس دعا میں نہ رفع یدین ہے نہ

اجتماعیت، امام ومقتدی ہر شخص بلا رفع یدین سراً انفراداً یہ مختصر سی دعا مانگ کر سنتوں میں مشغول ہو جائے۔

فجر وعصر کے بعد بیٹھنا اس شرط سے جائز ہے کہ اوراد وادعیہ میں امام اور مقتدیوں کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہے، نماز کے بعد کی دعا میں اجتماعیت بدعت ہے، امام ہو یا مقتدی ہر شخص اپنے طور پر انفراداً سراً بلا رفع یدین دعا مانگے، فرض کے بعد کی دعا میں رفع یدین نہیں، البتہ کبھی کبھار کسی خاص ضرورت سے کوئی دعا مانگنا چاہے تو رفع یدین کر سکتا ہے مگر دوسروں کے سامنے التزام نہ کرے تاکہ کسی کو فرض کے بعد کی دعا میں رفع یدین کے مسنون ہونے کا شبہ نہ ہو۔

(5) نوافل کے بعد انفراداً ہاتھ اُٹھا کر طویل دعا مسنون ہے۔

(6) دعا کے لیے اجتماع بدعت ہے، البتہ کسی دوسرے مقصد کے لیے اجتماع ہو تو اس میں اجتماعی دعا جائز ہے۔

''وَاللّٰهُ الهَادِی اِلٰی سَبِیلِ الرَّشَادِ وَهُوَ العَاصِمُ مِنَ الْمُحْدَثَاتِ فِی الدِّیْنِ وَالبِدَعِ وَالضَّلَالِ، (احسن الفتاویٰ جلد:10 ،باب صفة الصلوٰة ومایتعلق بها)''۔

محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:''اس کے باوجود پاکستان کی اکثر حنفی، سلفی مساجد میں ہر فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کی جاتی ہے، اگر قرآن وسنت میں اس کی کوئی ثقہ دلیل موجود ہے تو اسے پوری تحقیق کے بعد واضح فرمائیں''۔

جواب: سب سے پہلے یہ اَمر ذہن نشین رہے کہ کسی خاص شرعی مسئلے پر کسی کا موقف کیا ہے اور اس کے نزدیک اس مسئلے کی شرعی حیثیت (Status) کیا ہے؟۔ اس کے تعین کے بعد اُسی درجے کی دلیل طلب کی جانی چاہیے۔ آج کل لوگوں نے یہ شِعار بنالیا ہے کہ فرض، واجب، سنّت اور مستحب کے لیے ایک ہی درجے کی دلیل طلب کرتے ہیں، یہ انداز علمی وفقہی نہیں ہے۔

زیرِ بحث مسئلے کے بارے میں پہلے ایک اور شخص ملک کامران کے ایسے ہی سوال کے

جواب میں ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' بنوری ٹاؤن کراچی کے مہتمم مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کا موقف 27 نومبر 2015ء کے روزنامہ جنگ کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں، اس کے بعد نفسِ مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی:

''فرض نمازوں کے بعد کے اوقات حدیث شریف کے مطابق قبولیت کے اوقات ہیں۔ فرائض کے بعد دعا کرنا نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین سے ثابت ہے، اس سلسلے میں کثیر احادیث موجود ہیں۔ محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے معارف السنن میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے اسود العامری کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میرے والد فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی، آپ نے جب سلام پھیرا تو پلٹے اور ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی''، (معارف السنن، 125/3)۔ اسی طرح کنز العمال میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو بندہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے معبود! ۔۔۔ اللہ تعالیٰ اُس کی دعا ضرور قبول فرماتا ہے، اسے خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹاتا، (ایضاً)۔ اس طرح کی روایات فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کے ثبوت واستحباب کے لیے کافی ہیں، البتہ اسے سنتِ مستمرّہ دائمہ کہنا مشکل ہے، اس بنا پر اسے ضروری اور لازم سمجھ کر کرنا اور نہ کرنے والوں پر طعن وتشنیع کرنا دونوں درست نہیں''۔

اگر نہ کرنے والے کرنے والوں پر مطلقاً طعن وتشنیع کریں تو یہ مکروہ ہے یا وہ اِسے حرام سمجھ کر طعن وتشنیع کریں تو وہ مجرم ہیں اور شریعت مطہرہ پر افتراء کرنے والے ہیں، نیز سلام پھیرتے ہی جوتے ہاتھ میں تھام کر مسجد سے نکل جانا کس کی سنت ہے اور اس کی کیا دلیل ہے؟۔

ہمیں جناب ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کے موقف سے اتفاق ہے کہ فرائض کے بعد اجتماعی دعا مُستحب ہے، نہ کہ سنتِ مُستمرّہ۔ نیز اِسے واجب اور لازم سمجھ کر کرنا اور نہ کرنے

والوں پر طعن و تشنیع کرنا درست نہیں ہے۔ ہم اپنے موقف کو تفصیلی دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(1) اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً

ترجمہ: ''دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑا کر اور آہستہ''۔ (سورۃ الاعراف: 55)

(2) ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ

ترجمہ: ''مجھ سے دعا کرو میں (ضرور) قبول کروں گا''۔ (المؤمن: 60)

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''المؤمن: 60 میں ارشاد ہے: ''اور تمہارے رب نے فرمایا: تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول فرماؤں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلت سے جہنم میں داخل ہوں گے''۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد دعا ہے یا اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے، ان کی دلیل یہ حدیث ہے: ''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ''وَقَالَ رَبُّكُم ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ'' کی تفسیر میں فرمایا: ہر عبادت دعا میں منحصر ہے اور آپ نے یہ آیت پڑھی: ''بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلت سے جہنم میں داخل ہوں گے''، (سنن ترمذی: 2969، سنن ابوداؤد: 1479، سنن ابن ماجہ: 3828)''۔ میں کہتا ہوں کہ اگر دعا سے اس کا معروف معنیٰ مراد لیا جائے تو وہ بھی درست ہے اور اس حدیث کے منافی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی اس کی عبادت کرنا ہے''۔ (تبیان القرآن، جلد دہم، ص: 395)

بندے کی دعا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور کسی نہ کسی درجے میں مطلوب ہے، ذیل میں چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: وَاِنَّهُ مَنْ لَمْ يَسْئَلِ اللهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ سے دعا نہیں کرتا اللہ اس پر غضب فرماتا ہے''۔(سنن ترمذی:3373)

(۲)عَنْ سَلْمَانَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِیٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِ مِن عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اِلَيْهِ أَن يَرُدَّهُمَا صِفْرًا۔

ترجمہ:''حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا رب حیادار کریم ہے، جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ ان کو خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے''۔(سنن ابی داؤد:1485، سنن ترمذی:3627)

(۳)عَنْ عَبْدِ اللهِ بنِ عُمَرَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ اَسْرَعَ الدُّعَاءِ اِجَابَةً دَعوَةُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کی عدمِ موجودگی میں اس کے حق میں کی جانے والی دعا (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) بہت جلد قبول ہوتی ہے''۔(سنن ابی داؤد:1532)

(۴)عَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ فِی الدُّعَاءِ لَمْ يَحُطَّهُمَا حَتّٰى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ۔

ترجمہ:''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب دعا میں ہاتھ بلند فرماتے، تو ہاتھوں کو نیچے نہ گراتے یہاں تک کہ چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر لیا کرتے''۔(سنن ترمذی:3386)

(۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: اَلْمَسْأَلَةُ: أَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَ مَنْكِبَيْكَ أَوْ نَحْوَهُمَا، وَالْاِسْتِغْفَارُ: أَنْ تُشِيْرَ بِاِصْبَعٍ وَاحِدَةٍ، وَالْاِبْتِهَالُ: أَنْ تَمُدَّ يَدَيْكَ جَمِيْعًا۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ سوال یعنی دعا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں کے برابر اٹھاؤ اور استغفار کا طریقہ یہ ہے کہ ایک انگلی سے اشارہ کرو اور گڑگڑا کر سوال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ ایک ساتھ

پھیلاؤ''۔(سُنن ابوداؤد:1489)

(٦) عَنْ مَالِكِ بْنِ يَسَارٍ السَّكُوْنِيِّ ثُمَّ الْعَوْفِيِّ، أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِذَا سَأَلْتُمُ اللهَ فَسَلُوْهُ بِبُطُوْنِ أَكُفِّكُمْ، وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا۔

ترجمہ:''حضرت مالک بن یسار سکونی، پھر عوفی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے سوال کرو اور ہتھیلیوں کی پُشت سے سوال نہ کرو (یعنی دعا کے وقت ہاتھ کی ہتھیلی کا رُخ آسمان کی طرف ہونا چاہیے)''۔(سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث:1483)

مَعَارِفُ السُّنَن (مرتبین فضلاء جامعہ خیر المدارس، ادارہ تالیفات اشرفیہ، چوک فوارہ، ملتان) میں ہے:''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ جب دعا کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر ان کی ہتھیلیوں کو چہرے کے مقابل کرتے تھے اور ختم دعا کے بعد دونوں ہاتھوں کو چہرے پر ملنا بھی آدابِ دعا ہے جبکہ نماز کی حالت کے علاوہ ہو، مدارج النبوۃ''۔(جلد دوم، ص:111-110)

اس میں کسی وقت کی قید نہیں لگائی گئی، لہٰذا مسلمان ہر وقت دعا کر سکتا ہے جب کہ کوئی شرعی یا عقلی مانع نہ ہو، حصن حصین میں دعا کی قبولیت کے اوقات بتائے گئے ہیں، ان میں ایک وقت یہ بیان کیا:''بَعْدَ کُلِّ عَمَلٍ صَالِحٍ''یعنی ہر نیک کام کے بعد، اور فرض نماز سے بڑھ کر عملِ صالح اور کیا ہو سکتا ہے۔

عَنْ أَبِيْ امامۃَ قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَيُّ الدُّعَاءِ أَسْمَعُ قَالَ جَوْفُ اللَّيْلِ الْآخِرُ وَدُبُرُ الصَّلَوٰةِ الْمَكْتُوْبَاتِ۔

ترجمہ:''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کس دعا کی شنوائی یا قبولیت (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) سب سے زیادہ ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: رات کے آخری حصہ میں اور فرائض کے بعد''۔

(سنن ترمذی:3499)

نماز اعلیٰ درجے کی نیکی ہے، لہٰذا اس کے بعد دعا کرنا مستحسن ہے۔ الشیخ حسن بن علی شرنبلالی ''نورالایضاح'' میں لکھتے ہیں:

وَيُسْتَحَبُّ لِلإِمَامِ بَعدَ سَلَامِهٖ اَن يَتَحَوَّلَ اِلٰى يَسَارِهٖ لِتَطَوُّعٍ بَعدَ الْفَرْضِ وَاَن يَّسْتَقبِلَ بَعدَهُ النَّاسَ وَيَسْتَغْفِرُونَ اللهَ ثَلَاثاً وَيَقرَؤُنَ آيَةَ الْكُرسِيِّ وَالْمُعوِّذَاتِ وَيُسَبِّحُوْنَ اللهَ ثَلَاثاً وَثَلَاثِينَ وَيحَمِّدُونَهٗ كَذٰلِكَ وَيُكَبِّرُونَهٗ كَذٰلِكَ ثُمَّ يَقُولُونَ لَااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيرٍ، ثُمَّ يَدعُونَ لِاَنفُسِهِمْ وَلِلْمُسلِمِينَ رَافِعِي اَيدِيهِمْ ثُمَّ يَمْسَحُوْنَ بِهَا وُجُوْهَهُمْ فِيْ آخِرِهٖ۔

ترجمہ: ''امام کیلیے مستحب ہے کہ فرض سے سلام پھیرنے کے بعد نوافل کیلیے بائیں جانب مڑ جائے، اس کے بعد لوگوں کی طرف منہ کرے، پھر اللہ سے تین بار استغفار کرے، آیۃ الکرسی، مُعَوِّذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھے اور 33,33 مرتبہ ''سُبحَانَ الله''، ''اَلْحَمْدُ لله'' اور ''اَللهُ اَکْبَرُ'' کا ورد کرے۔ پھر ''لَااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيرٌ'' پڑھ کر اپنے لیے اور دیگر تمام مسلمانوں کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور آخر میں ہاتھ اپنے چہروں پر پھیر لیں''۔

(کتاب الصلوٰۃ، فصل فی الاذکار الواردہ بعد الفرض، ص:79، مکتبہ امام احمد رضا)

صاحب مراقی الفلاح ''اَن يَسْتَقْبِلَ بَعْدَهُ النَّاسَ'' کے تحت لکھتے ہیں: اَیْ بَعدَ التَّطَوُّعِ وَعَقِبَ الْفَرضِ اِنْ لَّمْ يَكُنْ بَعْدَهٗ نَافِلَةٌ

ترجمہ: ''امام کے لیے مستحب ہے کہ نوافل کے بعد اور فرائض کے بعد اگر نوافل نہ ہوں، تو لوگوں کی طرف منہ کرے''۔ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں: ثُمَّ يَخْتِمُونَ بِقَولِهٖ تَعَالٰى: ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ'' ترجمہ: ''پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ'' پر دعا کو ختم کریں، (کتاب الصلاۃ، فصل صفۃ الاذکار، ص: 171)''۔ اس میں فجر اور عصر کے بعد اجتماعی طور پر اوراد وتسبیحات پڑھنے کا استحباب بیان کیا گیا ہے۔

دعاعبادت کی روح ہے،عبادت کا مغز اور نچوڑ ہے۔نماز کے بعد دعائیں،تسبیحات واوراد اور بعض سورتوں کا پڑھنا احادیث سے ثابت ہے۔ اجتماعی دعا کا نہ ثبوت ہے نہ ہی ممانعت،تو پھر اپنی اصل کے اعتبار سے دعا انفرادی بھی کی جاسکتی ہے اور اجتماعی بھی، کیونکہ دعا کو اصلِ عبادت اور جوہرِ عبادت قرار دیا گیا ہے اور ایک حدیث مبارک میں دعا کو عین عبادت قرار دیا گیا ہے (اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ،سنن ترمذی، رقم الحدیث : 2969)۔ اور اس کی بہت زیادہ ترغیب دی گئی ہے، پھر نمازِ جمعہ کا خطبہ جو واجب ہے اور عیدین کا خطبہ جو سنت ہے،ان میں بھی اجتماعی دعا ثابت ہے۔نمازِ تراویح کی جماعت تو عہدِ رسالت مآب ﷺ اور عہدِ صدیقی کے بعد رائج ہوئی ،اس میں حرمین طیبین کے ائمہ ختمِ قرآن کے موقع پر گڑگڑا کر نماز کے اندر دعا کرتے ہیں، یہ بھی تو رسول ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ثابت نہیں ہے، لیکن اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر بہر صورت مستحسن و مستحب عمل ہے۔سو آپ سنتِ رسول ﷺ سے ثبوت کے بغیر نیک نیتی سے ایک عمل کریں تو درست اور دوسرا کرے تو بدعتِ قبیحہ،کسی نے سچ کہا ہے:

تمہاری زُلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز لکھتے ہیں کہ:'' حدیث میں ہے حضور پُرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: اِنَّ لِرَبِّكُمْ فِي اَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ،فَتَعَرَّضُوا لَهٗ لَعَلَّهٗ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ نَفحةٌ مِنْهَا فَلَا تَشْقُونَ بَعدَها اَبَدًا، رَوَاهُ الطَّبَرَانِي فِي الْكَبِيْرِعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ۔

ترجمہ:''بیشک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے ایام زندگی میں کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں،جن میں رحمتِ باری تعالیٰ کے جھونکے آتے ہیں تو انہیں پانے کی تدبیر کرو،شاید ان میں سے کوئی مبارک لمحہ تمہیں نصیب ہوجائے تو پھر کبھی بدبختی تمہارے پاس نہ آئے،اسے طبرانی نے کبیر میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ اور خود حدیث نے اُن

اوقات میں سے ایک وقت ''اجتماعِ مسلمین'' کا بتایا کہ ایک گروہِ مسلمان جمع ہوکر دعا مانگے، کچھ عرض کریں، کچھ آمین کہیں، کتاب المستدرک علی البخاری ومسلم میں ہے:

عَنْ حَبِيبِ بْنِ مَسْلَمَةَ الْفِهْرِيِّ، وَكَانَ مُجَابَ الدَّعْوَةِ. أَنَّهُ أُمِّرَ عَلَى جَيْشٍ، فَدَرِبَ الدُّرُوبَ، فَلَمَّا أَتَى الْعَدُوَّ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَا يَجْتَمِعُ مَلَأٌ فَيَدْعُو بَعْضُهُمْ، وَيُؤَمِّنُ الْبَعْضُ، إِلَّا أَجَابَهُمُ اللهُ ثُمَّ إِنَّهُ حَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: اللّٰهُمَّ احْقِنْ دِمَاءَنَا، وَاجْعَلْ أُجُورَنَا أُجُورَ الشُّهَدَاءِ فَبَيْنَمَا هُمْ عَلَى ذَلِكَ إِذْ نَزَلَ الْهُنْبَاطُ أَمِيرُ الْعَدُوِّ، فَدَخَلَ عَلَى حَبِيبٍ سُرَادِقَهُ۔

ترجمہ: ''حبیب بن مَسلمہ فِہری مستجاب الدعوات تھے، اُن سے روایت ہے کہ انہیں ایک لشکر پر امیر بنایا گیا، وہ دشمن کی سرزمین میں داخل ہوئے اور دشمن تک پہنچ گئے، (اس مرحلے پر) انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جب کوئی جماعت (مومنین) جمع ہوتی ہے اور اُن میں سے کوئی دعا کرتا ہے اور دوسرے آمین کہتے ہیں، تو اللہ اُن کی دعا کو قبول فرماتا ہے، پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور دعا کی: ''اے اللہ! ہماری جانوں کی حفاظت فرما اور ہمیں شہدا کی طرح اجر عطا فرما، اسی اثنا میں دشمن کا سردار ہنباط حضرت حبیب کے ہاں آیا اور آپ کے خیمہ میں داخل ہوگیا''۔

(المستدرک علی الصحیحین:5478)

علماء نے مجمعِ مسلمین کو اوقاتِ قبولیتِ دعا میں شمار کیا ہے۔ حصن حصین میں ہے: وَاجْتِمَاعُ الْمُسْلِمِين یعنی مسلمانوں کے اجتماع کا اوقاتِ اجابت سے ہونا حدیثِ صحاحِ ستہ سے مستفاد ہے، علامہ علی القاری شرح میں فرماتے ہیں: ثُمَّ كُلُّ مَا يَكُونُ الِاجْتِمَاعُ فِيهِ أَكْثَرَ كَالْجُمُعَةِ وَالْعِيدَيْنِ وَعَرَفَةَ يُتَوَقَّعُ فِيهِ رَجَاءُ الْإِجَابَةِ أَظْهَرُ۔ یعنی جس قدر مجمع کثیر ہوگا جیسے جمعہ وعیدین وعرفات میں، اسی قدر قبولیت دعا کی امید بہت زیادہ ہوگی''۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص:522,523 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر، بہرصورت مستحسن ومستحب عمل ہے، حرمین

طیبین میں بھی ختمِ قرآن کے موقع پر نمازِ تراویح میں اور خطباتِ مبارکہ میں اجتماعی دعا کی جاتی ہے، تو جب یہ اجتماعی دعا نماز کے اندر جائز ہے، تو نماز سے باہر اس کی ممانعت کیوں ہوگی۔ جو اجتماعی دعا کی ممانعت کا دعویٰ کرتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے، اب تو تبلیغی اجتماع میں بھی اجتماعی دعا کی جاتی ہے اور لوگ بڑے اہتمام سے اس میں شرکت کے لیے جاتے ہیں، تو ایک خاص موقع اور مقام پر اس کے جواز اور باقی مواقع اور مقامات پر اس کی ممانعت کی کیا دلیل ہے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص خود شارع بننے کی کوشش کرے اور ''مَنَّاعٍ لِلْخَیْر'' (خیر کے کاموں سے بہت زیادہ روکنے والا) بننا چاہتا ہو۔ الغرض قبولیتِ دعا کا جو عمومی قرینہ نماز کے بعد اور اجتماعِ کثیر کے مواقع پر بتایا گیا ہے، فرض نمازوں کے بعد اس کی ممانعت کہیں نہیں فرمائی گئی ہے۔ ہم اسے درجۂ استحباب میں قرار دیتے ہیں، واجب یا سنّتِ مؤکدہ کا درجہ نہیں دیتے۔ اگر ہر مستحب و پسندیدہ کام کا معیار یہ بنایا جائے کہ قرآن وسنّت میں اس کا ذکر ہو تو پھر بہت سے پسندیدہ، معمول بہا اور متفق علیہ اُمور کو بھی ترک کرنا پڑے گا۔ مثلاً نمازِ تراویح کی جماعت، قرآن مجید کو صحیفے کی شکل میں مدوّن کرنا، پھر باقی قراءت کو ترک کر کے لُغتِ قریش کو باقی رکھنا۔ بعد میں حجاج بن یوسف کے عہد میں قرآن کریم کی حرکات وسکنات واعراب لگانا، آیات کی علامت کا اندراج، سورتوں کے ناموں کا اندراج اسے قارئین کی سہولت کے لیے اجزاء میں تقسیم کرنا، رکوعات کی تقسیم وغیرہ۔ الغرض بے شمار ایسے اُمور ہیں، جنہیں اُمّت مستحسن سمجھ کر کر رہی ہے، لیکن عہدِ رسالت مآب ﷺ میں یہ اُمور اس ہیئت پر نہیں تھے۔

نمازِ تراویح میں فاسد نماز کی قراءت کا اعادہ

سوال:

نمازِ تراویح میں امام غلطی سے تین رکعات ادا کرلے اور پھر اُن کا اعادہ کرے، لیکن جو قرآن ان تین رکعتوں میں پڑھا، اُس کو نہ پڑھے بلکہ آگے سے پڑھے تو کیا نمازِ تراویح درست ہوگی؟۔ نیز گزشتہ سال ایسا ہوا، نمازیوں نے امام صاحب سے مطالبہ کیا کہ تراویح

دہرائیں اور سابق رکعات میں جو آیات پڑھیں اُنہیں بھی دہرائیں، تو اُنہوں نے ایسا نہیں کیا، کیا ایسے امام کے پیچھے تراویح جائز ہے؟ (المصطفیٰ مسجد، KBR بفرزون کراچی)

جواب:

فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق نمازِ تراویح میں تین رکعات پڑھیں، اگر دوسری رکعت میں قعدہ نہیں کیا تھا تو اِن دو رکعات کا اعادہ کرے، یعنی دو رکعات دوبارہ پڑھے اور ان تین رکعات میں جتنی آیات تلاوت کیں، اُن کو بھی دوبارہ پڑھے۔ اگر دو رکعات پر قعدہ کیا تھا، تو رکعات دہرانے کی ضرورت نہیں البتہ تیسری رکعت میں جو آیات تلاوت کی تھیں، اگلی رکعت میں اُن کو دوبارہ پڑھے۔ تاہم قراءت کا اعادہ نہ کرنا نماز کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگا، البتہ تراویح میں تکمیلِ قرآن میں اُن آیات کی کمی رہ جائے گی، لیکن اس پر امام کو ملامت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ بعض فقہاء نے قراءت کے دُہرانے کو لازمی قرار نہیں دیا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَاِذَا غَلَطَ فِي الْقِرَاءَةِ فِي التَّرَاوِيحِ فَتَرَكَ سُورَةً أَوْ آيَةً وَقَرَأَ مَا بَعْدَهَا فَالْمُسْتَحَب لَهُ أَن يَقْرَاءَ الْمَتْرُوكَةَ ثُمَّ الْمَقْرُوأَةَ لِيَكُونَ عَلَى التَّرْتِيبِ كَذَا فِي فَتَاوَى ''قَاضِي خَان''۔ وَإِذَا فَسَدَ الشُّفْعُ وَقَدْ قَرَأَ فِيْه لَايُعْتَدُّ بِمَا قَرَأَ فِيهِ وَيُعِيْدُ الْقِرَاءَةَ لِيَحْصِلَ لَهُ الْخَتْمُ فِي الصَّلَاةِ الْجَائِزَةِ وَقَالَ بَعْضُهُم يَعْتَدُّ بِهَا كَذَا فِي ''الْجَوهَرَةِ النَّيِّرَةِ''۔

ترجمہ: ''اور جب نمازِ تراویح میں قراءت میں غلطی ہوئی اور کوئی سورت یا آیت چھوڑ دی اور اُس کے بعد کی آیات تلاوت کیں، تو مستحب یہ ہے کہ پہلے چھوڑی ہوئی آیات پڑھے، پھر پڑھی ہوئی آیات (دوبارہ) پڑھے تاکہ ترتیب صحیح ہوجائے، جیسا کہ ''فتاویٰ قاضی خان'' میں ہے۔ جب دو رکعت تراویح فاسد ہوجائے اور اس میں (کچھ حصہ) تلاوت کرچکا تھا، تو اس فاسد نماز میں پڑھی ہوئی تلاوت کا شمار نہیں کیا جائے گا اور قراءت کا اعادہ کرے گا تاکہ جائز نماز میں ختم قرآن کی برکت حاصل ہو اور بعض فقہاء نے کہا: فاسد نماز میں پڑھی

ہوئی قراءت کا شمار کیا جائے گا، ''اَلْجَوھَرَۃُ النَّیِّرَہ'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:118)

نماز میں سُترے کی ہیئت

سوال:

نمازی کے آگے سترہ کی مقدار کتنی ہونی چاہیے؟۔اکثر مساجد میں سترہ اس طرح بنا ہوتا ہے کہ اس کے دونوں کنارے، پائے زمین پر ہوتے ہیں اور دونوں کناروں کے ملانے کے لیے درمیان میں لکڑی یا لوہا وغیرہ لگا ہوتا ہے، جس کا زمین سے فاصلہ ایک فٹ ہوتا ہے، کیا یہ سترہ بن سکتا ہے؟۔(قاری محمد احسان قادری، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے: عَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ سُئِلَ فِی غَزْوَۃِ تَبُوْكَ عَنْ سُتْرَۃِ الْمُصَلِّیْ، فَقَالَ: كَمُؤْخِرَۃِ الرَّحْلِ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے سُترہ (Cover) کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: پالان کی پچھلی لکڑی کے برابر ہو''۔(صحیح مسلم:500)

سُترہ کی لمبائی ایک ہاتھ اور موٹائی ایک انگلی کے برابر ہونی چاہیے، زیادہ سے زیادہ لمبائی تین ہاتھ ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(سُتْرَۃً بِقَدْرِ ذِرَاعٍ) طُوْلاً (وَغِلَظِ اِصْبَعٍ) لِتَبْدُوَ لِلنَّاظِرِ (بِقُرْبِهٖ) دُوْنَ ثَلَاثَۃِ أَذْرُعٍ

ترجمہ:''سُترہ کی مقدار ایک ہاتھ لمبا اور موٹائی ایک انگلی کے برابر ہونی چاہیے تاکہ دیکھنے والے پر ظاہر ہو، زیادہ سے زیادہ لمبائی تین ہاتھ ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص:126-125، دمشق)

سُترہ کا نصب کرنا لازم نہیں ہے، مُعلّق شے بھی بطور سُترہ استعمال ہوسکتی ہے، جیسا کہ تنویر الابصار مع الدر المختار میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَصُورَتہُ:أَن تَکُونَ السَّتَارَۃُ مِنْ ثَوبٍ أَوْنَحوِہٖ مُعَلَّقَۃً فِی سَقْفٍ مَثلاً ثُمَّ یُصَلِّیَ قَرِیْبًا مِنْہُ، فَاِذَا سَجَدَ تَقَعُ عَلٰی ظَھْرِہٖ وَیَکُوْنُ سُجُودُہٗ خَارِجاًعَنْھَا۔ وَاِذَاقَامَ أَوْقَعَدَ سَبَلَتْ عَلَی الْاَرْضِ وَسُتْرَتِہٖ۔

ترجمہ:''اس کی صورت یہ ہے: کپڑے کا پردہ یا اُس کے جیسی کوئی شے چھت سے مُعَلّق (لٹکی ہوئی) ہے، پھراس کے قریب کوئی نماز پڑھ رہا ہو، پس جب سجدہ کرے تو پردہ اُس کی پشت پر ہوگا اور سجدہ اُس (پردے) کے خارج میں۔ اور جب نمازی قیام یا قعدہ کرے گا تو پردہ زمین پر لٹک رہا ہوگا اور سترہ ہوگا''۔ (جلد 2،ص:345،بیروت)

نماز میں قصر کا حکم

سوال:

میرا تعلق مظفر آباد، آزاد کشمیر کے ایک گاؤں سے ہے جو کہ شہر سے تقریباً 44 کلومیٹر ہے۔ جبکہ مظفر آباد شہر میں بھی کرائے کے گھر میں تقریباً 15 سال سے رہائش پذیر ہوں۔ میں عرصہ پانچ سال سے بسلسلہ ملازمت اسلام آباد میں مقیم ہوں جو کہ 145 کلومیٹر ہے، جبکہ میں ہر دو ہفتوں کے بعد مظفر آباد شہر میں گھر واپس جاتا ہوں جمعہ کو اور اتوار کو یا سوموار کی صبح واپس اسلام آباد آجاتا ہوں۔ جبکہ کبھی کبھی اتوار یا سوموار کو واپس اسلام آباد آنے کے بعد جمعے کو ہی واپس مظفر آباد جاتا ہوں جو کہ تقریبا 4,5 دن بنتے ہیں جبکہ اگر ایک جمعے کو چھوڑ کر اگلے جمعے کو جاؤں تو اس صورت میں تقریبا 10 دن بنتے ہیں۔ مفتی صاحب رہنمائی فرمائیں کہ آیا میں نماز قصر کروں گا یا نہیں، جبکہ میں قصر نہیں کر رہا۔ میرا ایک دوست، جو زیادہ تر سوموار کو آنے کے بعد جمعے کو واپس گھر چلا جاتا ہے، قصر کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان ملازمت کے سلسلے میں گھر سے کتنے کلومیٹر کے فاصلے پر ہو تو مسافر کہلاتا ہے اور نماز میں قصر کر سکتا ہے، (منہاس خان فرید محمد، مظفر آباد)۔

جواب:

فقہاء کرام کے اقوال میں سے مفتیٰ بہٖ قول اٹھارہ فرسخ ہے اور اٹھارہ فرسخ چوَن میل

شرعی ہیں، اور یہ فاصلہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ثُمَّ اخْتَلَفُوا فَقِيلَ أَحَدٌ وَعِشْرُونَ، وَقِيلَ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ، وَقِيلَ خَمْسَةَ عَشَرَ، وَالْفَتْوىٰ عَلَى الثَّانِي لِأَنَّهُ الْأَوْسَطُ۔

ترجمہ: ''بعض فقہاء نے اکیس فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اٹھارہ فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دیا ہے اور مفتیٰ بہ اٹھارہ فرسخ کا قول ہے، کیونکہ یہ متوسط قول ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار ج:2، ص:526، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)''۔ لہٰذا مفتیٰ بہ قول کے مطابق تقریباً اٹھانوے (98) کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی سفر شرعی اور قصر کے احکام لاگو ہوں گے۔

جب آپ وطنِ اصلی میں ہوں، تو پوری نماز ادا کریں گے، لیکن جب کسی مقام پر 15 دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو، تو وہاں نماز قصر پڑھیں گے، جب تک بندہ کسی مقام پر 15 دن یا اُس سے زائد عرصے کے لیے قیام کی نیت نہ کرے، تو وہ شرعاً مسافر ہی کہلائے گا، نماز میں قصر کرے گا۔

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے: (أَوْ يَنْوِي) وَلَوْ فِي الصَّلَاةِ إِذَا لَمْ يَخْرُجْ وَقْتُهَا وَلَمْ يَكُ لَاحِقًا (إِقَامَةَ نِصْفِ شَهْرٍ) حَقِيقَةً أَوْ حُكْمًا لِمَا فِي ''الْبَزَّازِيَّةِ'' وَغَيْرِهَا. (بِمَوْضِعٍ صَالِحٍ لَهَا) مِنْ مِصْرٍ أَوْ قَرْيَةٍ أَوْ صَحْرَاءِ دَارِنَا وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْأَخْبِيَةِ (فَيَقْصُرُ إِنْ نَوَى) الْإِقَامَةَ (فِي أَقَلَّ مِنْهُ) أَيْ فِي نِصْفِ شَهْرٍ۔

ترجمہ: ''(یا وہ نصف ماہ اقامت کی نیت کرے) اگرچہ اقامت کی نیت نماز کے اندر کرے بشرطیکہ نماز کا وقت نہ نکلا ہو اور مسافر لاحق نہ ہو، پھر اقامت کی نیت حقیقت میں ہو یا حکماً دونوں معتبر ہیں جیسے کہ ''بزازیہ'' وغیرہ میں اس کی مثال موجود ہے، (اقامت کی نیت کسی ایسی جگہ کرے جو اقامت کی صلاحیت رکھتی ہو) شہر ہو یا گاؤں ہو یا ہمارے ملک کا صحرا ہو اور نیت کرنے والا خانہ بدوش ہو، (پس نماز میں قصر کریں گے، اگر پندرہ دن سے کم اقامت کی نیت کی ہو)''۔ (جلد 2، ص: 528، 529، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

پس اسلام آباد، مظفر آباد سے مسافتِ سفر وہاں ٹھہرنے پر ہے اور پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ ہو تو آپ نماز قصر پڑھیں گے اور بہتر یہ ہے کہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھیں، اس صورت میں امام کی مُتابعت میں آپ پوری نماز پڑھیں گے۔

نماز میں آستین فولڈ کرنا

سوال:

کیا جرسی فولڈ کر کے نماز پڑھنا درست ہے؟، (فرحان انجم)۔

جواب:

نماز میں کپڑا سمیٹنے یا موڑنے سے منع فرمایا گیا ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ قَالَ: أُمِرَ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَسْجُدَ عَلٰى سَبعَةٍ، وَنَهٰى أَنْ يَكُفَّ شَعْرَهُ وَثِيَابَهُ قَالَ أَبُوالرَّبِيْعِ: عَلَى سَبْعَةِ أَعْظُمٍ، وَنُهِيَ أَنْ يَكُفَّ شَعْرَهُ وَثِيَابَهُ، اَلْكَفَّيْنِ وَالرُّكْبَتَيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ وَالْجَبْهَةِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کو سات (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا اور نماز کی حالت میں بال سمیٹنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا ہے، ابوالربیع کی روایت میں سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے اور بالوں کو سنوارنے اور کپڑوں کو سمیٹنے کی ممانعت کا ذکر ہے، وہ سات ہڈیاں یہ ہیں، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے، دونوں قدم اور پیشانی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1095)''۔ اس حدیث میں ''کفِ ثوب'' سے ممانعت کا حکم ہے۔ ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون یا شلوار یا پاجامے کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے اوپر موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں، اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں، اس پر بھی ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث مبارک اور دیگر احادیث کی رو سے ممنوع ہے۔

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: (وَ) كُرِهَ (كَفُّهُ) أَيْ رَفْعُهُ وَلَوْ لِتُرَابٍ كَمُشَمِّرِ كُمٍّ أَوْ

ذَيْلٍ (وَعَبَثُهُ بِهِ) أَيْ بِثَوْبِهِ

ترجمہ: ''اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لیے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا۔'' اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أَيْ كَمَا لَوْ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ وَهُوَ مُشَمِّرٌ كُمَّهُ أَوْ ذَيْلَهُ، وَأَشَارَ بِذٰلِكَ إِلَى أَنَّ الْكَرَاهَةَ (لَا تَخْتَصُّ بِالْكَفِّ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ، كَمَا أَفَادَهُ فِي ''شَرْحِ الْمُنْيَةِ''، لٰكِنْ قَالَ فِي ''الْقُنْيَةِ'': وَاخْتُلِفَ فِيمَنْ صَلَّى وَقَدْ شَمَّرَ كُمَّيْهِ لِعَمَلٍ كَانَ يَعْمَلُهُ قَبْلَ الصَّلَاةِ أَوْ هَيْئَتُهُ ذٰلِكَ) وَمِنْهُ مَا لَوْ شَمَّرَ لِلْوُضُوءِ، ثُمَّ عَجَّلَ لِإِدْرَاكِ الرَّكْعَةِ مَعَ الْإِمَامِ، وَإِذَا دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ كَذٰلِكَ وَقُلْنَا بِالْكَرَاهَةِ فَهَلِ الْأَفْضَلُ إِرْخَاءُ كُمَّيْهِ فِيهَا بِعَمَلٍ قَلِيلٍ أَوْ تَرْكُهُمَا؟ لَمْ أَرَهُ: وَالْأَظْهَرُ الْأَوَّلُ بِدَلِيلِ قَوْلِهِ الْآتِي: وَلَوْ سَقَطَتْ قَلَنْسُوتُهُ فَإِعَادَتُهَا أَفْضَلُ تَأَمَّلْ۔

ترجمہ: ''یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا، اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے، جیسا کہ ''شرح المنیہ'' سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن ''القنیہ'' میں کہا ہے کہ: ''اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسی ہے۔'' اور انہی میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس نے وضو کے لیے آستین چڑھائیں، پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کی اور جب نماز میں داخل ہوگیا، تو وہ اسی حالت میں (یعنی آستین چڑھائے ہوئے تھا) تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے، میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا، لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)، اس کی دلیل علامہ حصکفی کے اس قول سے ملتی ہے کہ: ''اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو

اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے، غور کیجیے''۔ آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ:

وَقَيَّدَ الْكَرَاهَةَ فِي ''الْخُلَاصَةِ'' وَ''الْمُنْيَةِ'' بِأَنْ يَكُوْنَ رَافِعًا كُمَّيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ، وَظَاهِرُهُ أَنَّه لَا يُكْرَهُ إِلَى مَا دُوْنِهِمَا، قَالَ فِي ''الْبَحْرِ'': وَالظَّاهِرُ الْإِطْلَاقُ لِصِدْقِ كَفِّ الثَّوْبِ عَلَى الْكُلِّ۔

ترجمہ: ''خلاصہ'' اور ''منیہ'' میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن ''البحر الرائق'' میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے، کیونکہ ''کفِ ثوب'' تمام صورتوں پر صادق آتا ہے''۔ (جلد 4، ص:8-137، دمشق)

آپ نے جو جرسی کی بابت دریافت کیا ہے، اس میں واضح نہیں ہے کہ آپ کی مراد آستینوں کا فولڈ کرنا ہے یا نیچے سے؟، نیچے سے ایک دو پرت فولڈ کرنا آج کل خلافِ وضع نہیں ہے، لہٰذا اس پر کراہت کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اسی طرح اگر جرسی کی آستینیں لمبی ہیں اور ایک دو پرت فولڈ کر کے اسے مناسب حالت پر لایا جاتا ہے، تو اس میں بھی کراہت کا حکم نہیں لگایا جائے گا، البتہ نماز کے اندر اگر اس کے لیے عملِ کثیر کرنا پڑے، تو پھر منع ہے۔ اسی طرح اگر آدھی آستین کی جرسی ہے، تو چونکہ یہ وضع کے مطابق ہے، اس لیے اسے پہن کر نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں ہے، اسی طرح آدھی آستین کی قمیص پہن کر نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے، اگرچہ یہ ناپسندیدہ بات ہے، کیونکہ اس کی وضع یہی ہے اور مرد کے لیے بازو کا کہنیوں تک ڈھانپنا نماز میں فرض، واجب یا سنّت نہیں ہے۔

مسجد اور وقف کے مسائل

مسجد میں کُنڈا لگا کر بجلی لینے کا حکم

سوال:

سرجانی ٹاؤن میں بجلی کے میٹر فراہم نہیں کیے گئے ہیں، جس کی بنا پر کنڈے کے ذریعے بجلی حاصل کی جاتی ہے۔ ہماری مسجد فیضانِ جمالِ مصطفیٰ میں بھی بجلی کا حصول اسی ذریعے سے کیا گیا ہے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ چوری کی بجلی ہے، لوگوں کی نماز ادا نہیں ہو رہی۔ برائے مہربانی اِس مسئلے کا حل ارشاد فرمادیں۔

(محمد انس قادری، فیضانِ جمالِ مصطفیٰ مسجد، سرجانی ٹاؤن)

جواب:

آپ کے بیان کے مطابق آپ کے علاقے میں بجلی کی ترسیل کے لیے K-Electirc کی جانب سے میٹر فراہم نہیں کیے گئے، کُنڈے کے ذریعے بجلی کا استعمال ہو رہا ہے، آپ اُس کا جائز طریقہ یہ اختیار کر سکتے ہیں کہ K-Electirc سے عارضی کنکشن حاصل کریں، جس کا ماہانہ بل ادا کیا جائے، اُس کا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ رکھیں اور اُس ادا شدہ بل کی کاپی مسجد میں آویزاں کر دیا کریں تاکہ کسی کے لیے اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ بجلی کے میٹر کو مصنوعی طریقے سے ٹمپر کر کے یا اُس کی رفتار کم کر کے یا کُنڈا لگا کر جو بجلی استعمال کی جاتی ہے اور اس کے واجبات کی ادائیگی نہیں کی جاتی، یہ خیانت اور غبن ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اجر کی توقع رکھنا ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۲۶۷

ترجمہ: ''اور (اللہ کی راہ میں) ایسی ناکارہ اور ناقابلِ استعمال چیز دینے کا قصد نہ کرو، جس کو تم خود بھی آنکھیں بند کیے بغیر لینے والے نہیں ہو اور یقین رکھو کہ اللہ بہت بے نیاز نہایت تعریف کیا ہوا ہے''۔ (بقرہ: 267)

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''أَیُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا وَإِنَّ اللّٰهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ. فَقَالَ: {يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۖ إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ} وَقَالَ: {يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ} ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ. أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ. يَا رَبِّ! يَا رَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ. وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ. وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ. فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' اے لوگو! بیشک اللہ پاک ہے اور صرف پاک (صدقات کو) قبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم رسولوں کو دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسولو!: پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو بیشک تم جو بھی عمل کرتے ہو، مجھے اس کا بخوبی علم ہے، (المؤمنون: 51)'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: '' اے مومنو! ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ''، پھر آپ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ غبار آلود ہے، بال پراگندہ ہیں، طویل سفر کر کے آیا ہے، اور اپنے ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف پھیلا کر پکارتا ہے: اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگار! حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہے، پینا حرام ہے اور لباس حرام کا ہے اور اسے حرام ذرائع سے غذا دی جاتی ہے، تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی''۔ (صحیح مسلم: 2343)

قرآنی آیات، احادیث میں طیب (پاک مال) سے مراد وہ مال ہے، جسے حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو، حرام طریقے سے حاصل کیا ہوا مال خبیث اور ناپاک ہے۔ یہ خباثت یا ناپاکی حسی نہیں بلکہ معنوی ہے، یعنی یہ مال چونکہ ناجائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہے، اس لیے یہ حکما ناپاک ہے۔ جہاں تک نماز کی ادائیگی کا سوال ہے، سو اگر نماز تمام فقہی اصولوں اور شرعی احکام کے مطابق صحیح طور پر ادا کی جارہی ہے، تو فقہی طور پر کہا جائے گا کہ

نماز ادا ہوگئی اور بندہ ادائے فرض سے بری الذمہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت اُس کی رضا پر موقوف ہے اور اس کا علم اسی کے پاس ہے۔ دنیا میں حکم ظاہر پر لگایا جاتا ہے، باطن کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے۔ تاہم اکلِ حرام اور کسبِ حرام کا اثر عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر یقیناً مرتب ہوتا ہے اور اس سلسلے میں احادیث موجود ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ''لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ، وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں''۔ (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1)

عام نمازی جن کا مسجد میں کنڈا لگانے سے کوئی تعلق نہیں، نہ اُن کی مرضی سے کنڈا لگایا گیا ہے، اُن کی نمازوں پر اعتراض بے محل ہے، تاہم یہ نمازی اگر تقوے پر کاربند رہنا چاہتے ہیں اور شرعی احتیاط پر عمل کرنا چاہتے ہیں، تو اُنہیں چاہیے کہ کوشش کرکے مجاز ادارے سے عارضی کنکشن حاصل کریں اور اُس کے بل کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔ تقوے کے تقاضے محض فتویٰ لینے یا اعتراض کرنے سے پورے نہیں ہوتے، وہ عملی اقدام کریں اور مسجد کی ضروریات پوری کرنے میں ممد ومعاون بنیں، البتہ مسجد انتظامیہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اور قانون کے سامنے ضرور جوابدہ ہوگی۔

مسجد کی تعمیرِ نو کے بعد اضافات کا شرعی حکم

سوال:

انڈس ہسپتال کے احاطے میں ایک مسجد بنام الاثنین واقع ہے، جس میں الحمدللہ کئی برسوں سے باقاعدہ پنج وقتہ نمازیں ادا کی جارہی ہیں۔ یہ مسجد بوسیدہ ہوگئی ہے اور از سرِ نو تعمیر اور توسیع زیرِ غور ہے۔ اس وقت یہ مسجد صرف سطحِ زمین Ground Floor پر ہے، نیچے، اوپر کوئی تعمیر موجود نہیں ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ درج ذیل میں سے کیا اضافہ کیا جاسکتا ہے:

(1) نماز اور تدریس کے لیے اوپر کی منزلیں اور تہہ خانہ؟۔

(2) تہہ خانہ (Basement) میں مسجد اور ہسپتال کے لیے استعمال کے لیے پانی کا ذخیرہ (Water Tank)۔

(3) تہہ خانوں میں نمازیوں کے لیے کار پارک۔

(4) تہہ خانے میں مسجد اور دینی اُمور کا انتظامی دفتر۔

5۔ تہہ خانے میں وضو خانے اور ٹائلٹ، (محمد صدیق شیخ، کراچی)۔

جواب:

مسجد کی تکمیل کے بعد اگر ضرورت پڑے، تو مسجد کی تعمیرِ نو کی جاسکتی ہے لیکن وہاں مسجد کے علاوہ کسی اور قسم کی تعمیر کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ مسجد کے مصالح یعنی ضروریات، منافع اور سہولت ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ اس لیے مسجد کی جگہ پر تہہ خانے میں وضو خانہ، بیت الخلاء، کار پارکنگ وغیرہ بنانا وقف کی ہیئت میں تبدیلی کے مترادف ہے اور یہ جائز نہیں ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''لَایَجُوْزُ تَغْیِیْرُ الْوَقْفِ عَنْ هَیْئَتِهٖ''
ترجمہ: ''وقف کو اپنی ہیئت سے تبدیل کرنا جائز نہیں''۔ (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''لَوْ بَنٰی فَوقَهٗ بَیْتًا لِلْاِمَامِ لَا یَضُرُّ لِاَنَّهٗ مِنَ الْمَصَالِحِ. اَمَّا لَوْتَمَّتِ الْمَسْجِدِیَّةُ ثُمَّ اَرَادَالْبِنَاءَ مُنِعَ. وَلَوقَالَ عَنَیْتُ ذٰلِکَ لَمْ یُصَدَّقْ ''تَتَارخَانِیَة''. فَاِذَاکَانَ هٰذَا فِی الْوَاقِفِ فَکَیْفَ بِغَیْرِهٖ. فَیَجِبُ هَدْمُهٗ وَلَوعَلٰی جِدَارِ الْمَسْجِدِ''

ترجمہ: ''اگر واقف نے (ابتداہی میں) مسجد کی عمارت کے اوپر امام کے لیے مکان بنایا تو حرج نہیں، کیونکہ وہ مصالحِ مسجد میں سے ہے، لیکن تمام مسجدیت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے (یعنی مسجد کے اوپر امام کے لیے حجرہ بنانا چاہے) تو اس کو منع کیا جائے گا۔ اور اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے یہی ارادہ تھا، تب بھی اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، بحوالہ ''فتاویٰ تتارخانیہ''۔ جب واقف کے لیے یہ حکم ہے تو غیرِ واقف کے لیے اس طرح کرنا کیسے جائز

ہوسکتا ہے، لہٰذا ایسی تعمیرات کا گرانا واجب ہے اگرچہ وہ صرف مسجد کی دیوار کے اوپر ہو''۔

(جلد:6،ص:428،دار احیاء التراث العربی، بیروت)

نوٹ:''مسجدیت'' سے مراد مسجد بن جانا یا مسجد قرار پانا ہے۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (لَوتَمَّتِ الْمَسْجِدِيَّةُ) کے تحت لکھتے ہیں:

أَي بِالْقَوْلِ عَلَى الْمُفْتٰى بِهِ أَوبِالصَّلَاةِ فِيْهِ عَلٰى قَولِهِمَا۔ وَعِبَارَةُ ''التَّتَارخَانِيَةِ: وَإِنْ كَانَ حِيْنَ بِنَاهُ خَلّٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّاسِ ثُمَّ جَاءَ بَعدَ ذٰلِكَ يَبنِي لَايُتْرَكُ''

ترجمہ:''اگر مسجدیت تمام ہوگئی یعنی مفتیٰ بہ قول کے مطابق زبان سے (اس جگہ کو مسجد قرار دے دیا) یا طرفین کے نزدیک وہاں نماز پڑھ لی گئی ہو۔''فتاویٰ تاتارخانیہ'' کی عبارت یہ ہے: جب مسجد کی عمارت بنائی (اور) اس کو لوگوں کے حوالے کر دیا، پھر آکر (اس میں کوئی اور چیز) تعمیر کرنا چاہتا ہے تو اس کو اجازت نہیں دی جائے گی''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:6،ص:428، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز سے سوال ہوا کہ پرانی مسجد کو شہید کرکے ازسرِنو تعمیر کرنے کا ارادہ ہے اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ نیچے دکانیں بنالی جائیں تاکہ ان کے کرائے کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر صرف کی جائے اور اوپر مسجد تعمیر کرلی جائے، سب سے اوپر امام کے لیے بالاخانہ (یعنی رہائش گاہ) بنالی جائے، کیا یہ شرعاً جائز ہے (خلاصہ سوال)۔ اُنہوں نے جواب میں لکھا:''صورتِ مسئولہ میں وہ دکانیں قطعی حرام، اور وہ بالاخانہ بھی حرام۔ یعنی اگر مسجد بناتے وقت اور تمامِ مسجدیّت سے پہلے بانی مسجد نے اس کے نیچے مسجد کے لیے دوکانیں یا اوپر امام کے لیے بالاخانہ بنالیا اور اس کے بعد اُنہیں ختم کرکے مسجد میں شامل کرنا چاہے، تو یہ جائز ہے۔ اور اگر مسجد بننے کے بعد اُس میں تبدیلی کرکے نیچے دکانیں اور اوپر بالاخانہ بنانا چاہے، خواہ مسجد کی صرف دیوار ہی استعمال میں آئے، یہ تبدیلی ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگی، خواہ وہ یہ کہے کہ میری شروع ہی سے یہ نیت تھی، ایسی عمارت کو گرادیا جائے گا (یعنی جب ایک بار مسجد بن جائے، تو اُس کی ہیئت میں

تغیر و تبدل جائز نہیں ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:۱۶، ص:۴۳۲، رضا فاؤنڈیشن)''۔ نوٹ: یہ عبارت ہم نے سمجھانے کے لیے آسان کر کے لکھی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ زمین کا قطعہ جب ایک بار مسجد کے لیے وقف کر دیا یعنی اس کا رستہ الگ کرنے کے بعد وہاں پر لوگوں کو دائمی طور پر نماز پڑھنے کی اجازت دے دی یا صاحبین (امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ) کے مطابق وہاں پر ایک مرتبہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کر لی گئی، تو اب اس مسجد کی مسجدیت تمام ہوگئی اور وہ جگہ زمین سے آسمان تک مسجد ہوگئی، اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے۔ فقہائے احناف نے اصول یہی بیان کیا ہے کہ مسجد زمین کی تہہ سے آسمان تک مسجد ہی کے حکم میں ہوتی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

قَوْلُہٗ اِلٰی عَنَانِ السَّمَآئِ بِفَتْحِ الْعَیْنِ وَکَذَا اِلٰی تَحْتَ الثَّرٰی کَمَا فِیْ ''الْبِیْرِیْ'' عَنِ ''الْاِسْبِیْجَابِیْ''۔

ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے،''بیری'' میں''اسبیجابی'' سے اسی طرح منقول ہے''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج: 2، ص:371-370)

ہاں! اگر طویل عرصہ گزرنے کی وجہ سے مسجد بوسیدہ ہوجائے یا نمازیوں کے لیے جگہ تنگ ہوجائے اور اس کو از سر نو تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہو، تو اُسے شہید کر کے تعمیر نو جائز ہے، لیکن نیچے سے اوپر تک اُس کی مسجد کی حیثیت ہی بحال رکھی جائے گی، اُس کے تہہ خانے (Basement) میں وائرنگ یا پارکنگ یا وضو خانہ یا انتظامی دفاتر کا قیام جائز نہیں ہے، یہ مسجد کی ہیئت کی تبدیلی قرار پائے گا اور تمام مسجدیت کے بعد اس کی ہیئت میں تبدیلی جائز نہیں ہے۔ البتہ مسجد میں تمام تر آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کی تعلیم و تعلّم جائز ہے، بشرطیکہ نمازیوں کی نماز میں خلل واقع نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسجد کی افطاری کا مصرف

سوال:

ماہِ رمضان المبارک میں اہلِ محلہ اپنی استطاعت کے مطابق مسجدِ غفران میں ضرورتمندوں کے لیے افطاری کا اہتمام کرتے ہیں، جس سے مسافر اور غریب روزہ دار مستفید ہوتے ہیں، کیا اس افطاری سے امام مسجد اپنے اور گھر والوں کے لیے حصہ منگوا سکتے ہیں؟۔(ارشاد صدیقی، مسجد غفران، دستگیر کالونی کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں محلے کے عطیہ دینے والے اہلِ خیر حضرات کی طرف سے یہ انتظام اگر نفلی خیرات (Charity) کی رقم سے کیا جارہا ہے تو یہ جائز ہے، اس سے کسی بھی روزے دار کو افطار کرایا جاسکتا ہے اور وہ چاہے تو گھر بھی لے کر جاسکتا ہے، کیونکہ چندہ دینے والوں کے لیے یہ معہود (Understood) و معروف ہے اور ان کا سکوت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس پر راضی ہیں۔ افطار کے لیے دی جانے والی رقم کا مصرف (یعنی روزے داروں کو افطار کرانا) متعین ہے، لیکن افراد متعین نہیں ہوتے۔ لہٰذا کسی بھی روزے دار کو اس سے افطار کرایا جاسکتا ہے۔ چونکہ نفلی صدقہ کے لیے لینے والے کا مستحق زکوٰۃ یعنی فقیر و مسکین ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے کسی بھی روزے دار کو افطار کرایا جاسکتا ہے اور وہ افطار کرسکتا ہے، خواہ امام مسجد یا انتظامیہ کا رکن ہی کیوں نہ ہو اور اگر عطیہ دینے والوں کی طرف سے کوئی شرط عائد نہیں ہے، تو لوگ ساتھ بھی لے جاسکتے ہیں اور معتکفین کو بھی کھلایا جاسکتا ہے۔ تاہم عطیہ دینے والوں کو یہ بتادیا جائے کہ وہ اس مد میں زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم نہ دیں، کیوں کہ صدقاتِ واجبہ کے مصارف متعین ہیں اور ان رقوم کے خرچ کرنے کے لیے شرعی شرائط کی پابندی لازم ہے۔ ان رقوم سے صرف مالکانہ بنیاد پر فقراء و مساکین کو نقد رقم یا کھانا وغیرہ دیا جاسکتا ہے، صرف اباحت کافی نہیں ہے۔ اس کو معتکفین یا غیر مستحقِ زکوٰۃ پر صرف نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی انتظامیہ کے لوگ اسے خود

کھا سکتے ہیں یا گھر لے جا سکتے ہیں۔ اگر مسجد میں افطاری کا اہتمام کرنے یا اس مقصد کے لیے چندہ دینے والوں کو یہ معلوم ہے کہ مسجد کے عملے کے اہلِ خانہ کی افطاری بھی اسی سے بھیجی جاتی ہے اور کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہے، تو یہ جائز ہے۔

مسجد کے غیر ضروری سامان کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ: ہماری مسجد میں کچھ استعمال شدہ سامان ہے جیسے پرانی صفیں، قالین، پرانے اور خراب پنکھے، جھومر، ٹیوب لائٹس کی پٹیاں، لاؤڈ اسپیکر کے یونٹ (جو کہ اب استعمال نہیں ہوتے)، لکڑی کے دروازے، کھڑکیاں، وغیرہ، جو استعمال میں نہ ہونے کی وجہ سے مزید خراب ہو رہے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

1۔ کیا کمیٹی (متولی) ان سامان کو فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم کو مسجد کے دیگر کاموں میں استعمال کر سکتا ہے؟۔ یہ سامان کسی کو بھی فروخت کر سکتے ہیں کوئی قید تو نہیں؟۔ مذکورہ سامان میں سے جو استعمال میں آ سکتا ہے وہ سامان کسی کو بھی فروخت کر سکتے ہیں یا صرف کسی مسجد ہی میں دیا جا سکتا ہے؟، (محمد رئیس قادری، کراچی)۔

جواب:

ضرورت سے زائد چٹائیاں اور ڈیسک اگر مسجد کے استعمال کے لیے کارآمد نہ ہوں، تو دوسری مسجد کو دیے جا سکتے ہیں اور متولی مسجد انہیں فروخت کر کے دیگر مصالح مسجد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْحَصِيْرُ وَالْقَنَادِيلُ فَالصَّحِيْحُ مِنْ مَذْهَبِ أَبِي يُوسُف أَنَّهٗ لَايَعُوْدُ إِلٰى مِلْكِ مُتَّخِذِهٖ بَلْ يَحُوْلُ إِلٰى مَسْجِدٍ آخَرَ أَوْ يَبِيْعُهٗ قَيِّمُ الْمَسْجِدِ لِلْمَسْجِدِ۔

ترجمہ: ''چٹائیاں اور قندیلیں اگر مسجد کے لیے بے کار ہو جائیں تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ دینے والے کی ملک کی طرف نہیں لوٹیں گی بلکہ کسی دوسری مسجد کو دے دی جائیں گی یا متولی مسجد انہیں بیچ کر قیمت کو مسجد کے کام میں صرف

کردے''۔ (البحرالرائق، جلد5،ص:421 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

فتاویٰ تاتارخانیہ جلد نمبر 5 ص:850 پر ہے:

وَفِی الْمُنْتَقٰی: بَوَارِی الْمَسجِدِ اِذَا خَلُقت فَصَارَت لاَ یُنتفعُ بِهَا فَاَرَادَ الَّذِی بَسَطهَا اَنْ یَأخُذَهَا وَیَتَصدَّق بِهَا وَیَشْتَرِیْ مَکَانَهَا فَلَهٗ ذٰلِكَ، وَاِن کَانَ هُوَ غَائِبًا فَاَرَادَ اَهْلُ الْمَحَلَّةِ اَنْ یَاخُذُوْا البوارِیَ فَتَصَدَّقُوْا بِهَا مَا خَلُقَتْ، لَمْ یَکُنْ لَهُمْ ذٰلِكَ، اِنْ کَانَ لَهَا قِیْمَةٌ، وَاِنْ لَمْ یَکُنْ لَهَا قِیْمَةٌ فَلَا بَاْسَ بِذٰلِكَ۔

ترجمہ:''اور منتقی میں ہے: مسجد کی چٹائیاں وغیرہ جب اتنی پرانی ہوگئیں کہ ان سے اب فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، انہیں بچھانے والے شخص نے چاہا کہ انہیں لے لے اور صدقہ کردے اور ان کی جگہ اور خرید لے، تو یہ اس کے لیے جائز ہے۔ اور اگر وہ موجود نہیں ہے، اور محلے والوں نے چاہا کہ وہ چٹائیوں کو لے لیں اور ان میں سے جو پرانی ہوگئی ہیں، انہیں صدقہ کردیں، تو اگر ان کی کوئی قیمت ہے تو اس صورت میں ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے، اور اگر اب ان کی کوئی قیمت نہیں رہی تو پھر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے''۔ ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' کی اس عبارت کی روشنی میں مسجد کا وہ ملبہ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ آج کل شہروں میں اس کے اٹھانے پر بھی پیسا خرچ ہوتا ہے، اسے کوئی عام آدمی بھی لے سکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا گیا:''علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ مسجد کا فرش اور لکڑیاں جو خراب ہوجاتی ہیں، سوا مسجد کے اور کسی کام میں تصرف کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ آخر کیا کرنا چاہیے، تحریر فرمائیں''۔ آپ نے جواب دیا:''فرش جو خراب ہوجائے کہ مسجد کے کام کا نہ رہے، جس نے وہ فرش مسجد کو دیا تھا، وہ اس کا مالک ہوجائے گا، جو چاہے کرے اور اگر مسجد ہی کے مال سے تھا تو متولی بیچ کر مسجد کے جس کام میں چاہے لگا دے اور مسجد کی لکڑیاں یعنی چوکھٹ کواڑ کڑی تختہ یہ بیچ کر خاص عمارت مسجد کے کام میں صرف ہو''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد ششم، ص:430، مطبوعہ مکتبۂ رضویہ، کراچی)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ بہارِ شریعت، جلد دوم، ص: 561 پر (بحوالہ درمختار، ردالمحتار) لکھتے ہیں: ''مسجد کی چٹائی جائے نماز وغیرہ اگر بے کار ہوں اور اس مسجد کیلیے کار آمد نہ ہوں تو جس نے دیا ہے وہ جو چاہے کرے، اُسے اختیار ہے۔ اور مسجد ویران ہوگئی کہ وہاں لوگ رہے نہیں تو اس کا سامان دوسری مسجد کو منتقل کر دیا جائے بلکہ ایک مسجد منہدم ہو جائے اور اندیشہ ہو کہ اس کا ملبہ (سامان) لوگ اٹھالے جائیں گے اور اپنے صرف میں لائیں گے تو اسے بھی دوسری مسجد کی طرف منتقل کر دینا جائز ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ''ردالمحتار علی الدرالمختار'' جلد نمبر 6 صفحہ نمبر 430 پر ''مطلبٌ فِیْ نَقْلِ اَنْقَاضِ الْمَسْجِدِ ونحوہٖ'' (یعنی مسجد کے ملبے اور شکستہ چیزوں کا بیان) کے عنوان کے تحت بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کا ایسا ملبہ، بوسیدہ یا شکستہ اشیاء جن کی اس مسجد کو کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن وہ کسی اور مسجد کے کام آسکتی ہیں، تو ایسی اشیاء دوسری ضرورت مند مسجد کو دے دی جائیں، ورنہ ان اشیاء کو چور یا زور آور لوگ یا اوقاف کے نگران ویسے ہی ہڑپ کرلیں گے۔ امام ابوشجاع نے بتایا کہ مجھ سے امیر نے اس طرح کی اشیاء کے دوسری جگہ استعمال کی اجازت کا فتویٰ دریافت کیا تو میں نے علامہ شرنبلالی کی متابعت میں منع کر دیا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بعض دادا گیر لوگ اس مال کو ویسے ہی اٹھا کر لے گئے، تو مجھے اپنے فتوی پر ندامت ہوئی، پھر اب میں نے ''الذخیرہ'' میں دیکھا، صاحب ذخیرہ لکھتے ہیں: ''فتاویٰ نسفی'' میں ہے: شیخ الاسلام سے پوچھا گیا کہ ایک بستی کے لوگ اپنی مسجد کو ویران چھوڑ کر چلے گئے، بعض زور آور لوگ اس کی لکڑیوں (یعنی ملبے) پر قابض ہو گئے اور اسے اپنے گھروں کو لے گئے، تو کیا محلے کے کسی شخص کیلیے جائز ہے کہ وہ قاضی کی اجازت سے لکڑیاں بیچ ڈالے اور قیمت بعض مساجد پر یا اسی مسجد پر صرف کرے؟، تو انہوں نے جواب دیا: جی ہاں!۔

مسجد کا چندہ سڑک پر صرف کرنا

سوال:

ہمارے علاقے موہاڑ ڈڈیال آزاد کشمیر کے عوام نے ایک مرکزی جامع مسجد تعمیر کی۔ یوکے اور دیگر جگہوں کے مسلمانوں نے بھی عطیات دیے، مسجد کے اکاؤنٹ میں ابھی لاکھوں روپے موجود ہیں۔ ابھی مسجد کی تعمیر مثلاً ٹائلز، رنگ وروغن اور میناروں کا کام باقی ہے۔ سب لوگوں نے اتفاقِ رائے سے ایک شخص کو متولی مقرر کیا۔ اب وہ شخص عوام سے اس تحریر پر دستخط کروا رہا ہے کہ جن لوگوں نے مسجد میں عطیات دیے ہیں وہ اُسے اختیار دے دیں کہ مسجد کا جمع شدہ فنڈ سڑک کی تعمیر میں استعمال کیا جائے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ: کیا مسجد کی جمع شدہ رقم سڑک کی تعمیر پر خرچ کی جاسکتی ہے؟۔ جن لوگوں نے عطیات دیے، کیا اب ان کو یہ حق حاصل ہے کہ تحریر پر دستخط کے ذریعے وہ اُس مسجد کی رقم کو سڑک کی تعمیر پر خرچ کرنے کا اختیار دے دیں، (حاجی محمد بشیر، ونسن گرین برمنگھم یو۔کے)

جواب:

مساجد کے عطیات میں یہ امر معروف ہے کہ یہ مسجد کے مصارف جاریہ کے لیے ہوتے ہیں۔ اُن مصارف جاریہ میں ضروری تعمیر ومرمت کے علاوہ مسجد کے (بجلی، گیس اور پانی وغیرہ کے) یوٹیلیٹی بلز، ضرورت کے وقت رنگ وروغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی وسیوریج کا نظام، عملے کی تنخواہ اور مصارف شامل ہوتے ہیں۔ آج کل چونکہ بجلی کا بحران ہے اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس لیے بعض مساجد میں جنریٹر کا انتظام کیا گیا ہے، خاص طور پر رمضان المبارک میں شدید گرمی کے موسم میں تراویح پڑھنا عوام کے لیے مشکل ہوتا ہے، جنریٹر کو چلانے میں ڈیزل / پٹرول / گیس الغرض ایندھن کا استعمال ہوتا ہے، یہ بھی مصارف جاریہ میں سے ہیں۔ یہ سب معروف ومعہود (Understood,Known) مصارف ہیں، ان پر مسجد کے فنڈ سے خرچ ہوتا ہے اور عطیات دینے والے اس سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں، بعض اوقات ان ضروریات کے

حوالے سے اپیل بھی کی جاتی ہے، لہٰذا مذکورہ بالا مصارف پر مسجد فنڈ سے پیسے کا استعمال جائز ہے۔ البتہ جو رقم کسی خاص مصرف اور مد کے لیے لی جائے یا عطیہ دینے والے کسی خاص مد کو مُتعین کر کے دیں، جیسے تعمیرِ مسجد، تو اُس رقم کو اُسی مصرف پر یا اُسی مد میں خرچ کیا جائے، جس مَصرف کے لیے دینے والوں نے مُتعیَّن کیا ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ثُمَّ اِلٰی مَاھُوَ اَقْرَبُ اِلَی الْعِمَارَةِ وَاَعَمُّ لِلْمَصْلَحَةِ کَالْاِمَامِ لِلْمَسْجِدِ وَالْمُدَرِّسِ لِلْمَدْرَسَةِ یُصْرَفُ اِلَیْھِمْ بِقَدْرِ کِفَایَتِھِمْ۔ ثُمَّ السِّرَاجُ وَالْبُسُطُ کَذٰلِکَ اِلٰی اٰخِرِ الْمَصَالِحِ۔ ھٰذَا اِذَا لَمْ یَکُنْ مُعَیَّنًا۔ فَاِنْ کَانَ الْوَقْفُ مُعَیَّنًا عَلٰی شَیْءٍ یُصْرَفُ اِلَیْهِ بَعْدَ عِمَارَةِ الْبِنَاءِ کَذَا فِی ''الْحَاوِی الْقُدْسِی''

ترجمہ: ''پھر وقف کے مال کو اُن امور پر خرچ کیا جائے، جو ضروری ہونے میں تعمیرِ مسجد کے قریب ہوں اور جن سے مسجد کی زیادہ آبادکاری ہو اور مسجد کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں، جیسے مسجد کے لیے امام اور مدرسے کے لیے مُدرّس، اُن پر اتنی رقم خرچ کی جائے گی جو ان کی ضروریات کے لیے کفایت کرے، پھر چراغ (یعنی روشنی کا انتظام) اور دریوں و چٹائیوں (یعنی فرش) کا انتظام اور اسی طرح کے دوسرے امور جو مسجد میں نمازیوں کے لیے سہولت کا باعث ہوں (مصالح سے یہی مراد ہے)۔ وقف کے مال کو خرچ کرنے میں یہ (وسعت) اُس صورت میں ہے کہ (کسی مُعطی یا واقف کی طرف سے) مَصرف مُعیَّن نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اگر مُعطی یا واقف کی طرف سے وقف کا مَصرف مُتعین کر دیا گیا ہے، تو عمارت کی تعمیر کے بعد اُسی مَصرف پر صرف کیا جائے گا ''الحاوی القدسی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:368، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

وقف متعین کرنے کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے رقم دی ہو کہ اس سے نمازیوں کو ٹھنڈا پانی فراہم کرنے کے لیے کولر لگا دیں یا گرمی کی شدت سے بچانے کے لیے جنریٹر کا انتظام کر دیں، تو اس صورت میں یہ رقم فقط اسی مصرف پر خرچ کی جا سکے گی اور متولی اس کا

پابند ہوگا۔البتہ اگر مسجد زیرِ تعمیر ہوتو اس رقم کو واقف کی شرط کے برخلاف تعمیر مسجد میں لگا سکتے ہیں۔

مسجد کے عطیات/آمدنی مسجد کی ضروریات کے لیے صرف کی جاسکتی ہیں، اسی طرح جو رقم تعمیر کے لیے جمع کی گئی، وہ مُعیّن ہے، اس کے سوا کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز نہیں۔البتہ تعمیرِ مسجد کے بعد بھی اگر رقم بچ جائے تو اس کو مسجد کی دوسری ضروریات میں خرچ کرسکتے ہیں۔سڑک کی تعمیر کے لیے مسجد کے فنڈ یا عطیات سے قطعاً رقم خرچ نہیں کی جاسکتی۔اِس مقصد کے لیے مُتولی کا لوگوں سے اختیار لینا بھی جائز نہیں ہے کہ جن لوگوں نے تعمیرِ مسجد کے لیے رقم دی، اب وہ اُس رقم کا مَصرَف تبدیل نہیں کرسکتے کہ جو رقم دی تھی، اب وہ وقف ہوگئی۔الشیخ الامام حافظ الدین محمد بن محمد بن شہاب الدین المعروف ابن بزاز الکردری حنفی متوفی 827ھ لکھتے ہیں:

وَاَرَادُوا نَقْضَ الْمَسْجِدِ وَبِنَاءَ هُ أَحْكَمَ مِنَ الْأَوَّلِ، إِنْ لَمْ يَكُنِ الْبَانِيْ مِنْ أَهْلِ الْمَحَلَّةِ لَيْسَ لَهُمْ ذٰلِكَ وَإِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْمَحَلَّةِ لَهُمْ ذٰلِكَ وَلَهُمْ أَيْضًا أَنْ يَفْرِشُوا بِالْآجُرِّ وَالْحَصِيْرِ وَيُعَلِّقُوا الْقَنَادِيْلَ لٰكِنْ مِنْ مَالِ أَنْفُسِهِمْ لَا مِنْ مَالِ الْمَسْجِدِ إِلَّا بِأَمْرِ الْحَاكِمِ

ترجمہ:''اہلِ محلہ مسجد کو توڑ کر پہلے سے عمدہ و مستحکم بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں، اگر بانی اہلِ محلہ میں سے نہیں ہے، تو انہیں اس کا اختیار نہیں ہے اور اگر وہ اہلِ محلہ میں سے ہے، تو انہیں اس کا اختیار ہے، وہ اینٹوں کا فرش بھی بناسکتے ہیں (آج کل طرح طرح کی ٹائیلوں کے فرش بنتے ہیں) اور چٹائیاں بچھاسکتے ہیں (آج کل ان کی جگہ قیمتی دریوں، قالینوں کا رواج ہے) اور روشنی کے لیے فانوس لٹکاسکتے ہیں، لیکن یہ سب خدمات ان کو اپنے مال سے انجام دینی ہوں گی، حاکم (یا واقف) کی اجازت کے بغیر مسجد کے مال سے نہیں کرسکتے''۔

(فتاویٰ بزازیہ بہامش علی الہندیہ، جلد 6،ص:268)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''وقف جس غرض کے لیے ہے، اُس کی آمدنی اگرچہ اس کے صرف سے فاضل ہو، دوسری غرض میں صرف کرنی حرام ہے۔ وقفِ مسجد کی آمدنی مدرسہ میں صرف ہونی درکنار، دوسری مسجد میں بھی صرف نہیں ہوسکتی، نہ ایک مدرسہ کی آمدنی مسجد یا دوسرے مدرسہ میں، درمختار میں ہے:

اِتَّحَدَ الْوَاقِفُ وَالْجِهَةُ وَقَلَّ مَرْسُوْمُ بَعْضِ الْمَوْقُوْفِ عَلَيْهِ جَازَ لِلْحَاكِمِ اَنْ يَصْرِفَ مِنْ فَاضِلِ الْوَقْفِ الْاٰخَرِ عَلَيْهِ لِاَنَّهُمَا حِيْنَئِذٍ كَشَيْءٍ وَاحِدٍ وَاِنِ اخْتَلَفَ اَحَدُهُمَا بِاَنْ بَنٰى رَجُلَانِ مَسْجِدَيْنِ اَوْ رَجُلٌ مَسْجِدًا اَوْمَدْرَسَةً وَوَقَفَ عَلَيْهِمَا اَوْقَافًا لَايَجُوْزُ لَهٗ ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ''جب واقف ایک ہو اور جہت وقف بھی ایک ہو اور آمدن کی تقسیم بعض موقوف علیہ حضرات پر کم پڑ جائے تو حاکم کو اختیار ہے کہ وہ دوسرے فاضل وقف سے ان پر خرچ کر دے کیونکہ یہ دونوں وقف ایک جیسے ہیں اور اگر واقف یا جہت وقف دونوں کی مختلف ہو مثلاً دو حضرات نے علیحدہ علیحدہ مسجد بنائی یا ایک نے مسجد اور دوسرے نے مدرسہ بنایا اور ہر ایک نے ان کے لیے علیحدہ وقف مقرر کیے، تو پھر ایک کی آمدن سے دوسرے کے مصارف کے لیے خرچ کرنا جائز نہیں''۔ چندہ کا جو روپیہ کام ختم ہو کر بچے لازم ہے کہ چندہ دینے والوں کو حصہ رسد واپس دیا جائے یا وہ جس کام کے لیے اب اجازت دیں اس میں صرف ہو۔ اُن کی اجازت کے بغیر صرف کرنا حرام ہے، ہاں! جب ان کا پتا نہ چل سکے تو اب یہ چاہیے کہ جس طرح کے کام کے لیے چندہ لیا تھا، اسی طرح کے دوسرے کام میں اٹھائیں مثلاً تعمیر مسجد کا چندہ تھا، مسجد تعمیر ہوچکی تو باقی بھی کسی مسجد کی تعمیر میں اٹھائیں۔ غیر کام مثلاً تعمیر مدرسہ میں صرف نہ کریں اور اگر اس طرح کا دوسرا کام نہ پائیں تو وہ باقی روپیہ فقیروں کو تقسیم کر دیں، درمختار میں ہے: فَاِنْ فَضَلَ شَيْءٌ رُدَّ لِلْمُتَصَدِّقِ اِنْ عَلِمَ وَاِلَّا كُفِّنَ بِهٖ مِثْلُهٗ وَاِلَّا تَصَدَّقَ بِهٖ۔ (کفن کے چندہ سے کچھ بچ جائے تو یہ چندہ دینے والا معلوم ہو تو اسے لوٹا دیا جائے ورنہ اس سے ایسے ہی فقیر کو کفن پہنا دیا جائے، یہ بھی نہ ہو سکے، تو کسی فقیر کو صدقہ

کر دیا جائے ،)اسی طرح فتاویٰ قاضی خان و عالمگیری وغیرہما میں ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 16،ص:206،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"عموماً یہ چندے صدقۂ نافلہ ہوتے ہیں، ان کو وقف نہیں کیا جا سکتا کہ وقف کے لیے یہ ضرور ہے کہ اصل حبس کرکے اس کے منافع کام میں صرف کیے جائیں،جس کے لیے وقف ہو، نہ یہ کہ خود اصل ہی کو خرچ کر دیا جائے ، یہ چندے جس خاص غرض کے لیے کیے گئے ہیں،اس کے غیر میں صرف نہیں کیے جاسکتے۔ اگر وہ غرض پوری ہوچکی ہوتو جس نے دیے ہیں اس کو واپس کیے جائیں یا اس کی اجازت سے دوسرے کام میں خرچ کریں۔ بغیر اجازت خرچ کرنا ناجائز ہے"۔(فتاویٰ امجدیہ،جلد سوم،ص:39)

وقف کا مُنتظم اُس کا مُتولّی ہوتا ہے اور مسجد کا مال اُس کے پاس امانت ہوتا ہے اگر وہ اُس امانت میں خیانت کرتا ہے یا غیر مصرف پر اُس کو خرچ کرتا ہے،تو اُس مُتولی کو معزول کرنا لازم ہے،تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: وَیُنْزَعُ وُجُوبًا،"بَزَازِیَّة"،لَوِ الْوَاقِفُ، "دُرَر"، فَغَیْرُہٗ بِالْأَوْلٰی (غیرمَامُونٍ)أَوْعَاجِزًا، أَوْ ظَهَرَبِهٖ فِسْقٌ، کَشُرْبِ خَمرٍ وَنَحوِهٖ، "فتح"،أَوْکَانَ یَصْرِفُ مَالَهٗ فِی الْکِیْمِیَاءِ،"نَهر" بَحثًا۔ترجمہ:"(خیانت پر مُتولی کو جبراً معزول کرنا واجب ہے، جیسا کہ "بزازیہ" میں ہے،خواہ وہ واقف خود ہی ہو،جیسا کہ "دُرَر" میں ہے تو غیر واقف شخص کو، جو قابلِ اعتماد نہ ہو، بطریق اَولیٰ معزول کیا جائے گا یا مُتولّی عاجز ہو یا اُس کا فسق ظاہر ہوگیا ہو جیسے شراب نوشی وغیرہ یا اسی طرح کا کوئی اور فسق ظاہر ہوا ہو،جیسا کہ "فتح القدیر" میں ہے یا اپنا مال کیمیا میں صرف کرتا ہو جیسا کہ "النہر" میں ہے،(تو ان تمام صورتوں میں اس متولی کو معزول کر دیا جائے گا)"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 13،ص:499 تا 504)

پس صورتِ مسئولہ میں چونکہ ابھی مصالح مسجد سے متعلق اُمور یعنی ٹائلز، رنگ وروغن اور مینار وغیرہ کا کام باقی ہے،لہٰذا پہلے ان کاموں کو مکمل کیا جائے ،اس کے بعد اگر مصالح

مسجد میں سے کوئی کام باقی نہ رہے، تو چندہ دینے والوں کو واپس کر دیا جائے یا اُن کی اجازت سے دوسرے کاموں پر صرف کیا جائے۔

مسجد کے بیت الخلاء میں پانی کا استعمال

سوال:

ہماری مسجد کے بیت الخلاء میں بازار کے دکاندار اور نمازی وغیرہ آتے ہیں، جمعدار اُس کے پیسے وصول کرتا ہے۔ وضو خانے میں استعمال کے لیے جو پانی ٹنکی میں بھرا جاتا ہے، وہی بیت الخلاء میں بھی استعمال ہوتا ہے، پانی بھرنے کے لیے موٹر اور بجلی مسجد کی استعمال ہوتی ہے۔ بازار کے لوگ بھی پانی بھر کر لے جاتے ہیں، کیا یہ طریقہ ٹھیک ہے؟

(فرید قادری، جامع مسجد فرقانیہ، لیاقت آباد کراچی)

جواب:

بیت الخلاء کی صفائی پر مامور جمعدار درحقیقت بیت الخلاء آنے والوں سے جو پیسے وصول کر رہا ہے، وہ بیت الخلاء کی صفائی کی اجرت ہے۔ عام حالات میں آپ صفائی کے لیے کسی کو مُتعین کرتے ہیں تو اُس کی تنخواہ یا ماہانہ اجرت طے کر لیتے ہیں، جو یقینی طور پر مسجد کے عطیات سے ادا کی جاتی ہے۔ اگر جمعدار کو مقرر نہ بھی کیا گیا ہو تو بھی ٹنکی میں پانی چڑھانے کے لیے موٹر چلانا اور بیت الخلاء میں پانی کی فراہمی کا اہتمام مسجد سے ہی کیا جاتا ہے۔ دکاندار پینے کے لیے یا دیگر انسانی حاجت کے لیے بقدرِ ضرورت پانی لے سکتے ہیں، لیکن اگر پانی کا استعمال کاروباری مقاصد میں ہوتا ہے تو نہیں لے سکتے۔

مفتی وقار الدین رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا: ''مسجد کی دکانیں کرایہ پر دی ہوئی ہیں، کرایہ دار مسجد کا پانی اپنی ضروریات میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''مسجد کی دوکانوں کے کرایہ دار پینے وغیرہ اور دیگر ضروریات انسانی کے لیے بقدرِ ضرورت پانی استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہوٹل وغیرہ ہے تو اس کے لیے پانی کا انتظام ان کو اپنا کرنا ہوگا''۔ (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص:316)

ٹرسٹ کو سرمایہ کاری کی رقم میں نامزد کرنا

سوال:

زید کی عمر 70 سال سے زائد ہے، اُس نے نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ کے ایکویٹی فنڈ میں اپنی رقم کی سرمایہ کاری کر رکھی ہے، یہ سرٹیفکیٹ کمپنی میں شیئرز کا ثبوت اور رسید ہیں۔ زید یہ بانڈز یا سرٹیفکیٹ ایک ٹرسٹ (الف) کو وقف کرنا چاہتا ہے، ٹرسٹ (الف) جو کہ تبرع اور نیکی کے کام کرتا ہے، وہ مستقل بنیادوں پر اس کا نفع وصول کرتا رہے اور نیکی کے کاموں میں یہ رقم خرچ ہوتی رہے اور زید کے لیے صدقۂ جاریہ بنے۔ البتہ زید کی خواہش ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے، سرٹیفکیٹ کی آمدنی کا نفع زید استعمال کرتا رہے، انتقال کے بعد اس فنڈ کی آمدنی ٹرسٹ (الف) ہی کو ملے۔ کیا اس طرح سرٹیفکیٹ یا صکوک کا وقف ہو سکتا ہے؟۔ سرٹیفکیٹ خود کوئی مال نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پر جو اموال مشاع ہیں، یہاں ان کو وقف کیا جارہا ہے۔ کسی مجبوری یا مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کے باعث ٹرسٹ اس اثاثہ کو فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟، ٹرسٹ فروخت شدہ مال کو کس مصرف میں صرف کرنے کا پابند ہے؟

(امجد چانڈیا، کراچی)

جواب:

سوال میں جو صورت بیان کی گئی ہے، یہ کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہے جسے زید نے وقف کیا ہو۔ یہ اس نے ایک کاروباری ادارے میں اپنے نام پر سرمایہ کاری کی ہوئی ہے اور وہ خود اس کا مالک ہے، کیونکہ نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ ایک کاروباری ادارہ ہے، جو شراکت داروں کے مال پر مضاربت کے طور پر سرمایہ کاری کرتا ہے اور اس کا منافع طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق سرمایہ کاروں (اَربابُ الاموال) کو ادا کرتا ہے۔ اس میں انوسٹ کرنے والوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جب چاہیں وہ اپنا پیسا نکلوا سکتے ہیں اور اس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً ان حِصص یا سرٹیفکیٹس کی پیشگی قیمت خرید اور قیمت فروخت مقرر کرتے ہیں۔ لہٰذا کسی ٹرسٹ کا نام بطور (Nominee) دینا، یہ وصیت کے حکم میں ہے اور وصیت

زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک جائز ہے۔ اگر یہ رقم اس کے مجموعی ترکے کی ایک تہائی کے برابر ہو یا اس سے کم ہے، تو یہ اس کی وفات کے بعد نافذ ہو جائے گی اور وہ ٹرسٹ ان سرٹیفکیٹس کو فروخت کر کے اپنے مقاصد پر خرچ بھی کر سکتا ہے اور آئندہ مدت کے لیے اپنے ادارے کے نام پر سرمایہ کاری بھی کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس ٹرسٹ کے قواعد وضوابط میں انہیں اس کی اجازت ہو۔ الغرض یہ وقف نہیں ہے، وصیت ہے۔

ایک طویل حدیث میں سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے سال میری عیادت کے لیے تشریف لائے، میں نے اپنی تکلیف کی شکایت کی اور دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس کچھ مال ہے اور میری ایک بیٹی ہے، کیا میں اپنے مال سے تین حصے صدقہ کروں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، آپ نے پوچھا: نصف (صدقہ کروں) آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، پھر فرمایا:

اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ کَبِیْرٌ اَوْ کَثِیْرٌ اِنَّکَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَکَ اَغْنِیَاءَ، خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ، وَاِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللهِ اِلَّا اُجِرْتَ بِهَا حَتّٰی مَا تَجْعَلُ فِیْ فِیْ امْرَاَتِکَ۔

ترجمہ: ’’تہائی (صدقہ کرو) اور تہائی بھی بہت ہے، زیادہ ہے، تمہارا اپنے ورثاء کو مال دار چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں تنگ دست چھوڑ جاؤ اور وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کریں اور تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو بھی کچھ خرچ کرو گے، تمہیں اُس کا اجر ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو (اس پر بھی اجر کے حق دار ہو)‘‘۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1295)

کسی ٹرسٹ کے نام جو رقم دی جائے، وہ اس ٹرسٹ کے پہلے سے طے شدہ مقاصد پر ہی صرف ہو سکتی ہے اور رقم دینے والا بھی ان کے مصرف کا تعین کر سکتا ہے۔

وقتی نماز جنازے پر مُقدّم ہے

سوال:

۲۔ اگر نماز کی جماعت کے دوران نمازِ جنازہ آجائے تو کیا فرض نماز کی جماعت کے فوراً بعد نمازِ جنازہ پڑھی جائے یا سنن اور نوافل پڑھ کر پھر نمازِ جنازہ پڑھی جائے۔

(قاری محمد اسحاق سعیدی، جامع مسجد عمر فاروق، سیکٹر 11-A، نارتھ کراچی)

جواب:

نماز کا وقت ہو اور جنازہ لایا جائے تو وقتی نماز کو جنازے پر مقدم کیا جائے گا، علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: (وَتُقَدَّمُ) صَلَاتُهَا (عَلَى صَلَاةِ الْجَنَازَةِ إِذَا اجْتَمَعَتَا) لِأَنَّهُ وَاجِبٌ عَيْنًا، وَالْجَنَازَةُ كِفَايَةٌ۔

ترجمہ: ''جب نماز اور جنازہ ایک وقت میں جمع ہو جائیں تو نماز کو مقدم کیا جائے گا (یعنی پہلے ادا کیا جائے گا)، اس لیے کہ نماز فرضِ عین ہے اور جنازہ فرضِ کفایہ ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5، ص: 101، دمشق)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال ہوا: ''مغرب کے وقت جنازہ آئے تو پہلے نمازِ فرض کی ادائیگی ہو یا نمازِ جنازہ کی''۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''پہلے نماز مغرب ادا کرنا چاہیے جیسا کہ ردالمحتار میں ہے: بلکہ مقررہ سنتوں کو بھی ادا کر لینا چاہیے، اسی پر فتویٰ ہے جیسا کہ ''البحرالرائق'' وغیرہ (کُتبِ فقہ) میں ہے۔ اقول: ہاں! اگر ضرورت پہلے ادائے جنازہ کی طالب ہے مثلاً مردہ کا پیٹ پھولا ہوا ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر دیر کریں تو پھٹ جائے گا اور ابھی وقت میں اتنی وسعت ہے کہ جنازہ پہلے ادا کرنے سے مغرب فوت نہ ہوگی، تو ایسے وقت میں ناچار بالاتفاق نمازِ جنازہ کی ادائیگی پہلے ہوگی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 184-183)''۔ تاہم اگر جنازہ وقتی نماز کا وقت داخل ہونے سے پہلے کا آیا ہوا ہے، تو اسے فوراً پڑھ لینا چاہیے، خواہ مکروہ تحریمی وقت ہی ہو، تاہم صحیح وقت سے جان بوجھ کر نمازِ جنازہ کو مؤخر کر کے مکروہ وقت میں پڑھنا منع ہے''۔

ایک اور سوال کے جواب میں آپ لکھتے ہیں: ''جب وقتِ ظہر وسیع ہے، تو نمازِ جنازہ پہلے پڑھ لیں، ہاں! اگر جنازہ لے جانے والے بھی اسی جماعت ظہر میں شریک ہوں گے کہ اگر جنازہ کی نماز پہلے ہوجائے، تب بھی جنازہ نمازِ ظہر سے فارغ ہونے کے لیے رکھا رہے گا اور اُس کے تغیر کا اندیشہ نہ ہو تو ظہر فرض وسنت پہلے پڑھیں کہ اس دیر میں شاید اور نمازی بھی آجائیں اور جنازے پر تکثیر ہو''۔(فتاوی رضویہ، جلد9،ص:184)

مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:

اگر میت کے ساتھ امام صاحب اور کچھ نمازی بھی مسجد سے باہر ہوں اور باقی نمازی مسجد میں ہوں تو کیا اس صورت میں نمازِ جنازہ ہوجائے گی یا نہیں؟۔میت مسجد سے باہر ہوں لیکن امام اور کچھ نمازی محراب اور مسجد میں ہوں تو کیا ایسی صورت میں نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟(قاری محمد اسحاق سعیدی، جامع مسجد عمر فاروق، سیکٹر 11-A، نارتھ کراچی)

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک مسجد میں جنازہ رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا بالاتفاق مکروہ ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ صَلّٰی عَلٰی جَنَازَةٍ فِی الْمَسْجِدِ فَلَا شَیْءَ لَهٗ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مسجد میں (رکھی ہوئی) میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، اس کے لیے کوئی (اجر) نہیں ہے،(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:3189)''۔اس حدیث کو امام ابن ماجہ، امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی، علامہ ابن ہمام نے کراہت تنزیہی کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ یہ افضل اور اولیٰ کا خلاف ہے، یعنی مسجد میں

نمازِ جنازہ پڑھنا بھی مباح ہے لیکن افضل یہ ہے کہ خارجِ مسجد پڑھی جائے''۔

(فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد:2، ص:1026)

علامہ خوارزمی لکھتے ہیں: ''اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں ہے: مَنْ صَلّٰی عَلٰی جَنَازَۃٍ فِی الْمَسْجِدِ فَلَا شَیْئَ لَہٗ۔ اِس حدیث میں ظرف (فی المسجد) کا تعلق اگر صلّی کے ساتھ کیا جائے تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہوگا (کیونکہ ایسی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا مسجد سے باہر، اگر نمازی مسجد کے اندر کھڑا ہے تو یہ نمازِ جنازہ بہر صورت مکروہ ہے) اور اگر ظرف (فی المسجد) کو جنازہ کی صفت بنایا جائے، تو پھر صرف اس وقت مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہوگا جب جنازہ مسجد میں رکھا ہوا ہو، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کراہت کی علّت یہ ہو کہ مسجد کو صرف فرض پڑھنے کے لیے بنایا گیا ہے، تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، اور اگر کراہت کی علّت یہ ہو کہ (مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی صورت میں) مسجد کے نجاست میں آلودہ ہونے کا خدشہ ہے، تو جب جنازہ مسجد سے باہر ہو تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہوگا، شمس الائمہ نے مبسوط میں اسی طرف میلان کیا ہے''۔

(کفایہ مع فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد:2، ص:291028,)

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی حنفی لکھتے ہیں:

وَعِندَنَا اِذَا کَانَتِ الْجَنَازَۃُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ لَمْ یُکْرَہْ اَنْ یُّصَلِّیَ النَّاسُ عَلَیْھَا فِی الْمَسْجِدِ اِنَّمَا الْکَرَاھَۃُ فِیْ اِدخَالِ الْجَنَازَۃِ لِقَولِہٖ عَلَیہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ جَنِّبُوْا مَسَاجِدَکُمْ صِبْیَانَکُمْ وَمَجَانِیْنَکُمْ فَاِذَا کَانَ الصَّبِیُّ یُنْھٰی عَنِ الْمَسْجِدِ فَالْمَیِّتُ اَوْلٰی۔

ترجمہ: ''جب جنازہ مسجد سے باہر ہو، تو ہمارے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، کراہت صرف میت کو مسجد کے اندر داخل کرنے میں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بچوں اور پاگلوں کو اپنی مسجد سے دور رکھو، جب بچوں کو مسجد سے دور رکھنے کا حکم ہے، تو

میت کو دور رکھنا اولیٰ ہے''۔ (المبسوط جلد 2 ص:68،مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت)

علامہ سید طحطاوی لکھتے ہیں:

وَكَلَامُ شَمْسِ الْاَئِمَّةِ السَّرَخْسِي يُفِيْدُ اَنَّ هٰذَا هُوَ الْمَذْهَبُ حَيْثُ قَالَ: وَعِنْدَنَا اِنْ كَانَتِ الْجَنَازَةُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ لَمْ يُكْرَهْ اَنْ يُصَلّٰى عَلَيْهَا فِي الْمَسْجِدِ۔

ترجمہ: ''شمس الائمہ سرخسی کی (اس) عبارت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ احناف کا مذہب (مختار) یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ اگر جنازہ مسجد سے باہر ہوتو ہمارے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے''۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ،جلد 2،ص:240،المکتبۃ الغوثیہ،کراچی)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَكُرِهَتْ تَحْرِيماً) وَقِيلَ (تَنْزِيهاً فِي مَسْجِدِ جَمَاعَةٍ هُوَ) أَيِ الْمَيِّتُ (فِيهِ) وَحْدَهُ أَوْ مَعَ الْقَوْمِ (وَاخْتُلِفَ فِي الْخَارِجَةِ) عَنِ الْمَسْجِدِ وَحْدَهُ أَوْ مَعَ بَعْضِ الْقَوْمِ (وَالْمُخْتَارُ الْكَرَاهَةُ) مُطْلَقاً۔

ترجمہ: ''اور ایسی مسجد میں جہاں جماعت کا اہتمام ہو، (نمازِ جنازہ) مکروہ تحریمی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی ہے، خواہ صرف میت مسجد میں رکھی یا میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، جب صرف میت مسجد سے باہر رکھی ہو (اور نمازی مسجد کے اندر ہوں) یا میت کے ساتھ کچھ نمازی بھی مسجد سے باہر ہوں (اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں) تو اس صورت میں فقہاء کا اختلاف ہے، اور مختار قول یہ ہے کہ بہر صورت مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، (یعنی میت اور سب نمازی مسجد کے اندر ہوں یا میت اور بعض نمازی مسجد سے باہر ہوں اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں مگر ظاہر ہے کہ کراہت صرف ان نمازیوں کے حق میں ہوگی، جو مسجد کے اندر کھڑے ہیں)۔ درمختار کی اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران اس امر پر بھی کلام کیا ہے کہ حدیث پاک ''(مَنْ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَلَا شَيْئَ لَهٗ)'' (یعنی جس نے مسجد میں میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، اس کے لیے کوئی اجر نہیں) اور ایک

روایت میں ہے "فَلَیْسَ لَهٗ اَجْرٌ")۔ اس حدیث میں "فی المسجد" میں تین احتمالات ہیں:
(1) یہ کہ ظرف "صلّی" سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ: جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر کسی میت کا جنازہ پڑھا، تو اس کے لیے کوئی اجر نہیں، (اس کی رو سے دونوں احتمالات یکساں ہیں، خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا خارجِ مسجد)، (2) یہ کہ ظرف "فی المسجد" میت سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے کسی کی نماز جنازہ پڑھی، درآں حالیکہ میت مسجد میں رکھی ہو، تو اس کے لیے کوئی اجر نہیں، اس کی رو سے دونوں احتمالات کا یکساں حکم ہوگا، خواہ نماز پڑھنے والے مسجد میں کھڑے ہوں یا خارجِ مسجد۔ (3) یہ کہ ظرف (فی المسجد) "صلّی" اور "میت" دونوں کے ساتھ متعلق ہو، تو اس صورت میں جب نمازی اور میت دونوں مسجد میں ہوں گے، تو نمازِ جنازہ مکروہ ہوگی، اور اگر کوئی ایک (نمازی یا میت) خارجِ مسجد ہے تو نماز مکروہ نہیں ہے، (اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں: اور ان تمام صورتوں میں یہ مفہوم مذہب مختار کے خلاف ہے، (کیونکہ مذہب مختار یہ ہے) مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے"۔ (ج:3، ص:118، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَصَلَاۃُ الْجَنَازَۃِ فِی الْمَسْجِدِ الَّذِی تُقَامُ فِیهِ الْجَمَاعَۃُ مَکْرُوھَۃٌ سوائٌ کَانَ الْمَیِّتُ وَالْقَوْمُ فِی الْمَسْجِدِ اَوْکَانَ الْمَیِّتُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ وَالْقَوْمُ فِی الْمَسْجِدِ اَوْکَانَ الْاِمَامُ مَعَ بَعْضِ الْقَوْمِ خَارِجَ الْمَسْجِدِ وَالْقَوْمُ الْبَاقِیْ فِی الْمَسْجِدِ اَوِالْمَیِّتُ فِی الْمَسْجِدِ وَالْاِمَامُ وَالْقَوْمُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ ھُوَالْمُخْتَارُ کَذَا فِی "الْخُلَاصَۃ"۔

ترجمہ: "جس مسجد میں نماز باجماعت (باقاعدگی سے) ہوتی ہو، اس میں نماز جنازہ مکروہ ہے، خواہ (1) میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، (2) یا میت مسجد سے باہر ہو اور نماز پڑھنے والے مسجد میں ہوں، (3) یا امام اور بعض نماز پڑھنے والے مسجد سے باہر ہوں اور باقی لوگ مسجد میں ہوں، یا میت مسجد میں ہو اور امام اور مقتدی مسجد سے باہر ہوں، یہی مذہب مختار ہے اور "خلاصۃ الفتاویٰ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری

جلد:1 ،ص:165)''۔ اگر بارش ہو رہی ہو تو اس صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ''وَلَاتُکْرَہُ بِعُذْرِ الْمَطَرِ وَنَحْوِہٖ ھٰکَذَا فِی الْکَافِی''۔

ترجمہ:''اور بارش یا اس جیسے دیگر اَعذار کی بنا پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص165)

بعض تنگ شہری علاقوں میں مسجد کے باہر کھلی جگہ ہوتی ہی نہیں، جہاں نمازِ جنازہ پڑھی جا سکے، ایسی صورت میں بعض مقامات پر لوگ سڑکوں یا گلیوں کو بلاک کر کے وہاں پر جنازہ پڑھتے ہیں، جبکہ شارعِ عام اور دوسرے کی زمین پر بلااجازت جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''تُکْرَہُ فِی الشَّارِعِ وَاَرَاضِ النَّاسِ کَذَافِی ''الْمُضْمَرَات''۔

ترجمہ:''سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلااجازت ومنظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص:165)

سڑک پر چونکہ حقِ مُرور (Right of Passage) سب کا ہوتا ہے، اس لیے اسے بلاک کرنے سے سب کا عمومی حق متاثر ہوتا ہے اور حدیث مبارک میں ہے:

نَھٰی رَسُوْلُ اللہِ ﷺ اَنْ یُّصَلّٰی فِی سَبْعَۃِ مَوَاطِنَ: فِی الْمَزْبَلَۃِ، وَالْمَجْزَرَۃِ، وَالْمَقْبَرَۃِ، وَقَارِعَۃِ الطَّرِیْقِ وَفِی الْحَمَّامِ، وَفِی مَعَاطِنِ الْاِبِلِ وَفَوْقَ ظَھْرِبَیْتِ اللہِ۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے سات مقامات پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے:''کوڑے کا ڈھیر، مَذبح، مقبرہ، عام راستہ، حمام، اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ اور بیت اللہ کی چھت پر، (سنن ترمذی:346)''۔ ان میں بیت اللہ کی چھت پر ممانعت کا سبب ادب ہے، قبرستان میں نماز کی ممانعت سے مراد ہے کہ نمازی کا رخ قبر کی جانب ہو، اگر قبرستان کے اندر یا مُتّصل مسجد بنی ہوئی ہے، تو اس میں نماز جائز ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جہاں مسجد کے باہر جنازہ کے لیے جگہ دستیاب ہو، وہاں مسجد میں نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے اور جہاں جگہ دستیاب نہ ہو، جیسے شہروں کے اندر تنگ جگہیں ہوتی

ہیں، وہاں پڑھ سکتے ہیں کیونکہ بعض اکابر فقہائے کرام نے اس کی اجازت دی ہے۔

سرکاری زمین پر مسجد کا قیام

سوال:

لالہ رخ واہ کینٹ میں ایک مسجد کینٹ بورڈ کی ملکیتی زمین پر بغیر اجازت تعمیر کی گئی، تعمیر کے کچھ عرصہ بعد نقشے اور بلڈنگ پلان کی منظوری کے لیے حکومت کے ذمہ داران سے رابطہ کیا تو درج ذیل اعتراض کیے گئے:

(۱) لیز ڈیڈ مسجد کے لیے رجسٹرڈ نہیں کی گئی۔ (۲) مسجد کی تعمیر ناجائز، غیر قانونی اور منظوری کے بغیر کی گئی۔ (۳) حکومت کی زمین پر غاصبانہ قبضہ ہے۔

کیا مذکورہ مسجد میں نماز، اعتکاف ودیگر عبادات کا شرعی حکم کیا ہے؟، اس تمام صورتِ حال پر شرعی حکم بیان فرمائیں، (اختر عالم، واہ کینٹ)۔

جواب:

مسجد ہونے کے لیے وقف ہونا شرط ہے، اگرچہ انہی الفاظ سے کہ ''میں نے اسے مسجد بنادیا'' اس سے بھی وقف ہوجائے گا۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَيَزُولُ ملكُهٗ عَنِ الْمَسْجِدِ وَالْمُصَلّٰى) بِالْفعلِ وَ(بِقَولِهٖ جَعلتُهٗ مَسجِدًا)

ترجمہ: ''کسی شخص کے یہ کہنے سے کہ میں نے زمین کے اس حصے کو مسجد بنادیا ہے یا عملاً اس میں نماز پڑھی جارہی ہے، وہ زمین اس کی ملکیت سے نکل جائے گی''۔

(ردالمحتار جلد 6 ص:426 داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''جب وہ مکان عام مسلمین کے ہمیشہ نماز پڑھنے کے لیے بنایا اسے کسی محدود مدت سے مقید نہ کیا کہ مہینے دو مہینے یا سال دو سال اس میں نماز کی اجازت دیتے ہیں اور اس میں نماز حتّٰی کہ جمعہ وعیدین تک ہوتے ہیں تو اس کے مسجد ہونے میں کیا شک ہے،۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: خالی زمین نماز کے لیے

وقف کی جائے وہ بھی مسجد ہوجائے گی اگرچہ یہ نہ کہا ہوا سے مسجد کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 16 ص: 281 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

وقف کے درست ہونے کے لیے اس کی شہرت ہونا کافی ہے، تنویر الابصار مع الدرمختار میں ہے: تُقبَلُ فِيهِ۔ بِالشُّهْرَةِ اِلٰى اَنْ قَالَ حِفْظاً لِلْاَوْقَافِ الْقَدِيْمَةِ عَنِ الْاِسْتِهلَاكِ۔

ترجمہ: ''یعنی عامۃ الناس میں مشہور ہونا کہ یہ وقف کی جگہ ہے، یہ بھی شرعاً ایک مقبول شہادت ہے۔۔۔ آگے چل کر فرمایا: اصول اس لیے مقرر ہوا تاکہ پرانے اوقاف کو (جن کی کوئی دستاویزی شہادت یا ریکارڈ یا ان افراد کی شہادت جن کے سامنے وقف کیا گیا) ضائع ہونے سے بچایا جاسکے''۔ (درمختار، جلد 6 صفحہ: 484)

اگر حکومت نے سوسائٹیوں اور کالونیوں میں مساجد کے لیے پلاٹ مختص کیے ہیں، تو یہ خود ریاست یا متعلقہ ادارے کی جانب سے اصولی طور پر وقف قائم ہوجاتا ہے، کسی انجمن یا ٹرسٹ کے نام ان کی الاٹمنٹ کا مقصد وقف کے متولی کا تقرر اور تعین ہے۔ لہٰذا بعد میں اُن کالونیوں کے رہائشی لوگوں نے اپنی ضرورت کے تحت اگر انہی مقررہ پلاٹوں پر مسجدیں بنادی ہیں اور حکومت نے بروقت کوئی تعرض نہیں کیا، تو شرعاً ان مساجد میں نماز جائز و درست ہے اور ان مساجد کو اب کسی ضرورت کے تحت شہید کرنا یا ان کی حیثیت کو ختم کرنا درست نہیں ہے۔ باقاعدہ لیز یا الاٹمنٹ قانونی کارروائی کا حصہ ہے، انتظامیہ کو چاہیے کہ قانونی تقاضے پورے کرنے میں مسجد انتظامیہ کی معاونت کرے۔

اگر کسی کالونی یا ہاؤسنگ سوسائٹی کے لوگ کسی ایسی سرکاری زمین پر مسجد بناتے ہیں، جو اصل لے آؤٹ پلان میں مسجد کے لیے متعین نہیں ہے تو حکومت یا سرکاری و نیم سرکاری ادارے کو بروقت اسے روک دینا چاہیے، بعد میں مسجد بن جانے کے بعد ہمارے معاشرے میں صورت حال جذباتی بن جاتی ہے اور فساد کا باعث بنتی ہے۔ اس کا ذمے دار اُن سرکاری افسران اور افراد کو ٹھہرانا چاہیے، جو لینڈ کنٹرول اور نگرانی کے ذمے دار ہیں اور

باقاعدہ اس کی تنخواہیں لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ جب حکومتی اداروں کی ناک کے سامنے زمین پر قبضہ ہوتا ہے، عوام کے عطیات اور صرفِ کثیر سے مسجد تعمیر ہوتی ہے، تو وہ خاموش رہتے ہیں، کوئی قانونی کارروائی نہیں کرتے، تو پھر اسے رضائے سکوتی (Silent Permission) سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر ایک دن میں تو نہیں ہوتی، اس پر عرصہ لگتا ہے، پھر مسجد آباد ہو جاتی ہے، اب بہتر صورت یہی ہے کہ متعلقہ ادارہ اُسے قانونی حیثیت دیدے یعنی Legalize کرے اور اُسے اُس انتظامیہ کے نام الاٹ کر دے، جس نے اُسے تعمیر کیا ہے اور اُس کا انتظام چلا رہی ہے اور اُس کے مالی مصارف پورا کر رہی ہے۔

اصولی طور پر مغصوبہ اور مقبوضہ زمین پر مسجد کا قیام جائز نہیں ہے، لیکن مسجد بننے کے بعد اسے منہدم کرنے سے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں، حکمت سے کام لینا بہتر ہے۔ اس لیے دین میں سدِّ ذرائع کو اہمیت دی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ. وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ. وَبَیْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَایَعْلَمُهَا کَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ. فَمَنِ اتَّقَی الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ وَعِرْضِهٖ. وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ: کَرَاعٍ یَرْعَی حَوْلَ الْحِمَی. یُوْشِكُ أَنْ یُوَاقِعَهٗ. أَلَاوَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًی. أَلَاإِنَّ حِمَی اللّٰهِ فِی أَرْضِهٖ مَحَارِمُهٗ. أَلَاوَإِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً: إِذَاصَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ. وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ. أَلَاوَهِیَ الْقَلْبُ۔

ترجمہ: ''حلال واضح ہے اور حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان مُشتبہ (Doubtful) امور ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے اور جو مُشتبہ اُمور سے بچا رہا، تو اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچالیا، پس جو مُشتبہ اُمور میں پڑا، اُس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد اپنے مویشی چراتا ہے اور اندیشہ رہتا ہے کہ اُس کے مویشی اُس چراگاہ میں گھس جائیں گے (اور اسے تاراج کردیں گے)۔ سنو! ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی زمین پر اس کی ممنوعہ حدود اس کی حرام کی ہوئی اشیاء

(Prohibited) ہیں۔ سنو! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ ٹھیک رہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر اس میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، سنو! وہ گوشت کا لوتھڑا دل ہے''۔ (صحیح بخاری:52)

سو حکومت اور متعلقہ اداروں پر لازم ہے کہ سَدِّ ذرائع کو اختیار کرتے ہوئے ممنوعات کے قریب جانے سے لوگ اگر خود نہیں رکتے تو انہیں حکومتی اختیارات اور قانونی طاقت سے روکیں۔

دینی مدارس اور مساجد سے Withholding Tax کی کٹوتی

سوال:

حکومت نے 16-2015 کے بجٹ میں بینکوں سے رقوم نکلوانے پر ودہولڈنگ ٹیکس عائد کردیا ہے اور کسی استثنٰی کے بغیر ودہولڈنگ ٹیکس مساجد، مدارس، دینی جامعات اور رفاہی اداروں سے بھی کاٹا جارہا ہے، کیا یہ شرعاً درست ہے؟ (منور احمد، لیاقت مارکیٹ ملیر، کراچی)

جواب:

ہمیں مختلف ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دینی مدارس و جامعات، مساجد اور رفاہی ادارے جب اپنے اکاؤنٹس سے اپنی ضروریات اور مصارف کے لیے رُقوم نکالتے ہیں تو ان سے Withholding Tax وضع کیا جاتا ہے، ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔ دینی مدارس و جامعات کے اکاؤنٹس میں صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، نذر اور کفارات) کی رُقوم جمع ہوتی ہے اور ان کا مستحق ان اداروں کے طلبہ و طالبات ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان رُقوم سے حکومت کا Withholding Tax سمیت کسی بھی قسم کا ٹیکس کاٹنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ برطانیہ، ناروے اور دیگر مغربی ممالک میں مساجد سمیت خیراتی (Charitable) اداروں کو لوگ عطیات دیتے ہیں اور ان پر حکومت جو ٹیکس وصول کرچکی ہوتی ہے، وہ ان خیراتی اداروں کو لوٹا دیتی ہے اور ان کے اکاؤنٹ میں جمع کرتی ہے، جبکہ ہمارے اسلامی ملک میں اس کے برعکس ہورہا ہے جو انتہائی

افسوس ناک ہے اور حکومت کو جلد از جلد ان اداروں کو اس لازمی ٹیکس کی کٹوتی سے مستثنیٰ قرار دینا چاہیے اور اب تک جو ٹیکس وضع کیا جا چکا ہے، اسے واپس ان اداروں کے اکاؤنٹس میں جمع کرنا چاہیے۔

مسجد امامت کا اجارہ اور امام کی معزولی

سوال:

آج کل اکثر مساجد میں یہ معمول بن گیا ہے کہ انتظامیہ مسجد کے امام صاحبان سے گیارہ ماہ کی مدت کا اجارہ کرتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، امام صاحب اجارہ نہ کریں اور مشاہرے پر ہی امامت کریں تو کیا انہیں اجارہ پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ائمہ کرام کو ذاتی ملازم اور مزدور کی سطح پر رکھنا چاہتے ہیں، جبکہ امامت تو امت کی دینی رہنمائی کا منصب ہے؟۔ (سید اسلم قادری، نارتھ کراچی)۔

جواب:

خطیب و امام مسجد کی اصل ذمے داری جمعہ وعیدین اور نماز پنج گانہ، احکام شرع بیان کرنا اور لوگوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے۔ سب سے زیادہ امامت کا مستحق وہ شخص ہے جو نماز وطہارت کے احکام سب سے زیادہ جانتا ہو، قرآن مجید صحیح مخارج کے ساتھ پڑھتا ہو، صحیح العقیدہ ہو، محرمات وممنوعات سے بچتا ہو۔ اگر کسی امام میں کوئی شرعی خرابی نہ ہو تو اُس کی امامت میں کوئی حرج نہیں، نہ اُس کی امامت کسی اجارہ کی محتاج ہے۔ ایسے لوگ جو اجارہ پر ائمہ سے معاملات طے کرتے ہیں، اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر اجارہ پر رکھا گیا امام کسی اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا ہے، تو کیا اجارہ کی طے شدہ مدت ملازمت (گیارہ ماہ) پوری کرنے کا حق اُسے حاصل ہوگا؟۔

امامت اپنی نوعیت اور ذمے داریوں کے اعتبار سے کل وقتی (Full Time) منصب ہے اور ائمہ وخطباء بھی اسی معاشرے کے افراد ہیں اور اُن کی بھی وہی انسانی حاجات اور ضروریات ہوتی ہیں، اپنے اپنے خاندانوں کی سماجی تقریبات (شادی/وفات)

میں حصہ لینا ہوتا ہے، لہٰذا ان تمام اُمور کو عادلانہ بنیادوں پر طے کر لینا چاہیے تاکہ یہ تاثر نہ ہو کہ امام کے ساتھ یومیہ مزدور کی طرح برتاؤ کیا جا رہا ہے۔

امام کو اجارے پر مجبور تو کوئی نہیں کر سکتا، اجارہ فریقین کی رضامندی پر موقوف ہوتا ہے۔ البتہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں، اس میں ملازمین کے کچھ حقوق ہوتے ہیں، مراعات ہوتی ہیں اور ملازمت پر نصب اور عزل کے ضابطے ہوتے ہیں۔ ہر ملازمت، خواہ حکومت کی ہو یا پرائیویٹ، اجارہ ہی ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں وقف کے ملازمین مثلاً مدرسین اور ائمہ وخطباء پر گیارہ ماہ کے اجارے کی تلوار لٹکانے کی فقہی اعتبار سے کوئی نظیر موجود نہیں ہے، وقف کے معاملات میں اپنے عہد کے عرف کا اعتبار ضرور کرنا چاہیے۔ جس معاشرے میں خاکروب تک پر اس طرح کے محدود مدت کے اجارے کی تلوار نہیں لٹکائی جاتی، وہاں مساجد کے ائمہ کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیسے درست ہو سکتا ہے؟۔

مسجدیں وقف ہوتی ہیں اور اُن کے مالی وسائل بھی وقف ہیں، مسجد کا عملہ اُس وقف کے مصارف ہیں، وقف کے ملازمین کو عذرِ شرعی کے بغیر معزول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ گیارہ ماہ کا اجارہ کرنے کے بعد وہ جب چاہے وقف کے ملازمین کو نوکری سے برطرف کر سکتا ہے تو اس کا یہ خیال باطل ہے۔ عذرِ شرعی کے بغیر اس کو کسی صورت برطرف نہیں کیا جا سکتا۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''اوقاف سے جو ماہوار وظائف مقرر ہوتے ہیں، یہ من وجہ اُجرت ہے اور من وجہ صلہ، اُجرت تو یوں ہے کہ امام و مؤذن کی اگر اثنائے سال میں وفات ہو جائے تو جتنے دن کام کیا ہے، اُس کی تنخواہ ملے گی اور محض صلہ ہوتا تو نہ ملتی اور اگر پیشگی تنخواہ ان کو دی جا چکی ہے، بعد میں انتقال ہو گیا یا معزول کر دیے گئے تو جو کچھ پہلے دے چکے ہیں، وہ واپس نہیں ہوگا اور محض اُجرت ہوتی تو واپس ہوتی''۔

(بہارِ شریعت، جلد اول، ص:545)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا: ''راب گڑھ میں دو مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک مسجد کا متولی جو نماز و روزہ کا پابند نہیں ہے، اُس نے ایک پیش امام

جوقوم کا صدیقی اور علم کا حافظ ومولوی حکیم مقرر تھا، اس کو متولی نے بلا وجہ الگ کر دیا اور بجائے اس کے بلا رائے مقتدیوں کے دوسرا امام جو صرف حافظ وقوم کا قصاب ہے۔ متولی سے معزولی کا سبب پوچھا تو جواب دیا: ہماری مسجد ہے، ہم جو چاہیں سو کریں، مقتدی پوچھ نہیں سکتے۔آپ نے جواب میں لکھا:''اگر صحتِ مذہب وقراءت وطہارت میں بقدرِ جوازِ نماز ہیں اور امام وظیفہ پاتا ہے تو بلاقصور پہلے کو معزول کرنا گناہ ہوا کہ بلاوجہ ایذائے مسلم کہ لَایُعزَلُ صَاحِبُ وَظِیفَۃٍ بِغَیرِجُنْحَۃٍ (کسی صاحب وظیفہ کو بغیر کسی گناہ کے معزول نہیں کیا جاسکتا) اور متولی کا کہنا کہ مسجد ہماری ہے ہم جو چاہیں کریں، محض باطل ہے، مسجدیں اللہ عزوجل کی ہیں: اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَاتَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (یقیناً مسجدیں اللہ تعالیٰ ہی کی ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کی بندگی نہ کرو) اُس میں وہی کیا جائے گا جو حکم شرع ہے اور اس کا یہ زعم باطل ہے کہ مقتدی پوچھ نہیں سکتے''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 6،ص:615)

ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:''امام مذکور جبکہ عالم بھی ہے اور قرآن مجید با تجوید پڑھتا ہے، تو محض اس بنا پر کہ حافظ نہیں، اسے معزول کرنا جائز نہیں، آخر یہ کون سا گناہ ہے، کیا حافظ ہونا شرطِ امامت ہے کہ بغیر اس کی امامت صحیح نہیں، کیا جب اسے مقرر کیا تھا، اُس وقت اُس نے اپنا حافظ ہونا ظاہر کیا تھا اور حافظ سمجھ کر امام بنایا تھا، لہٰذا کمیٹی کو امامت سے معزول کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں، ردالمحتار (جلد 13،ص:506) میں البحرالرائق (جلد 5،ص:380) سے ہے: وَاسْتُفِیدَ مِنْ عَدَمِ صِحَّۃِ عَزْلِ النَّاظِرِ بِلَاجُنْحَۃٍعَدمُھَا لِصَاحِبِ وَظِیفَۃٍ فِی وَقفٍ بِغَیرِجُنْحَۃٍ وَعَدَمِ اَھْلِیَّۃٍ (متولی کو بلاوجہ شرعی معزول کرنے کے عدمِ جواز سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وقف سے وظیفہ پانے والے کسی بھی شخص کو بغیر کسی جرم یا اہلیت نہ ہونے کے معزول کرنا جائز نہیں ہے) کمیٹی تو کمیٹی اگر بلاوجہ شرعی حاکم اسلام معزول کرنا چاہے، تو نہیں کرسکتا، فتاویٰ خیریہ میں ہے: قَدصَرَّحَ الْعُلَمَاءُ بِاَنَّہٗ لَایَجُوزُعَزْلُ النَّاظِرِ وَلَاعَزلُ صَاحِبِ وَظِیفَۃٍ مَابِغَیرِ جُنْحَۃٍ وَلَوعَزَلَہُ الْحَاکِمُ لَایَنعَزِلُ بِغَیرِ جُنْحَۃٍ وَلِلْقَاضِی اِبقَاءُہٗ عَلٰی

وَ ظِیْفَتِہٖ ،(فتاویٰ خیریہ کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے: ''علماء نے تصریح کی ہے کہ اوقاف کے نگران اور اوقاف سے تنخواہ پانے والے کسی ملازم کو کسی قصور کے بغیر منصب یا ملازمت سے معزول کرنا جائز نہیں ہے، خواہ حاکم معزول کرے تو بھی کسی قصور کے بغیر معزول نہیں ہوگا اور قاضی کو چاہیے کہ اسے منصب پر بحال رکھے)، وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعلَم۔

(فتاویٰ امجدیہ، جلد اول، ص:114-113)

مسجد عطیات / فنڈ پر زکوٰۃ نہیں

سوال:

میں اسلام آباد میں ایک مسجد کا خزانچی ہوں، میرے پاس مسجد فنڈ میں کچھ رقم موجود ہے جو کہ زکوٰۃ کے نصاب سے زائد ہے۔ یعنی اس رقم پر زکوٰۃ بنتی ہے۔ مسجد کا کوئی بنک اکاؤنٹ نہیں ہے اور یہ رقم میرے پاس جمع شدہ ہے۔ مہربانی فرما کر یہ بتائیں کہ آیا مسجد کے فنڈ پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں، (عبدالرشید محمد، اسلام آباد)۔

جواب:

مسجد کے عطیات نفلی صدقات اور وقف ہوتے ہیں، اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے وجوب کی شرائط میں سے ایک شرط کم از کم نصاب کی مقدار یا اس سے زائد مال کا کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں ہونا ہے اور مسجد کے فنڈ کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا۔ وقف کا شرعی حکم یہ ہے کہ مال اللہ تعالیٰ کی مِلک ہوتا ہے اور وقف کا مُتولّی شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس مال کو وقف کے مقاصد پر خرچ کرتا ہے۔ زکوٰۃ کی رقم مسجد میں صرف نہیں کی جاسکتی۔

انجمن کے فنڈ سے قرضِ حسن دینے کا حکم

سوال:

ہماری غوثیہ خدمت کمیٹی ہے، جو ویلفیئر کے کام کرتی ہے۔ زکوٰۃ، فطرہ، قربانی کی کھالیں، صدقات، عطیات کے علاوہ ممبر شپ کی مد میں ماہانہ کچھ رقم جمع ہوتی ہے۔ ان

رقوم سے ویلفیئر درج ذیل کام کرتی ہے:

(۱) لوگوں کو کفن فراہم کرنا، (۲) رمضان میں راشن کی تقسیم، (۳) مریضوں کے علاج کے لیے رقم فراہم کرنا۔ دفتر میں ایک آفس بوائے ہے، جس کو ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا ویلفیئر جمع ہونے والی رقوم سے یہ کام کرسکتی ہے؟۔ نیز کیا جمع شدہ رقم سے ممبران کو وقتی طور پر ادھار دیا جاسکتا ہے؟۔ (جاوید مغل، لیاقت کالونی، کراچی)

جواب:

زکوٰۃ وفطرہ کی جمع شدہ رقم محض ویلفیئر/کمیونٹی یا برادری کے فنڈ/اکاؤنٹ میں رکھے رہنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، تاوقتیکہ مستحقِ زکوٰۃ تک پہنچا دی جائے۔ دوسرا یہ کہ زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم جب تک الگ مد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصول کے مطابق مستحق افراد کو نہیں دی جائے گی، ادا نہیں ہوگی۔ انجمنوں (Associations) کے ذمے داران زکوٰۃ کا مال صَرف کرنے کے لیے اہلِ ثروت کے وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمے داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے، تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔

برادریوں کی انجمنیں یا رفاہی ادارے جو مستحقین کی مدد کے لیے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، وہ اگر حدودِ شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں:

(۱) زکوٰۃ وفطرہ کی رقم نادار مستحق زکوٰۃ کی مِلک میں دے دی جائے۔

(۲) شادی کے موقع پر ناداروں کو جہیز کے لیے نقد رقم دیدی جائے یا سامان خرید کر ان کی مِلک میں دے دیا جائے۔

(۳) کم قیمت فلیٹ یا مکان مالکانہ بنیاد پر ناداروں کو دے دیا جائے۔

(۴) علاج کے لیے دوائیں دی جائیں یا ڈاکٹر کے آپریشن وغیرہ کی فیس کے لیے انہیں رقم دے دی جائے۔

(۵) مختلف صنعت وحرفت سے وابستہ مستحقین زکوٰۃ کو ان کی ضرورت کی چیزیں مالکانہ بنیادوں پر زکوٰۃ کی مد سے خرید کر دی جاسکتی ہیں، جیسے سلائی کڑھائی کی مشینیں یا دستکاری

کی مشینیں یا چھوٹے چھوٹے ورکشاپ بنا کر دینا۔

دفتری عملے کو تنخواہ کی مد میں زکوٰۃ وفطرہ کی رقم سے نہیں دیا جا سکتا۔ نیز اس رقم کو ممبران یا کسی بھی فرد کو بطورِ ادھار یا قرض نہیں دیا جا سکتا۔

قربانی کی کھالوں اور نفلی عطیات کا مصرف ہونے کے لیے نادار ہونا شرط نہیں۔ ممبر شپ کی مد میں حاصل ہونے والی آمدنی نفلی صدقات کی مد میں شمار ہوگی۔ اَموات کے کفن اور دفتری ملازم کے مشاہرے ودیگر ضروری اخراجات غوثیہ خدمت کمیٹی کے ارکان کے عطیات، ممبر شپ فیس اور نفلی صدقات سے ادا کیے جا سکتے ہیں اور اس کی وضاحت ممبر شپ فارم پر کر دی جائے۔ اگر انجمن کا اکاؤنٹ ایک ہی ہے تو صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات اور نذر کی رقوم) کی آمد وخرچ کا حساب (Head of Account) الگ رکھا جائے اور کھاتے کے رجسٹر (Ledger) میں اس کے مصارف کی تفصیل درج ہونی چاہیے اور صدقاتِ واجبہ اور نفلی صدقات کا اکاؤنٹ الگ الگ بھی رکھا جا سکتا ہے۔ انجمن نے اگر اپنے مقاصد میں قرضِ حسن کا شعبہ پہلے سے قائم کر رکھا ہے، تو صدقاتِ نافلہ کی مد سے قرضِ حسن دے سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔ آئندہ کے لیے بھی وہ ایسی قرارداد منظور کر سکتے ہیں، اگر انجمن کے چارٹر میں ان کو اس کا اختیار دیا گیا ہو اور عطیہ دینے والوں کو اس کا علم ہونا چاہیے۔

زکوٰۃ کا مصرف

سوال:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس سلسلے میں کہ مسجد سے ملحق وہ مکانات جن میں امام مسجد ومؤذن رہائش پذیر ہوں جن کے یوٹیلیٹی بلز مسجد کے فنڈ سے ادا کیے جاتے ہیں، کیا ایسے مکانات کی تعمیر وتوسیع یا برقی سامان مثلاً پنکھے، بلب اور جنریٹر وغیرہ کی خریداری اور تنصیب زکوٰۃ کی رقم سے کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(قاری محمد اسحاق سعیدی، ایس ٹی 40، سیکٹر 11-A، نارتھ کراچی)

جواب:

زکوٰۃ کی رقم کسی بھی قسم کے تعمیراتی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے۔ آپ نے جتنے مصارف ذکر کیے، اُن میں سے کسی مصرف میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

شَرْعًا: (تَمْلِيكٌ) خَرَجَ الْإِبَاحَةُ. فَلَوْ أَطْعَمَ يَتِيمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَا يُجْزِيهِ، إِلَّا إِذَا دَفَعَ إِلَيْهِ الْمَطْعُومَ، كَمَا لَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ أَنْ يَعْقِلَ الْقَبْضَ۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنادینا''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کردینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہوگیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلایا تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کردیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لیے یتیم کو کپڑا پہنایا، بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہے (تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی)''۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَيُشْتَرَطُ أَنْ يَكُونَ الصَّرْفُ (تَمْلِيكًا) لَا إِبَاحَةً كَمَا مَرَّ (لَا) يُصْرَفُ (إِلَى بِنَاءِ) نَحْوِ (مَسْجِدٍ وَ) لَا إِلَى كَفَنِ مَيِّتٍ وَقَضَاءِ دَيْنِهِ۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنادیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گزشتہ سطور میں) گزرا، (اسی تملیک کی شرط کی وجہ سے) زکوٰۃ کی رقم کسی عمارت پر یا مسجد پر یا میت کو کفن پہنانے پر اور اس کا قرض ادا کرنے پر صرف نہیں کی جاسکتی (کیوں کہ ان صورتوں میں مالک بنانا متحقق نہیں ہوتا، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:3، ص:161، 263)''۔ اسی طرح زکوٰۃ کی رقم کو تعمیر مسجد یا مسجد کے دوسرے مصارفِ جاریہ پر بھی خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

روزے کے مسائل

جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت

سوال: رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو ہمارے خطے میں ''جمعۃ الوداع'' کے عنوان سے رمضانِ مبارک کے عام جمعوں کے مقابلے میں نسبتاً اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے، جمعہ کے خطبے میں ''اَلْوَدَاعُ اَلْوَدَاعُ یا شَھرِ رمضان'' کے کلمات دہرائے جاتے ہیں، پھر آخری دن نعت خواں ''آج رمضان کی الوداع ہے'' جیسے اشعار پُر درد آواز میں پڑھتے ہیں اور اس سے غیر شعوری طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی خصوصی اجر کا ذریعہ ہے، ازراہِ کرم بتائیں کہ شریعت میں اس کی اصل کیا ہے؟۔

(مولانا منور احمد نعیمی ،لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی)

جواب: ہفتے کے سات دنوں میں ''جمعۃ المبارک'' وہ مقدس دن ہے، جس کے نام سے قرآن مجید کی ایک پوری سورت نازل ہوئی۔ اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے رکوع میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞

ترجمہ: ''اے مومنو! جب جمعہ کے دن نمازِ (جمعہ) کی اذان دی جائے، تو تم اللہ کے ذکر (نماز) کی طرف دوڑ پڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہی (روش) تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔ پھر جب نماز ادا کردی جائے، تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ''۔ (جمعہ:10-9)

ابتداءِ اسلام میں جمعہ کے لیے ایک ہی اذان دی جاتی تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مدینہ طیبہ کے پھیلاؤ کی وجہ سے دوسری اذان شروع کی۔ پہلی اذان وقت شروع ہونے پر مقام ''زوراء'' پر دی جانے لگی اور دوسری اذان جب امام خطبے کے لیے منبر پر بیٹھ جاتا، تو اس کے سامنے دی جاتی۔ یہ امر تو سب پر واضح ہے کہ خطبۂ جمعہ

خلیفہ وقت دیتا تھا۔

اس پر بھی فقہائے کرام نے کلام کیا ہے کہ کاروبار پہلی اذان پر ترک کرنا ہوگا یا دوسری اذان پر، اس بارے میں دونوں طرح کی آراء موجود ہیں۔ لیکن حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلی اذان پر کاروباری معمولات چھوڑ کر جمعہ کی تیاری کی جائے تا کہ خطبہ سننے کے لیے بروقت پہنچ سکے، کیونکہ خطبۂ جمعہ سننا واجب ہے۔ جمعہ کی اہمیت بیان کرنے کے لیے چند احادیث درج ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے منبر پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا:

لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ وَدعِهِمُ الْجُمُعَاتِ، أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللهُ عَلٰى قُلُوبِهِم، ثُمَّ لَيَكُونُنَّ مِنَ الْغَافِلِينَ۔

ترجمہ: ''لوگ جمعہ ترک کرنے سے باز آجائیں، ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے''۔ (صحیح مسلم: 865)

(۲) إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَنْصِتْ وَالإِمَامُ يَخْطُبُ، فَقَدْ لَغَوْتَ۔

ترجمہ: ''جمعے کے دن امام کے خطبے کے دوران اگر تم نے اپنے ساتھی سے کہا کہ چپ ہو جا (اگرچہ بظاہر یہ اچھا کام ہے)، تو تم نے لغو کام کیا''۔ (بخاری: 934)

(۳) مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللهُ عَلَى قَلْبِهِ۔

ترجمہ: ''جس نے (کسی شرعی عذر کے بغیر) تین جمعے معمولی بات سمجھ کر چھوڑ دیے، تو اللہ اس کے دل پر مہر لگا دے گا''۔ (سُنن ترمذی: 500)

جمعۃ المبارک کی نماز کی اہمیت کو جاننے کے لیے یہ وعید کافی ہے۔

(۴) نَحْنُ الآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ القِيَامَةِ، بَيْدَ أَنَّهُم أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، ثُمَّ هٰذَا يَوْمُهُمُ الَّذِي فُرِضَ عَلَيهِم، يَعنِي يَوْمَ الجُمُعَةِ، فَاخْتَلَفُوا فِيهِ، فَهَدَانَا اللهُ لَهُ،

ترجمہ: ''ہم دنیا میں آمد کے اعتبار سے سب سے آخری امت ہیں اور (محشر میں حاضری یا جنت میں داخلے کے اعتبار سے) سب سے اوّل ہوں گے، سوائے اس کے کہ انہیں ہم سے

پہلے کتاب الٰہی عطا کی گئی۔ پھر یہ جمعہ اُن پر فرض کیا گیا، تو انہوں نے اس میں اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کو پانے کی ہدایت فرمائی''۔ (صحیح بخاری:876)

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ہم پیدائش کے اعتبار سے (سب) اُمتوں سے آخر میں ہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلے ہمارا حساب ہوگا''۔

(۵) آپ ﷺ نے جمعے سے (کسی شرعی عذر کے بغیر) پیچھے رہ جانے والوں کے لیے شدید وعید فرمائی: لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَرَجُلاً يُصَلِّيَ بِالنَّاسِ، ثُمَّ أُحَرِّقَ عَلٰى رِجَالٍ يَتَخَلَّفُونَ عَنِ الْجُمُعَةِ بُيُوتَهم۔ ترجمہ: ''میں ارادہ کرتا ہوں کہ ایک شخص کو لوگوں کی امامت کے لیے کھڑا کروں اور پھر جمعے سے پیچھے رہ جانے والوں کے گھروں کو آگ لگا دوں''۔ (صحیح مسلم:652)

(۶) مَنْ كَانَ يُومِنُ بِاللهِ وَالْيَومِ الآخِرِ، فَعَلَيهِ الْجُمُعَةُ يَومَ الْجُمُعَةِ، اِلَّا مَرِيضٌ، أو مُسَافِرٌ، أو صبيٌّ، أو مَمْلُوكٌ۔ ترجمہ: ''جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس پر نمازِ جمعہ کی ادائیگی لازم ہے، سوائے مریض، مسافر، بچے اور غلام کے (کہ ان کو عذر کی بنا پر جمعہ چھوڑنے کی رخصت ہے)''۔ (سنن دار قطنی:1)

(۷) خَيْرُيَومٍ طَلَعَتْ فِيهِ الشَّمْسُ يَومُ الْجُمُعَةِ۔ ترجمہ: ''بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوا، جمعے کا دن ہے''۔ (سنن ترمذی:488)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: اِذَا خَرَجَ الاِمَامُ۔۔۔۔ فَلَا صَلَاةَ وَلَا كَلَامَ

ترجمہ: ''جب امام خطبے کے لیے نکل جائے، تو نہ کوئی نماز پڑھی جائے اور نہ کلام کیا جائے''۔

(جلد5،ص:72، دمشق)

احادیث مبارکہ میں جمعۃ المبارک کے دن بعض اہم واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا بیان ہے، جن میں سے چند یہ ہیں: ''آدم علیہ السلام کی پیدائش، اُن کا جنت میں داخل کیا جانا اور جنت سے نکلنا، اُن کی توبہ کا قبول ہونا، اُن کی وفات، قیامت کا قائم ہونا اور اس کے مختلف مراحل کا ظہور''۔ اسی طرح احادیث مبارکہ میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ

جمعۃ المبارک کے دن ایک ''قبولیت کی ساعت'' ہے کہ اگر اس وقت کوئی دعا کرے، تو اللہ تعالیٰ اُس دعا کو قبول فرماتا ہے۔ لیلۃ القدر کی طرح دعا کی قبولیت کی اس ساعت کو بھی مستور رکھا گیا ہے تا کہ بندوں کے ذوق وشوق کا پتا چلے۔ تاہم بعض روایات کی رو سے یہ امام کے خطبے کے لیے کھڑے ہونے سے لے کر نماز کے ختم ہونے تک ہے اور بعض کی رو سے یہ نمازِ عصر سے غروبِ آفتاب کے درمیان کی کوئی ساعت ہے۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ مِن أَفْضَلِ أَیَّامِکُمْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ، فِیهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِیهِ قُبِضَ وَفِیهِ النَّفْخَةُ وَفِیهِ الصَّعْقَةُ، فَأَكْثِرُوا عَلَیَّ مِنَ الصَّلَاةِ فِیهِ، فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوْضَةٌ عَلَیَّ، قَالَ: قَالُوا: یَارَسُولَ اللہ! وَکَیْفَ تُعْرَضُ صَلَاتُنَا عَلَیْكَ وَقَدْ أَرِمْتَ؟، قَالَ: یَقُولُونَ: بَلِیتَ، فَقَالَ: اِنَّ اللہَ عَزَّوَجَلَّ حَرَّمَ عَلَی الْأَرْضِ أَجْسَادَ الْأَنْبِیَاءِ۔

ترجمہ: ''بے شک تمہارے دنوں میں سے سب سے بہترین دن جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، اسی دن اُن کی روح قبض کی گئی، اسی دن (قیامت کا) صور پھونکا جائے گا اور اِسی دن خوفناک کڑک ہوگی (جس کے نتیجے میں تمام جاندار وفات پا جائیں گے)، سوتم اس دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، صحابۂ کرام نے عرض کی: ''یارسول اللہ! ہمارا درود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا جب کہ آپ کا جسمِ مبارک بوسیدہ ہو چکا ہوگا، راوی بیان کرتے ہیں: انہوں نے کہا: آپ کا جسدِ مبارک پرانا ہو چکا ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاءِ کرام کے اجسامِ مبارکہ پر اثر انداز ہو، (سنن ابوداؤد: 1043)''۔ رسول اللہ ﷺ (جمعہ کے دن) زوال کے بعد چار رکعات پڑھتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: اِنَّهَا سَاعَةٌ تُفْتَحُ فِیهَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَأُحِبُّ أَنْ یَصْعَدَ لِی فِیهَا عَمَلٌ صَالِحٌ۔ ترجمہ: ''یہ (ایک مبارک) گھڑی ہے، اس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، تو میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرا نیک عمل عالَمِ بالا میں جائے''۔ (سنن ترمذی: 478)

ہمارے خطے میں رمضانِ مبارک کے آخری جمعے کو ''جمعۃ الوداع'' کے طور پر منایا جاتا

ہے اور اس کے لیے جمعے کے خطبے میں ''اَلْوَداعُ الْوَداعُ یا شھرَ رمضانَ'' کے کلمات بھی پڑھے جاتے ہیں یا نعت خوان جمعہ کی نماز کے بعد یا رمضان مبارک کے آخری دن ''الوداع اے ماہِ رمضان'' کی طرز کے اشعارِ نعت یا نوحہ کی صورت میں پڑھتے ہیں۔ اس کی شریعت مبارکہ اور سنتِ نبویہ میں کوئی اصل نہیں ہے۔ امام احمد رضا قادری قُدِسَ سِرّہٗ العزیز سے سوال کیا گیا: ''(۱) رمضان المبارک میں نبی کریم احمد مجتبیٰ محمد مصطفی ﷺ نے ''خطبۃ الوَداع'' پڑھا ہے یا نہیں؟۔ (۲) اگر حضور محمد رسول اللہ ﷺ نے نہیں پڑھا ہے، تو سب سے پہلے خطبۃ الوَداع کس نے پڑھا ہے اور اس کا مُوجِد ومُختَرِع (اختراع کرنے والا) کون ہے؟، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یا ائمۂ مجتہدین وفقہاء ومُحدِّثین رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (۳) شریعتِ مُقدّسہ مُطَہّرہ مُنوّرہ مُحمّدیہ حنفیہ اہلسنّت وجماعت میں خطبۃ الوَداع کا کیا درجہ ہے؟، فرض یا واجب یا سنّت یا مستحب یا مباح؟، صاف صاف مُدلّل تحریر فرمائیں۔ (۴) جس جمعۃ الوَداع کو ''خطبۃ الوَداع'' نہ پڑھا جائے، وہ جمعہ صحیح ہوگا یا نہیں؟ اور ''تارکِ ''خطبۃ الوَداع'' کس درجہ کا خاطی وگنہگار ہے، قابلِ ملامت وزَجر ہے یا نہیں؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''(۱) اَلوَداع جس طرح رائج ہے حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں۔ (۲) نہ صحابۂ کرام ومجتہدین عِظام رضی اللہ عنہم سے نہ اس کا مُوجِد معلوم۔ (۳) وہ اپنی حدِّ ذات میں مباح ہے، ہر مباح نیتِ حسن سے مستحب ہوجاتا ہے اور عروض وعوارضِ خلاف سے مکروہ سے حرام تک۔ (۴) جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے، خاص ''خطبۃ الوَداع'' کوئی چیز نہیں، اُس (خاص خطبے کے) کے ترک سے نماز پر کچھ اثر نہیں پڑسکتا، اُس کے ترک میں کچھ خلل نہیں، نہ تارِک پر زَجر وملامت رَوا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:452-451)

فتاویٰ رضویہ میں مُندرِج اس سوال میں سائل نے کتاب ''شبیہ الانسان'' کے ص:24 کے حوالے سے فارسی عبارت لکھی ہے، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے: ترجمہ: ''رمضان کے

آخری جمعہ میں حسرت وافسوس کے کلمات پڑھنا مباح ہے، لیکن اَسلاف سے منقول نہیں، ترک افضل ہے تاکہ عوام اسے واجب یا سنّت نہ بنالیں، شرط یہ ہے کہ اس میں رسالت مآب ﷺ کی نسبت جھوٹ شامل نہ ہو، ورنہ حرام ہے، اور وہ یہ ہے۔

''اکثر محمد مصطفیٰ محبوب ومطلوبِ خدا گفتے دریں حسرتا اے ماہِ رمضاں الوَداع''

یعنی'' خدا کے محبوب ومطلوب محمد مصطفیٰ ﷺ (رمضان المبارک کے آخر میں) اکثر حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے: اے ماہِ رمضاں الوداع''۔

اس کے بارے میں امام احمد رضا قادری مُحدّثِ بریلی نے لکھا: ''اِس فتوے میں جو کچھ لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے، سوائے اس لفظ کے کہ'' افضل ترک است''، اس کی جگہ یوں لکھنا چاہیے: '' التزامش نہ باید، گاہے ترک ہم کنند تاکہ عوام گمانِ وجوب واستنان نہ کردند'' (ترجمہ: اس کا التزام نہیں کرنا چاہیے، کبھی اسے ترک کردیں تاکہ عوام کو وجوب یا سنّت ہونے کا وہم نہ ہو)، فقد صرّح العُلَمَاءُ الکِرَامُ اَنَّ التَّرْکَ اَحیَانًا یُزِیلُ الاِیہَامِ (ترجمہ:'' علماءِ کرام نے تصریح کی ہے کہ بعض اوقات ترک کردینا عوام کے وہم کو زائل کر دیتا ہے)، (حوالہ مذکورہ بالا)۔ ظاہر ہے کہ اس کا التزام ہی کیا جاتا ہے اور ترک پر لوگ ملامت کرتے ہیں اور کسی مباح یا مستحب امر کے ترک پر ملامت کرنا اسے واجب کا درجہ دینا ہے اور یہ صرف اور صرف شارع علیہ الصلاۃ والسلام کا منصب ہے۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ:''مکرر الوداع شریف کوئی عمل شرعی میں نقص رکھتا ہے اور یہ عمل درست ہے یا نادرست؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا:'' الوداع کہ رائج ہے نہ کوئی شرعی حکم ہے نہ اس سے منع شرعی، ہاں! علماء اس کا التزام نہ کریں، کبھی ترک بھی کریں کہ عوام واجب سمجھنے لگیں اور سچی الوداع قلب سے ہے کہ رمضان شریف کے آنے سے خوش ہو اور جانے سے غمگین، اور اگر یہ حالت ہو کہ آنا بار تھا اور جانے کے لیے گھڑیاں گنیں تو جھوٹی الوداع ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد8، ص:454-451)

دو سال قبل پنجاب سے ایک خطیب کا فون آیا کہ مسجد کی انتظامیہ نے کہا ہے کہ اگر

الوَداع نہیں پڑھو گے تو برطرف کر دیا جائے گا، یہ جاہلانہ روش ہے، جس چیز کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، اسے لازم قرار دینا اپنی طرف سے شریعت اختراع کرنا ہے، شریعت کا تعین صرف شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اختیار ہے۔ امام اہلسنّت کے ان کلمات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ: ''سچی الوداع قلب سے ہے کہ رمضان شریف کے آنے سے خوش ہو اور جانے سے غمگین''۔ ہم نے عشق ومحبت کے سارے تقاضے اپنے قلب پر طاری کرنے اور اپنے عمل کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے خوش گلو نعت خوانوں کے سپرد کر دیے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کا جمع ہو کر'' آج رمضان کی الوداع ہے'' جیسے اشعار نعت خوانی کے انداز میں پڑھنے کی بھی کوئی اصل نہیں ہے۔ البتہ حدیثِ مبارک کی رو سے رمضان المبارک میں ایک فرض کا اجر ستر فرائض کے برابر ہے لہٰذا رمضان مبارک کے ہر جمعۃ المبارک کا اجر بقیہ سال کے ستر جمعوں کے برابر ہے۔ اس لیے پورے رمضان کی ساری عبادات کو یکساں اہتمام کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ جمعۃ الوداع یا عید الفطر کے دن کثیر تعداد میں حاضر ہوتے ہیں، وہ باقی جمعوں میں کہاں ہوتے ہیں؟۔ شریعت کی رُو سے تو رمضان مبارک کے تمام جمعوں کا اجر برابر ہے۔ مزید یہ کہ رمضان مبارک کی تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ عبادت کے ذوق وشوق کو زندگی کا لازمی حصہ بنایا جائے، اسلام کو مکمل صورت میں قبول کیا جائے، Pick & Choose کا شِعار ترک کیا جائے۔ ہاں! اگر کوئی یہ دعا کرنا چاہے کہ اے ربُّ العٰلمین! یہ سعادت زندگی میں بار بار نصیب فرما، تو یہ'' درازیِ عمر بالخیر'' کی دعا ہے اور ایسی دعائیں اور تمام مسنون دعائیں کثرت سے کرنی چاہئیں۔ امام احمد رضا قادری مُحدّثِ بریلی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عہد کے مطابق: ''خطبۃُ الوَداع یا آج ماہِ رمضان کی الوَداع ہے'' وغیرہ کلمات کے ترک کو افضل قرار دینے کی بجائے یہ لکھنے کا مشورہ دیا تھا کہ: '' اس کی جگہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ: ''التزام نہیں کرنا چاہیے''۔ لیکن اب ہمارے عہد میں جب یہ نہ پڑھنے پر خطیب کو برطرف کرنے کی دھمکی دی جانے لگے اور لوگ خوش گلو نعت خوانوں کے ساتھ

اسے خصوصی اجر کا باعث سمجھ کر پڑھنے لگیں، تو پھر یہ کہنا لازم ہوگا کہ اس شِعار کو ترک کرنا ہی افضل ہے، کیونکہ ہمارے ہاں بدعتِ حسنہ کے نام پر اب شریعت پر زیادات کا رواج بڑھتا جارہا ہے اور ہم حسنِ نیت کی بنا پر دین میں شامل کی گئی ہر نئی بات پر اُس کی اباحت یا جواز کی بات کریں گے تو عوام اسے اَمرِ مشروع اور وسیلۂ اجر ہی سمجھیں گے۔ ہمارے علم میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ہے کہ کسی نے پڑھتے وقت اپنی شرعی ذمے داری پوری کرتے ہوئے عوام کو آگاہ کیا ہو کہ یہ شِعار قُرونِ اُولیٰ ''مَشْهُودلَهَا بِالْخَيْر'' یعنی عہدِ رسالت مآب ﷺ، عہدِ صحابۂ کرام، عہدِ تابعین وتبعِ تابعین عِظام بلکہ اُس کے بعد کے مُتصل ادوار سے بھی ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کا التزام نہیں کرنا چاہیے تاکہ عوام میں کسی بھی درجے میں اس کے لزومِ شرعی ہونے کا وہم پیدا نہ ہو۔

امام احمد رضا قادری کا حوالہ گزر چکا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''یہ اپنی حدِ ذات میں مباح ہے''۔

جب رسول اللہ ﷺ نمازِ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے، تو وہ آپ کے عہدِ مبارک میں قرآن مجید کی نازل شدہ آیات کے ابلاغ اور احکامِ شرعیہ کی تبلیغ کا مؤثر ذریعہ تھا، بعض اوقات جہادی مہمات کی تشکیل بھی اس موقع پر ہوتی تھی۔ خلفائے راشدین بھی اپنے خطبات میں امت کے اجتماعی معاملات اور ریاستی امور کے بارے میں ہدایات جاری فرماتے، یہ موجودہ دور میں امریکا کے ''اسٹیٹ آف دی یونین ایڈریس'' سے ملتی جلتی صورت تھی۔ فرق یہ ہے کہ اسلام میں حکومت اور نظمِ اجتماعی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق کی بجا آوری کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ آج کل جمعۃ المبارک کے خطبات احکامِ شریعت کی تبلیغ کا ذریعہ ہیں۔

اصل مسنون تو عربی خطبہ ہے، جو عہدِ نبوت سے توارُث اور تسلسُل کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ لیکن چونکہ سب لوگ عربی نہیں جانتے، اس لیے ہمارے عجمی ممالک میں تبلیغ کے لیے اردو میں خطاب کیا جاتا ہے اور خطبۂ مسنونہ سنتِ رسول کی اِتباع میں عربی میں دیا جاتا

ہے،اس سلسلے میں خطبائے کرام بھی اپنی اداؤں پر غور فرمائیں اور خطباتِ جمعہ کو تعلیمِ دین کا ذریعہ بنائیں، ہر جمعۃ المبارک کے خطاب میں چند شرعی مسائل بھی بیان فرمایا کریں۔ اگر وہ روایتی انداز کے مسلکی امتیازات وتخصُّصات پر مشتمل رٹی رٹائی تقاریر کا سلسلہ جاری رکھیں گے، تو ایک وقت آتا ہے کہ لوگ اکتا جاتے ہیں اور ایسے ماحول میں صرف چند بزرگ یا روایتی سامعین ہی دستیاب ہوتے ہیں۔

اگر ہمارے خطبائے کرام لوگوں کو روزمرہ اور عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل پر بات کریں، دینی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ان کی دینی معلومات میں اضافہ کریں، ان کے سامنے حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ دینی مسائل کی تطبیق کریں اور اخلاقی واصلاحی امور پر جامع، مفصل اور مدلّل انداز میں گفتگو کریں، تو ہمارا تجربہ ہے کہ لوگ سننے کے لیے بھی آتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان زیرِ بحث موضوع پر غور بھی کرتے ہیں، ان کے ذہنوں میں جو اِشکالات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا بھی اظہار کرتے ہیں اور اس طرح مثبت اور تعمیری انداز میں ربطِ باہمی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں پر کوئی بات مسلط نہ کی جائے بلکہ دلیل اور استدلال سے انہیں قائل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ترجمہ:''(لوگوں کو) اپنے رب کے راستے (یعنی دین) کی طرف حکمت اور پُرتاثیر نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور جہاں بحث یا مکالمہ کرنا پڑے تو احسن طریقے سے کرو''۔(نحل:125)

02 اگست 2015ء

مفتی منیب الرحمٰن

رئیس دارالافتاء، دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

مفتی محمد ابراہیم قادری ان الفاظ سے تائید کرتے ہیں:

مجھے اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت کے ان جملوں سے مکمل اتفاق ہے:

1۔اَلوَدَاع جس طرح رائج ہے حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں ہے، نہ صحابۂ کرام

ومجتہدین عِظام رضی اللہ عنہم سے نہ اس کا مُوجِد معلوم۔

2۔وہ اپنی حدِ ذات میں مباح ہے، ہر مباح نیتِ حسن سے مستحب ہوجاتا ہے اور عروض وعوارضِ خلاف سے مکروہ سے حرام تک۔

3۔ جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے، خاص ''خطبۃُ الوَدَاع'' کوئی چیز نہیں۔

4۔اس کا التزام نہیں کرنا چاہیے، کبھی اسے ترک کردیں تاکہ عوام کو وجوب یا سنت کا وہم نہ ہو۔

یہ چاروں جملے انتہائی محتاط اور مضمون کی ادائیگی میں بہت نپے تلے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عامۃ الناس، ایک امر مباح میں جب وہ عام ہوجائے اور اس میں ان کی دلچسپی بہت بڑھ جائے، اِفراط وتفریط کا شکار ہوجاتے ہیں، عُلماء کو چاہیے کہ وہ اس روش کے ازالے کے لیے کبھی کبھار ایسے اُمورِ مباحہ کو ترک کردیا کریں، جیسا کہ امام اہلسنّت کا فرمان جملہ میں درج کردیا گیا ہے لیکن انتہائی معذرت کے ساتھ عامۃ الناس کو کسی امر میں غلو سے روکنے کے لیے بھی غلو نہیں کرنا چاہیے کہ یہ بھی افراط وتفریط کے زمرے میں آتا ہے، ایسی تحذیرات سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ کام حرام ہے، اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔ ھٰذا ما عندی و العلم عند اللہ تعالٰی۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ عوام کو یہ مشورہ دیا جائے کہ اسے کبھی ترک کردیا جائے تاکہ وجوب وسنّت کا وہم نہ ہو۔

15، ستمبر 2015ء

مفتی محمد ابراہیم قادری

مفتی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ جہاں یہ چیزیں رائج ہوجائیں، وہاں لوگ اَحیاناً بھی اس کے ترک پر آمادہ نہیں ہوتے، پنجاب کے خطیب کا حوالہ گزر چکا ہے۔

غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر الجیلانی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: ''اے رمضان کے مہینے، تجھ پر سلام!، اے ایمان کے مہینے، تجھ پر سلام!، نزولِ قرآن وتلاوت کے مہینے، تجھ

پر سلام!، ماہِ انوار تجھ پر سلام!، ماہِ بخشش و مغفرت، تجھ پر سلام!، درجات جنت کے حصول اور دوزخ کے طبقات سے نجات کے مہینے، تجھ پر سلام!، اے عابدوں اور توبہ کرنے والوں کے مہینے، تجھ پر سلام!، اہلِ معرفت کے مہینے، تجھ پر سلام!، اے عارفوں کے مہینے، تجھ پر سلام!، اے امن و امان کے مہینے، تجھ پر سلام!، سلام ہو ان قندیلوں اور روشن چراغوں پر، سلام ہو ان آنکھوں پر جو بیدار رہتی ہیں، سلام ہو ان آنکھوں پر جو بہتی رہتی ہیں، سلام ہو ان محرابوں پر جو روشن اور منور ہیں، سلام ہو قطرہ قطرہ بن کر گرنے والے آنسوؤں پر، سلام ہو سوختہ دلوں سے نکلنے والی آہوں پر۔ الٰہی! ہمیں بھی ان ان لوگوں میں شامل فرما جن کے روزے اور نمازیں تو نے قبول فرمائی ہیں اور جن کی برائیوں کو تو نے نیکیوں سے بدل دیا ہے اور جنہیں تو نے اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمایا اور ان کے مراتب بلند فرمائے، یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ!''۔ (غنیۃ الطالبین (اردو) ص: ۴۸۸، شبیر برادرز، لاہور، ۱۴۳۲ھ)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا: ''محبوب سبحانی غوث الصمدانی نے غنیۃ الطالبین میں حنفیہ کو گمراہ فرقہ میں مندرج فرمایا ہے، الیٰ آخرہٖ''۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں جو کچھ لکھا، اُس کا خلاصہ یہ ہے: ''غنیۃ الطالبین'' حضرت محبوب سبحانی ہی کی تصنیف ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو حضرت محبوب سبحانی کی طرف منسوب کرنے کو صحیح نہیں جانا، جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ آپ نے اُن کا رد فرمایا اور سوال کا جواب یہ دیا: ''غنیۃ الطالبین میں بعض عبارات الحاقی ہیں، جیسا کہ ''فتاویٰ حدیثیہ'' میں علامہ ابن حجر مکی نے لکھا ہے''۔ امام اہلسنت رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''امام غزالی اور شیخ محی الدین ابن عربی اور عبدالوہاب شعرانی کی کتابوں میں بھی حاسدین نے الحاق کیے ہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 29، ص 222 تا 224)

لیکن امام اہلسنّت نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ اُن کے نزدیک الحاقی عبارات کون سی ہیں؟۔ ''خطبۃ الوداع'' کے بارے میں اُن کا موقف پیچھے بیان ہو چکا ہے، جو

یہ ہے:

''(۱) اَلوَدَاع جس طرح رائج ہے حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں۔

(۲) نہ صحابۂ کرام ومجتہدینِ عظام رضی اللہ عنہم سے، نہ اُس کا مُوجِد معلوم۔

(۳) وہ اپنی حدِ ذات میں مباح ہے، ہر مباح نیتِ حسن سے مستحب ہوجاتا ہے اور عروض وعوارضِ خلاف سے مکروہ سے حرام تک۔

(۴) جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے، خاص ''خطبۃُ الوَدَاع'' کوئی چیز نہیں، اُس (خاص خطبے) کے ترک سے نماز پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا، اُس کے ترک میں کچھ خلل نہیں، نہ تارِک پر زَجر وملامت رَوَا''۔ (فتاوی رضویہ، جلد 8، ص:452-451)

امامِ اہلسنّت امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ حضور غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر الجیلانی رضی اللہ عنہ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ سو اگر ''خطبۃ الوداع'' کے بارے میں امام اہلسنّت کے نزدیک حضور غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر الجیلانی رضی اللہ عنہ کے جمعۃ الوداع کے بارے میں ''غنیۃ الطالبین'' میں درج عبارت کی کوئی مستند اساس ہوتی، تو وہ ضرور اس کا حوالہ دیتے، لیکن آپ نے سَلَفِ صالحین سے اس کی مطلقاً نفی فرمائی ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے دینی امور سے اُن کی روح نکال کر رسمی حیثیت دے دی جاتی ہے، جیسے گزشتہ چند سالوں سے ٹیلی ویژن چینلز پر اور مجالس میں خوش گلو نعت خواں ''میری توبہ قبول ہو'' پر مشتمل اشعار پڑھ کر سب کی توبہ سے فارغ ہوجاتے ہیں، حالانکہ توبہ نعت خوانی کے انداز میں اشعار پڑھنے کا نام نہیں ہے، بلکہ توبہ ایک مربوط قلبی اور روحانی عمل کا نام ہے، جو یہ ہے:

(الف) بندۂ مومن اپنی معصیتوں اور گناہوں کا اللہ تعالیٰ کے حضور اقرار کرے۔

(ب) پھر اُن پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نادم وشرمسار ہو۔

(ج) پھر شریعت نے اُن کی تلافی کی جو صورتیں تعلیم فرمائی ہیں، اُن کے مطابق اُن کی تلافی

کرے،مثلاً:

(1) جتنی قضا نمازیں اُس کے ذمے باقی ہیں تو اُن کی قضا پڑھے۔

(2) ماضی کے کئی سالوں کی زکوٰۃ اُس کے ذمے ہے تو ادا کرے۔

(3) روزے چھوٹ گئے ہیں تو اُن کی قضا رکھے۔

(4) بندوں کا حق غصب کیا ہے تو انہیں واپس کرے اور اُن سے معافی مانگے۔

(5) دیگر شعبوں میں بھی تلافی کی جو صورتیں شریعت نے مقرر کی ہیں، اُن کو اختیار کرے۔

(6) پھر اللہ تعالیٰ سے عہد کرے کہ آئندہ وہ ان گناہوں کا اعادہ نہیں کرے گا۔

(7) پھر اللہ تعالیٰ سے اس پیمان پر قائم رہنے کی توفیق مانگے۔

ان اصولوں کی روشنی میں ہر مسلمان خلوت میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرے اور توبہ اور استغفار کرے، البتہ جو گناہ کسی نے عَلانیہ کیے ہوں تو اُسی فورم پر اُن سے رجوع کرے اور عمومی استغفار کے علاوہ جو گناہ تعیین کے ساتھ اُسے یاد ہوں، اُن کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔ مُعیّن گناہوں کے لیے عمومی توبہ کافی نہیں ہے۔

علامہ مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''توبہ کے متعلق مطلقاً شریعت کا قانون یہ ہے کہ جو گناہ بالاعلان کیا جائے، اس کی توبہ بھی بالاعلان کی جائے گی اور جو گناہ چھپ کر کیا جائے، اس کی توبہ چھپ کر بھی کی جاسکتی ہے۔ حدیث میں فرمایا: ''اِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَاَحْدِثْ عِنْدَهَا تَوْبَةً اَلسِّرَّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِيَةَ بِالْعَلَانِيَةِ''۔ ترجمہ: ''یعنی جب تم سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرلو، پوشیدہ گناہ کے لیے پوشیدہ توبہ کافی ہے اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ کرنی ہوگی''۔ (الجامع الصغیر للسیوطی، المجلد الاول ص: 117، دار الفکر، بیروت)

(وقار الفتاویٰ، جلد: سوم، ص: 26، ناشر: بزمِ وقار الدین، کراچی)

تائید و توثیق و تصویب مفتیانِ عظام بابت فتویٰ: ''جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت''

نمبر شمار	اسمائے گرامی	مدرسہ/دارالعلوم/جامعہ
1	علامہ مفتی محمد اسماعیل رضوی ضیائی	شیخ الحدیث و مفتی دارالعلوم امجدیہ، عالمگیر روڈ، کراچی
2	علامہ مفتی محمد رفیق حسنی	مہتمم و مفتی، شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم گلستانِ جوہر، کراچی
3	علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی	مہتمم و مفتی و استاذ حدیث جامعہ نضرۃ العلوم گارڈن، کراچی
4	مفتی محمد جان نعیمی	مہتمم دارالعلوم مجددیہ نعیمیہ صاحبداد گوٹھ، ملیر کراچی
5	علامہ مفتی محمد اسماعیل نورانی	مفتی و من کبار الاساتذہ جامعہ انوار القرآن، بلاک 5 گلشن اقبال، کراچی
6	حافظ محمد عبدالستار سعیدی	شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور
7	علامہ مفتی محمد تنویر القادری	مفتی جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور
8	حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی ضیائی	ناظم تعلیمات دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

رخصتِ رمضان کی اباحت، افضلیت اور وجوب کا بیان

سوال:

اس سال کراچی میں رمضان المبارک کے ابتدائی ایام میں ہلاکت خیز گرمی پڑی اور بجلی کے بحران نے اس کی شدت میں دوگنا بلکہ سہ گنا اضافہ کر دیا اور اخبارات کی رپورٹ کے مطابق سینکڑوں افراد گرمی کی تاب نہ لاتے ہوئے لقمۂ اجل بنے اور اُن میں روزے دار بھی شامل ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے حالات میں روزہ توڑنے کا شرعی حکم کیا ہے؟، (سید شفاعت علی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آیات 184 و 185 میں دو مرتبہ فرمایا: ''بیمار اور مسافر (کے لیے عذر کی بنا پر رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، لیکن بعد میں) دوسرے دنوں میں (چھوٹے ہوئے روزوں کی) گنتی پوری کرنا ہوگی (یعنی ان روزوں کی قضا رکھنی ہوگی)''۔

آیت 185 میں یہ بھی فرمایا: ''(اس رخصت کی حکمت یہ ہے کہ) اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ دشواری نہیں چاہتا''، نیز آیت: 184 میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ مشورہ دیا: ''(اگرچہ مسافر اور بیمار کو قضا کی شرط کے ساتھ رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت دی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود) اگر تم روزہ رکھ لو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے''۔

عام حالات میں یہ رخصت قائم رہے گی:

(۱) ''حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی: میں سفر میں روزہ رکھتا ہوں اور وہ کثرت سے روزہ رکھنے والے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہیں اختیار ہے چاہو تو روزہ رکھو اور چاہو تو چھوڑ دو''۔ (بخاری:1943)

(۲) انس بن مالک بیان کرتے ہیں: ہم (سفرِ جہاد میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر

کر رہے تھے، ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا اور بعض نے چھوڑ دیا، دونوں نے ایک دوسرے کو ملامت نہیں کیا''۔(بخاری:1947)

(۳): حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (رمضان کے دوران) ایک بھیڑ دیکھی جو ایک شخص پر سایہ کیے ہوئے تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: (ایسی حالت میں) سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے''۔(بخاری:1946)

(۴) حضرت انس بیان کرتے ہیں: ہم (رمضان کے دوران) ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ہم میں سے بعض روزے سے تھے اور بعض نے روزہ نہیں رکھا تھا، ہم نے ایک گرم مقام پر پڑاؤ ڈالا، روزے دار تو نڈھال ہوکر گر پڑے، جنہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا، وہ اٹھے، انہوں نے خیمے تانے اور جانوروں کو پانی پلایا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج روزہ نہ رکھنے والے ثواب کمانے میں سبقت لے گئے''۔(مسلم:2617)

(۵) حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں:''رسول اللہ ﷺ (غزوۂ فتح مکہ کے موقع پر) مدینۂ منورہ سے مکہ مکرمہ کے سفر پر تھے، جب آپ ''عُسفان'' کے مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے پانی منگایا، اپنا ہاتھ بلند کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں، پھر آپ نے روزہ توڑ دیا، یہاں تک کہ آپ مکہ مکرمہ پہنچ گئے''۔(بخاری:1948)

اس سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں سفر کے دوران رمضان کا روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے اور سازگار حالات میں اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھنے کو بہتر قرار دیا ہے، لیکن جہاد کے موقع پر چونکہ مجاہد کو مستعد، چاق و چوبند اور تازہ دم رہنا پڑتا ہے، کیونکہ کسی بھی وقت دشمن کے ساتھ ٹکراؤ کی نوبت آسکتی ہے، اس لیے جب مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے روزہ چھوڑنے کو افضل قرار دیا اور غالباً صحابۂ کرام کو آپ کی زبانی اجازت کے باوجود روزہ توڑنے پر تردد ہوگا، تو آپ نے (ایک روایت کے مطابق) عصر کے بعد علانیہ روزہ توڑا تاکہ صحابۂ کرام کو روزہ توڑنے میں کوئی تردد نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کے موقع پر روزہ نہ رکھنا یا توڑنا افضل ہے۔

اس سال کراچی میں گرمی نا قابلِ برداشت ہوگئی اور دو ہزار سے زیادہ اموات گرمی کے سبب واقع ہوئیں، اسے ''ہیٹ اسٹروک'' کا نام دیا گیا، یعنی کثرت سے پسینہ بہہ جانے کی وجہ سے انسانی جسم میں پانی اور نمکیات کی کمی واقع ہو جاتی ہے، جسے طبی زبان میں Dehideration کہتے ہیں۔تو ہماری رائے میں ایسے حالات میں جب کسی شخص کے لیے بیماری کے خطرناک مہلک بن جانے یا روزے دار کی جان تلف ہونے کا ظنِ غالب ہو جائے تو روزہ توڑنے یا چھوڑنے کی شرعی رخصت پر عمل واجب سمجھا جائے، کیونکہ اس کی تائید میں احادیثِ مبارکہ بھی موجود ہیں اور ائمۂ مجتہدین اور فقہاءِ امت کے اقوال بھی موجود ہیں۔ روزہ توڑنے کی صورت میں صرف قضا لازم ہوگی، کفارہ لازم نہیں ہوگا۔اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عَلَیکُمْ بِرُخْصَةِ اللهِ الَّذِیْ رَخَّصَ لَکُمْ

ترجمہ:'' اللہ نے تمہارے لیے جو رخصت دی ہے، اُس رخصت پر عمل کرنا تم پر واجب ہے''۔(صحیح مسلم:1115)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ یَقْبَلْ رُخْصَةَ اللهِ کَانَ عَلَیْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلُ جِبَالِ عَرَفَةَ۔

ترجمہ:''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت کو قبول نہیں کیا، اُس کو میدانِ عرفات کے پہاڑوں کے برابر گناہ ہوگا''۔(مسند احمد بن حنبل:5392)

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ یُحِبُّ اَنْ تُوْتٰی رُخَصُه، کَمَا یَکْرَهُ اَنْ تُوْتٰی مَعْصِیَتُهُ۔

ترجمہ:'' بے شک اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی معصیت کو ناپسند فرماتا ہے، اسی طرح اپنی دی ہوئی رخصت پر عمل کرنے کو پسند فرماتا ہے''۔(مسند احمد بن حنبل:5866)

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ تنویر الابصار مع الدر المختار کی شرح میں لکھتے ہیں:

بِمَا لَيْسَ فِيْهِ خَوْفُ هَلَاكٍ، وَإِلَّا وَجَبَ الْفِطْرُ۔

ترجمہ:''اگر روزہ رکھنے کی صورت میں ہلاکت کا اندیشہ ہو،تو روزہ توڑنا واجب ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد6، ص:356، دارالثقافہ والتراث، دمشق)

علامہ علاؤالدین ابوبکر کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَرُوِيَ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ۔۔۔ وَالْمُبِيْحُ الْمُطْلَقُ بَلِ الْمُوْجِبُ هُوَالَّذِيْ يَخَافُ مِنْهُ الْهَلَاكُ لِأَنَّ فِيْهِ إِلْقَاءَ النَّفْسِ إِلَى التَّهْلُكَةِ لَا لِإِقَامَةِ حَقِّ اللهِ تَعَالٰى وَهُوَ الْوُجُوْبُ، وَالْوُجُوْبُ لَا يَبْقٰى فِيْ هٰذِهِ الْحَالَةِ وَإِنَّهُ حَرَامٌ فَكَانَ الْإِفْطَارُ مُبَاحًا بَلْ وَاجِبًا۔

ترجمہ:''امام ابوحنیفہ سے روایت ہے :اور (عذر کی بنا پر) روزے کو توڑنے کی مُطلق اباحت بلکہ وجوب اُس صورت میں ہے کہ روزے دار کی ہلاکت کا اندیشہ ہو، کیونکہ اس میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے،اللہ کے حق کو قائم رکھنے کے لیے نہیں جو کہ واجب ہے،اس حالت میں روزے کا وجوب باقی نہیں رہتا اور یہ حرام ہے،تو ایسی صورت میں روزہ توڑنا مباح بلکہ واجب ہوگا''۔(بدائع الصنائع،جلد ثانی،ص:142،مرکز اہلسنت برکات رضا)

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

وَنَحْنُ نَقُوْلُ: إِنَّ زِيَادَةَ الْمَرَضِ وَامْتِدَادَهُ قَدْ يُفْضِيْ إِلَى الْهَلَاكِ، فَيَجِبُ الْاِحْتِرَازُ عَنْهُ۔

ترجمہ:''اور ہم کہتے ہیں: بیماری کی زیادتی اور اس کا لمبا ہونا کبھی ہلاکت کا سبب بنتا ہے، تو اس سے بچنا واجب ہے''۔(ہدایہ،جلد ثانی،ص:119،مکتبۃ البشریٰ،کراچی)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وَإِنْ غَلَبَ الظَّنُّ الْهَلَاكَ بِسَبَبِ الصَّوْمِ أَوِ الضَّرَرَ الشَّدِيْدَ كَتَعْطِيْلِ حَاسَّةٍ مِنَ الْحَوَاسِّ وَجَبَ الْفِطْرُ۔

ترجمہ:''اور اگر روزے کے سبب ہلاکت کا غالب گمان ہو یا شدید تکلیف جیسے کسی حس کا معطل ہونے کا گمان ہو تو اس صورت میں روزہ توڑنا واجب ہے''۔وہ مزید لکھتے ہیں:

''وَلِلْفُقَهَاءِ آرَاءٌ فِيْ فِطْرِ الْمَرِيْضِ: فَقَالَ الْحَنَفِيَّةُ وَالشَّافِعِيَّةُ اَلْمَرِيْضُ يُبِيْحُ الْفِطْرَ،

وَقَالَ الْحَنَابِلَةُ: يُسَنُّ الْفِطْرُ حَالَةَ الْمَرَضِ وَيُكْرَهُ الصَّوْمُ وَقَالَ الْمَالِكِيَّةُ: يَخَافُ الْهَلَاكُ مِنَ الْمَرَضِ اَوْلِضُعْفٍ، اِنْ صَامَ فَالْفِطْرُ وَاجِبٌ''۔

ترجمہ:''بیماری کی حالت میں روزہ توڑنے کے بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں: حنفیہ اور شافعیہ کا قول ہے: ایسی صورت میں روزہ توڑنا مباح ہے، حنابلہ نے کہا: ایسی صورت میں روزہ توڑنا سنت ہےاور رکھنا مکروہ ہے۔اور مالکیہ نے کہا: اگر بیماری یا ضعف کے سبب روزہ رکھنے کی صورت میں ہلاکت کا اندیشہ ہو،تو روزہ توڑنا واجب ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ،جلد:3،ص: 1698-99،دارالفکر)

رمضان المبارک کے حوالے سے چند اہم سوالات

سعودی عرب میں رمضان کا آغاز کرکے پاکستان آیا یا اس کے برعکس ہوا

سوال:(1)

سب کے علم میں ہے کہ مختلف ممالک میں رمضان المبارک اور شوال المعظم (یعنی عیدالفطر) ایک ساتھ شروع نہیں ہوتے،بعض ممالک میں کم ازکم ایک دن کا فرق ہوتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ کوئی پاکستان میں رمضان المبارک کا آغاز کرکے سعودی عرب گیا،اس کا ابھی اٹھائیسواں روزہ مکمل ہوا تھا کہ وہاں عید ہوگئی،اب وہ کیا کرے یا سعودی عرب سے رمضان کا ایک روز پہلے آغاز کرکے پاکستان آگیا اور اس کے تیس مکمل ہوگئے،لیکن ابھی رمضان جاری ہے،اگر روزہ رکھتا ہےتو اس کے 31 دن ہوجائیں گے اور روزہ چھوڑ دیتا ہے،جبکہ وہاں تیسواں روزہ ہےتو کیا رمضان المبارک کی بےحرمتی نہیں ہوگی؟۔

(محمد ناصر چشتی،تونسہ شریف)

جواب:(1)

اس کے لیے ہمیں قرآن وحدیث سے یہ رہنمائی ملتی ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ

ترجمہ:''سو تم میں سے جو (عاقل وبالغ) شخص اس ماہِ (رمضان) کو پائے،تو اس پر لازم

ہے کہ اس کے روزے رکھے''۔(البقرہ:185)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلصَّومُ یَومَ تَصُومُونَ وَالفِطرُ یَومَ تُفطِرُونَ، وَالاَضحٰی یَومَ تُضَحُّونَ۔

ترجمہ:''جس دن لوگ روزہ رکھیں، اُس دن (سب پر) روزہ ہے اور جس دن لوگ عید الفطر منائیں، اُس دن (سب کے لیے) عید ہے اور جس دن لوگ عید الاضحیٰ منائیں، اس دن سب کی عید الاضحیٰ (اور قربانی) ہے''۔اس حدیث کے ذیل میں علامہ محمد بن عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں:''بعض اہلِ علم نے کہا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ روزہ اور عید جماعتِ مسلمین کے ساتھ ہوگی''۔(ترمذی:697)

اس حدیث کی رو سے جو شخص سعودی عرب میں رمضان کا ایک دن پہلے آغاز کر کے پاکستان آیا اور اس کے تیس روزے پورے ہو چکے تھے، لیکن اگلے دن یہاں تیسواں روزہ تھا، اس کے حق میں رمضان 31 دن کا ہو جائے گا، کیونکہ اس کے لیے یہاں شہودِ شہر (ماہِ رمضان کا پایا جانا) ثابت ہے اور جماعتِ مسلمین کا روزہ بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّیَّةٌ لَا نَکْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ، اَلشَّھْرُ ھٰکَذَا وَھٰکَذَا، یَعْنِی مَرَّةً تِسْعَةً وَعِشْرِیْنَ وَمَرَّةً ثَلَاثِیْنَ۔

ترجمہ:''ہم اُمی قوم ہیں، لکھت پڑھت اور حساب نہیں کرتے، آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے دو بار اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: (قمری) مہینہ کبھی 29 دن کا ہوتا ہے اور کبھی 30 دن کا، (بخاری:1913)''۔رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلام سادہ دین ہے، ہر دور کے لیے اور ہر علمی سطح کے لوگوں کے لیے ہے، خواہ وہ فلکیات اور علم الحساب کے ماہر ہوں یا نہ ہوں۔ لہٰذا قمری مہینہ زیادہ سے زیادہ تیس دن کا ہوتا ہے اور جدید علمِ فلکیات بھی اس کی تائید کرتا ہے، لہٰذا تیس روزے مکمل ہونے پر وہ روزہ چھوڑ سکتا ہے، لیکن اسے مقامی حالات کے مطابق احترامِ رمضان بہرحال کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ

چاہے تو پہلے آپشن کو اختیار کرتے ہوئے روزہ رکھ سکتا ہے اور اس موقف کے دلائل زیادہ قوی ہیں۔ لیکن اگر اس کے انتیس روزے ہوئے تھے کہ یہاں عید ہوگئی، تو اس کے لیے عید منانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ قمری مہینے کے دنوں کی کم از کم تعداد انتیس دن پوری ہوگئی۔ اس کے برعکس جب وہ پاکستان سے رمضان المبارک کا سعودی عرب سے ایک دن بعد آغاز کر کے حرمینِ طیبین گیا اور بالفرض وہاں ابھی اس کے اٹھائیس روزے مکمل ہوئے تھے کہ عید الفطر کا اعلان ہوگیا، تو اس کے لیے گنجائش ہے کہ مقامی حالات کے مطابق عید منائے اور بعد میں رمضان کے ایک روزے کے قضا کر لے، کیونکہ رمضان کم از کم انتیس دن کا ہوتا ہے۔

ممتاز فقیہ علامہ نور اللہ بصیر پوری سے اسی طرح کا سوال ہوا:

''ایک شخص سعودی عرب سے عید کا اعلان سن کر پاکستان آیا اور یہاں اس دن انتیسویں شب رمضان تھی، تو وہ کیا کرے؟''۔ اُنہوں نے جواب میں لکھا: ''صحیح یہ ہے کہ مُوافقت روزہ لازم ہے، کیونکہ جماعت مسلمین جب اکثریت میں ہوں اور اپنے طور پر حسبِ دستور شرع رمضان پاک یا عید قربان منا رہے ہوں، پھر انہوں نے استدلال میں یہی حدیث لکھی: اَلْفِطْرُ یَوْمَ یُفْطِرُ النَّاسُ وَالْاَضْحٰی یَوْمَ یُضَحِّی النَّاسُ یعنی ''جس دن مقامی مسلمانوں کی اکثریت عید الفطر منائے، اس دن عید مناؤ اور اسی طرح ان کے ساتھ عید الاضحیٰ مناؤ''۔ اس کے بعد انہوں نے احادیث مبارکہ کے مزید حوالہ جات لکھے ہیں، (فتاویٰ نوریہ، جلد دوم، ص:273-271)''۔ شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی نے بھی شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحہ:50-49 میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور ان کی جامع تحقیق کا ماحصل بھی یہی ہے اور ہم نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

معروف فقیہ مفتی رشید احمد صاحب سے سوال ہوا:

''اگر کسی نے رمضان کا چاند دیکھ کر قاضی کے ہاں شہادت دی، مگر قاضی نے اس کی شہادت قبول نہ کی اور اس نے اپنی رُؤیت کی بنا پر روزہ رکھ لیا اور پھر تیس روزے پورے

ہونے پر بھی رُؤیت نہ ہوئی، تو یہ شخص اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا یا صرف تیس روزے رکھ کر چھوڑ دے گا؟''۔اُنہوں نے جواب میں لکھا:''یہ شخص اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا اور دوسروں کے ساتھ عید کرے گا(ص:433)''۔اور آگے حوالہ جات بھی دیے ہیں۔میں نے اپنے عہد کے ممتاز فقیہ مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب سے بھی اس مسئلے میں مشاورت کی، اُنہوں نے بھی اس موقف سے اتفاق کیا۔

شبِ قدر کی برکات

سوال:(۲)

شب قدر دنیا کے مختلف ممالک میں بعض اوقات ایک دن کے فرق کے ساتھ واقع ہوتی ہے،تو اس کے لیے قرآن وحدیث میں جو برکات مقدر ہیں، وہ کس تاریخ کے مطابق ہوگی؟۔(محمد ناصر خان چشتی،تونسہ شریف)

جواب:(2)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ فِی الْجُمُعَةِ لَسَاعَةً لَا یُوَافِقُهَا مُسْلِمٌ یَسْاَلُ اللهَ عَزَّوَجَلَّ فِیهَا خَیْرًا اِلَّا اَعْطَاهُ اِیَّاهُ، قَالَ: وَهِیَ سَاعَةٌ خَفِیْفَةٌ۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جمعہ کے دن ایک قبولیتِ(دعا) کی ساعت ہے، جو(خوش نصیب)مسلمان دعا کرتے ہوئے اس گھڑی کو پالے، اللہ تعالیٰ اس کی مراد پوری فرمادیتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ خفیف(یعنی مختصر سی) ساعت ہے،(مسلم: 1966)''۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اس ساعتِ قبولیت کو عصر کے وقت کے اختتام پر تلاش کرو''۔(سنن ابی داؤد:1044)

خفیہ رکھنے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے شوقِ دعا اور ذوقِ طلب کو ظاہر فرمانا چاہتا ہے کہ کون ہے جو اس قبولیت کی گھڑی کو پانے کے لیے سارا دن یا دن کا زیادہ تر وقت دعا میں مشغول رہتا ہے۔اس ساعتِ قبولیت کے بارے میں کئی اقوال ہیں:

(الف)''یہ کہ امام کے منبر پر(خطبے کے لیے) بیٹھنے کے وقت سے لے کر اختتامِ نماز تک

ہے''۔(ابوداؤد:1045)

(ب)''یہ جمعہ کے دن آخری ساعت ہے''۔(ابوداؤد:1044)

ہمیں ان دونوں مواقع پر دعا میں مشغول رہنا چاہیے۔ظاہر ہے کہ پوری دنیا میں جمعہ ایک وقت میں نہیں ہوتا اور نہ ہی قدرت کے بنائے ہوئے نظامِ گردشِ لیل ونہار کی وجہ سے ایسا ہوسکتا ہے،مثلاً پاکستان میں جب جمعے کا دن ہوتا ہے،تو امریکا میں رات ہوتی ہے۔تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کو بھی محروم نہیں فرماتا،جس کے لیے جہاں جہاں اُن کے اپنے وقت اور تاریخ کے مطابق وہ ساعت آئے گی،اُس وقت وہاں پر جو اللہ کے بندے مصروفِ دعا ہوں گے،انہیں اللہ تعالیٰ کی عطا سے قبولیت نصیب ہوجائے گی۔اسی طرح شبِ قدر کی برکات وسعادات بھی روئے زمین پر تمام مسلمانوں کو اپنے اپنے مقامی حساب کے مطابق عطا کردی جائیں گی۔ہمیں اللہ تعالیٰ کی عطا اور کرم ورحمت کو محدود ومقید نہیں سمجھنا چاہیے،ورنہ بالفرض اگر رمضان المبارک کا آغاز سب جگہ ایک ساتھ ہو تب بھی کہیں دن ہوگا اور کہیں رات ہوگی۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱)وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ترجمہ:''اور میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے''۔

(اعراف:156)

(۲)اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ترجمہ:''سنو!اس کی قدرت ہر چیز پر محیط ہے''۔

(فصلت:54)

زکوٰۃ کا نصاب

سوال:

صاحب نصاب کون ہوگا۔آج کل گورنمنٹ ساڑھے باون تولہ چاندی کے حساب سے نصاب مقرر کرتی ہے،لیکن ہمارے روپے کو گولڈ کے بدلے یا مقابل اسٹیٹ بینک پرنٹ کرتا ہے۔اسلام میں ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے برابر نقدی سال بھر میں بچ جائے،اس پر زکوٰۃ فرض ہے؟،اپنے کسی کالم میں وضاحت فرما

دیں تاکہ سب کے علم میں آجائے؟۔(عبدالحق انجم)۔

جواب:

سب سے پہلے تو یہ جان لیجیے کہ یہ خیال کہ اسٹیٹ بینک میں نوٹ سونے کے محفوظ ذخائر(Reserves) کی مالیت کے برابر چھاپے جاتے ہیں، درست نہیں ہے۔ کافی زمانہ پہلے یہ روایت تھی، اب نہ ایسی کوئی روایت ہے، نہ قانونی پابندی، حتیٰ کہ امریکا اور یورپ میں بھی ایسا کوئی لازمی ضابطہ نہیں ہے، پس صرف پاکستان کی بات نہیں ہے، دنیا میں کہیں بھی یہ قانونی پابندی نہیں ہے۔ کسی ملک کی کرنسی کی قدر(Value) کامَدار اُس کی دَرآمدات (Imports)اور بَرآمدات(Exports) کے توازن پر ہے، جسے مُروّجہ معاشی اصطلاح میں ''توازنِ ادائیگی'' (Balance of Payment) کہتے ہیں، یعنی اگر کسی ملک کی بَرآمدات اس کی دَرآمدات سے زیادہ ہیں، تو توازن ادائیگی اُس کے حق میں ہے اور اُس ملک کی معیشت مستحکم ہے، کیونکہ اس سے ملک کے زَرِمبادلہ کے ذخائر (Foreign Exchang Reserves) میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کے علاوہ حکومت کے مَحاصل(Revenues) اور مَصارف (Expenditures) کے توازن پر ہے۔ ورنہ حکومت اپنے داخلی مصارف کو پورا کرنے کے لیے نوٹ چھاپتی ہے اور اس سے اس کی کرنسی کی حقیقی قدر (Value) کم ہوتی رہتی ہے۔ پیسے کی قدر کا تعیّن اُس کی قوتِ خرید سے ہوتا رہتا ہے، اسی کو افراطِ زر (Inflation) کہتے ہیں۔ دَرآمدات و برآمدات کے توازن اور بیرونی قرضوں کے بار سے عہدہ برا ہونے کے لیے مزید قرضے لینے پڑتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ملکی معیشت ڈانواں ڈول رہتی ہے۔

شریعت میں مال دار پر زکوٰۃ واجب ہے اور مال کی وہ کم از کم مقدار جس کا مالک بننے سے آدمی شریعت کی نظر میں مال دار قرار پاتا ہے، اُسے ''نصابِ زکوٰۃ'' کہتے ہیں اور زکوٰۃ کا کم از کم نصاب یہ ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

(۱)عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ زُهَیْرٌ: اَحْسَبُهُ سَمِعَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ هَاتُوْا

رُبُعَ الْعُشُوْرِ مِنْ کُلِّ اَرْبَعِیْنَ دِرْھَمًا دِرْھَمٌ وَلَیْسَ عَلَیْکُمْ شَیْئٌ حَتّٰی تَتِمَّ مِائَتَیْ دِرْھَمٍ فَفِیْھَا خَمْسَۃُ دَرَاھِمَ فَمَا زَادَ فَعَلٰی حِسَابِ ذٰلِکَ۔

ترجمہ:''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، زہیر کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات نبی ﷺ سے سن کر بیان فرمائی: یعنی ہر چالیس درہم پر ایک درہم اور تم پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی یہاں تک کہ جب دوسو درہم پورے ہوجائیں، تو ان میں سے پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہے اور جو مقدار اس سے زائد ہو اُس پر اُسی حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی''۔(سنن ابوداود:1569)

(۲)عَنْ عَلِیٍّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ فَاِذَا کَانَتْ لَکَ مِائَتَا دِرْھَمٍ وَحَالَ عَلَیْھَا الْحَوْلُ، فَفِیْھَا خَمْسَۃُ دَرَاھِمَ،وَلَیْسَ عَلَیْکَ شَیْئٌ یَعْنِیْ فِی الذَّھَبِ حَتّٰی تَکُوْنَ لَکَ عِشْرُوْنَ دِیْنَارًا، فَاِذَا کَانَتْ لَکَ عِشْرُوْنَ دِیْنَارًا وَحَالَ عَلَیْھَا الْحَوْلُ. فَفِیْھَا نِصْفُ دِیْنَارٍ. فَمَا زَادَ فَبِحِسَابِ ذٰلِکَ۔

ترجمہ:''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے پاس دوسو درہم ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ ہے اور سونے پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں ہے جب تک کہ وہ بیس دینار نہ ہو، پس جب سونا بیس دینار ہوجائے اور اس پر ایک سال گزر جائے، تو اس پر نصف دینار زکوٰۃ ہے، پھر جب سونے کی مقدار بڑھتی چلی جائے تو اُسی حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی''۔(سنن ابوداؤد:1570)

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ شریعت نے 200 درہم چاندی یا20 دینار سونے کو وجوبِ زکوٰۃ کے لیے کم ازکم نصاب قرار دیا ہے، ناپ تول کے موجودہ اَعشاری نظام(Matric System) کے اعتبار سے نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے:612.36 گرام (یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی) یا اس کی بازاری قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت جو اس کی بنیادی حاجت سے زائد ہو یا87.48 گرام (یعنی ساڑھے سات تولے سونا) یا اس کی موجودہ بازاری قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت جو اس کی حاجت سے

زیادہ ہو۔ایک تولہ کا وزن 11.664 گرام ہوتا ہے۔آج کل چاندی اور سونے کے نصاب کی مالیت میں بہت زیادہ فرق ہے۔فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگراَموال متفرق ہوں (یعنی کچھ سونا، کچھ چاندی اور کچھ مال تجارت یا نقدرقم وغیرہ) یا صرف چاندی ہو،تو ان تمام صورتوں میں چاندی کے نصاب کا ہی اعتبار ہوگا تاکہ ناداروں کو فائدہ ہو۔

نصاب کی اس تعیین کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ مال کی کم ازکم اتنی مقدار ہر گھرانے میں موجود رہے جس سے وہ بآسانی روزمرہ کی ضروریات زندگی حاصل کرسکیں اور ایسا نہ ہو کہ دوسروں کی مددواعانت کرنے سے زکوٰۃ دہندہ خودمحتاج ہوجائے،اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى

ترجمہ:''بہترین صدقہ وہ ہے جس کے(دینے کے)بعدبھی آدمی مال دار رہے''۔

(صحیح بخاری،رقم الحدیث:1426)

خلاصۂ کلام یہ کہ اگراَموال متفرق ہوں (یعنی کچھ سونا، کچھ چاندی اور کچھ مال تجارت یا نقدرقم وغیرہ) یا صرف چاندی ہو،تو چاندی کے نصاب کا ہی اعتبار ہوگااور ایسی صورت میں یہ متفرق اَموال مل کر 612.36 گرام چاندی کی مقدار یا اُس کی مساوی قیمت کو پہنچیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔بہت ممکن ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب زکوٰۃ کا کم ازکم نصاب مُقررفرمایا ہو،تو اُس وقت 200 درہم چاندی اور 20 دینار سونے کی قیمت قریب تر ہو،لیکن آج کل دونوں کی بازاری قیمت میں بہت فرق ہے۔مگر چوں کہ نصاب کی کم ازکم مقدار مقرر کرنے کا مَدار عقل پر نہیں ہے بلکہ یہ اَمر''تَعَبُّدِی'' ہے اور اس کا مَدار شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سماع پر ہے،یعنی یہ اَمرِ ''توفیقی'' ہے،اس لیے نَص (Text of Quran & Sunnah) کو قیاس کے ذریعے ترک نہیں کیا جاسکتا۔اس سال(2016ء)حکومت نے بنکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کے لیے نصاب 35,557 روپے مُقرر کیا ہے۔

صدقۂ فطر کی مقدار

سوال:
بادام، کشمش، کھجور، پستہ اور جو کا صدقۂ فطر دورِ حاضر کے مطابق روپے میں کتنی رقم بنتی ہے؟،(محمد اشرف، قصبہ کالونی کراچی)

جواب:
شریعتِ مُطہرہ نے بنیادی طور پر چار اجناس (گندم، جو، کھجور، کشمش) میں صدقۂ فطر کی ادائیگی کی مقدار مقرر فرمائی ہے، بعض روایات میں پنیر کا بھی ذکر آیا ہے۔ احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱)عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ زَكٰوةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعاً مِنْ شَعِيْرٍ، عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ، وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثٰى وَالصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَأَمَرَبِهَا أَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ۔

ترجمہ:''حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عیدالفطر کی زکوٰۃ (صدقۂ فطر) ایک صاع (تقریباً چار کلوگرام) کھجوریں یا ایک صاع (تقریباً چار کلوگرام) جَو (مسلمانوں میں سے) ہر غلام و آزاد، ہر مرد و عورت اور ہر چھوٹے، بڑے پر فرض کی ہے (اور آپ نے یہ حکم دیا کہ) لوگوں کے نمازِ عید کے لیے جانے سے پہلے اس کو ادا کر دیا جائے''۔

(صحیح بخاری:1503،سُنن ابوداؤد:1607،سُنن ترمذی:676)

(۲)عَنْ عِيَاضِ بْنِ عَبْدِ اللہِ بْنِ سَعْدِ بْنِ سَرْحٍ الْعَامِرِیِّ: أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيَّ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ يَقُوْلُ: كُنَّا نُخْرِجُ زَكَاةَ الْفِطْرِ، صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ أَقِطٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ زَبِيْبٍ۔

ترجمہ:'' عیاض بن عبداللہ بن سعد بن سرح العامری نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہم صدقۂ فطر چار کلوگرام گندم دیتے تھے یا چار کلوگرام جَو یا چار کلوگرام

پنیر یا چار کلوگرام کشمش دیتے تھے''۔ (صحیح بخاری:1506)

(۳) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ: اَمَرَ النَّبِیُّ ﷺ بِزَكَاةِ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ اَوْصَاعًا مِنْ شَعِیْرٍ، قَالَ: عَبْدُ اللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ فَجَعَلَ النَّاسُ عِدْلَهٗ مُدَّیْنِ مِنْ حِنْطَةٍ۔

ترجمہ: ''نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر چار کلوگرام کھجوریں یا اسی مقدار میں جو دینے کا حکم دیا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: پس لوگ (تقریباً) دو کلوگرام گندم کو اس کے برابر قرار دینے لگے''۔ (صحیح بخاری:1507)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَاِنَّمَا تَجِبُ صَدَقَةُ الْفِطْرِ مِنْ اَرْبَعَةِ اَشْیَاءَ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِیْرِ وَالتَّمْرِ وَالزَّبِیْبِ كَذَا فِیْ خِزَانَةِ الْمُفْتِیْنَ وَشَرْحِ الطَّحَاوِیِّ۔

ترجمہ: ''صدقۂ فطر چار اشیاء میں واجب ہے، جن میں گندم، جو، کھجور اور کشمش ہیں، جیسا کہ ''خزانۃ المفتین'' اور ''شرح الطحاوی'' میں ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:191)

فقہ حنفی کی رو سے صدقۂ فطر کی کم از کم مقدار نصف صاع گندم (یعنی دو کلوگرام) یا ایک صاع کھجور یا کشمش یا جو یا بعض روایات کے مطابق پنیر یا ان کی بازاری قیمت ہے۔ صدقۂ فطر اور فدیۂ صوم کی شرح ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ آیت:184 میں جہاں ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو دو وقت کھانا فراہم کرنا بتایا ہے، وہیں فرمایا کہ ''اگر تم اس کم از کم مقدار سے زیادہ دیدو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے''، یہ ارشاد اس ربِّ کائنات کا ہے، جس نے ہمیں نعمتِ جان اور نعمتِ مال سے نوازا ہے۔ لہٰذا اہلِ خیر سے گزارش ہے کہ کھجور یا جو یا کشمش یا پنیر کے نصاب کے مطابق فطرہ اور فدیہ ادا کریں۔ جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے وافر دولت کی نعمت سے نوازا ہے، وہ اپنے ایک دن کے اعلیٰ معیار کے مطابق روزے کا فدیہ اور صدقۂ فطر ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اے ایمان والو! اپنی کمائی میں

سے عمدہ چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور (خبردار! اللہ کی راہ میں) ناکارہ (گھٹیا) چیزوں کو دینے کا ارادہ نہ کرو، حالانکہ اگر تمہیں ایسی ناکارہ چیز دی جائے تو تم چشم پوشی کیے بغیر کبھی بھی (خوش دلی سے) اسے قبول نہ کرو، (البقرہ:267)''۔خبیث کے ایک معنی یہ ہیں: معنوی اعتبار سے ناپاک چیز اللہ کے نام پر نہ دو، یعنی ایسی چیز جو فی نفسہٖ حرام ہو یا فی نفسہٖ تو حلال ہو مگر اسے حرام طریقے سے حاصل کیا گیا ہو یا وہ کوالٹی کے اعتبار سے ناکارہ اور ناقابلِ استعمال ہو۔ زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے مال پر سال گزرنا شرط ہے، جبکہ صدقۂ فطر کے وجوب کے لیے مال پر سال یا اس کا اکثر حصہ گزرنا شرط نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر عید الفطر کے دن صبح صادق کے وقت بھی اس کے پاس مال آگیا تو اس پر صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لیے سونا چاندی یا نقد رقم یا مالِ تجارت کا بقدر نصاب ہونا شرط ہے، جبکہ صدقۂ فطر کے واجب ہونے کے لیے اگر اس کے پاس حاجت اصلیہ سے زائد دیگر چیزیں بھی جو نصابِ زکوٰۃ کی مقدار کو پہنچتی ہیں، تو اس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لیے مال کا نامی ہونا شرط ہے یعنی اس میں بڑھنے (Growing) کی استعداد موجود ہو، اس کے برعکس صدقۂ فطر کے لیے مال کا نامی (Growable) ہونا شرط نہیں ہے۔

روزے میں انجکشن لگانے کا حکم

سوال:

میں شوگر کا مریض ہوں، کیا میں روزے کے دوران انسولین لگوا سکتا ہوں؟، کمزوری کی صورت میں طاقت یا گلوکوز کا انجکشن لگوایا جا سکتا ہے؟۔ اس سے روزے پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟، (تنویر اقبال، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

روزے کے بارے میں اُصول یہ بیان کیا گیا ہے: وَقَالَ ابنُ عَبَّاسٍ وَعِكْرِمَةُ: اَلْفِطْرُ مِمَّا دَخَلَ وَلَيسَ مِمَّا خَرَجَ ترجمہ: ''حضرت ابن عباس اور عکرمہ بیان کرتے ہیں

کہ روزہ کسی چیز کے داخل ہونے سے ٹوٹتا ہے، خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا''۔

(صحیح بخاری، باب الحجامة والقئ للصائم)

ہماری تحقیق کے مطابق کسی بھی قسم کا انجکشن لگانے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے، بعض علماء کے نزدیک اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ جس مسئلے کے بارے میں قرآن وحدیث میں صریح حکم نہ ہو، وہ مسئلہ اجتہادی کہلاتا ہے، اس میں لوگوں کو جس عالم پر اعتماد ہو، اُس کے فتوے پر عمل کریں۔ اجتہادی مسائل میں فقہاء کا اختلاف ایسا ہی ہے، جس طرح ہمارے اعلیٰ عدالتی فیصلوں کا ماخذ آئین، قانون اور مُسلّمہ عدالتی نظائر (Judicial Precedents) ہوتے ہیں، لیکن بعض اوقات اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اجتہادی مسائل میں فقہاء کے اختلاف کی صورت بھی یہی ہے۔ شام کے مشہور فقیہ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

الحُقْنُ فِی الْعَضَلِ أَوْتَحْتَ الْجِلْدِ أَوْفِی الْوَرِیْدِ، وَالأَوْلیٰ عِنْدَالإِمْکَانِ تَاْخِیْرُھَا اِلَی الْمَسَاءِ، أَمَاالْحُقْنُ الشَّرْجِیَةُ فَتفطِرُ۔

ترجمہ: ''انجکشن پٹھوں میں جلد کے اندر (Inter Muscular) لگانا ہو یا رگوں میں (Inter Vein) لگانا ہو، بہتر یہ ہے کہ روزے کی حالت میں نہ لگائے اور افطار کے وقت تک انتظار کرے، اگر رگوں (Inter Vein) میں خون لگائے گا، تو روزہ فاسد ہوجائے گا''۔ (فقہ الاسلامی وادلّتہ، جلد 3، ص: 1712)

روزے میں انجکشن لگوانے سے صرف روزہ کی قضا لازم ہوگی، کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ انسولین کے بارے میں بھی ہمارا موقف یہی ہے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اِس مسئلے پر ''تبیان القرآن'' جلد اول صفحہ: 707، ''شرح صحیح مسلم، جلد اول، صفحات: 338 تا 359 اور ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثالث کے ضمیمے میں مُفصّل تحقیق بیان فرمائی ہے۔

قارِن پر جنایت کے سبب ایک یا دو دَم لازم آنے کا ضابطہ

سوال:

کیا قارِن یعنی جوشخص اپنے میقات سے بیک وقت حج اورعمرے کا احرام باندھتا ہے اور پھر وہ احرام کے اندر رہتے ہوئے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کرتا ہے، جس سے دم لازم آتا ہے، توکیا اس پر دو احرام کی وجہ سے دو دم لازم آئیں گے یا ایک ہی دم کافی ہوگا؟، اسی طرح ان امور میں جہاں بدنہ یا صدقہ لازم آتا ہے، ایک ہی بدنہ یا صدقہ کافی ہوگا یا دو دو لازم آئیں گے؟، (پروفیسر رضی الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:''حج قِران کا احرام باندھنے والے نے اگر قربانی سے پہلے حلق کرلیا (یعنی بال منڈھا دیے)، تو اس پر مذہب صحیح کے مطابق دو دَم لازم آئیں گے، ایک دمِ قِران (یعنی شکرانے کی قربانی) اور ذبح کو حلق سے مؤخر کرنے کے باعث دوسرا دَم لازم آئے گا، جیسا کہ مصنف (علامہ تمرتاشی) نے لکھا ہے، انہوں نے فرمایا: اور اس سے بعض لوگوں کا یہ وہم دور ہوگیا کہ دونوں دَم جنایت کے باعث لازم ہیں (یعنی قارن پر ایک جنایت کے باعث دو دَم لازم ہیں، کیونکہ حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ ہے، ان کا یہ سمجھنا درست نہیں ہے)''۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ترجمہ:''قارن پر دو دَم تب لازم آتے ہیں، جب اس کے عمرے کے احرام میں کوئی ایسا نقص لازم آیا ہو (جو مُوجبِ دَم ہو)، ورنہ (قارِن پر بھی) صرف ایک ہی دَم لازم آئے گا، لہٰذا جب قارِن امام سے پہلے میدانِ عرفات سے چلا گیا یا بے وضو یا حالتِ جنابت میں طوافِ زیارت کیا، تو اس پر صرف ایک دَم لازم آئے گا، کیونکہ عمرہ کا وقوفِ عرفہ اور طوافِ زیارت سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 521، باب الجنایات، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اِس مسئلے میں یہ قید لگائی ہے کہ جب قارِن نے

دس ذوالحجہ کی صبح کے بعد ذبح سے پہلے حلق کیا ہو تو ایک دَم ہو گا لیکن اگر دس ذوالحجہ کی صبح سے قبل قارن نے قربانی سے قبل حلق کرلیا تو اُس پر دو دَم ہوں گے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:
''اگر قارن نے دس ذوالحجہ کی صبح کے بعد ذبح سے قبل حلق کیا تو اسے دو جنایت قرار دینے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں۔ ہاں! اگر اس نے دس ذوالحجہ کی صبح سے قبل یہ غلطی کی تو بلاشبہ یہ عمرہ اور حج دونوں کے احرام کی جنایت ہے لہٰذا اس پر دو دَم ہوں گے اور اس وقت دو دَم ہونے میں کسی کا اختلاف متصور نہیں ہے''۔ (ارشاد الساری الی مناسک ملا علی قاری، ص:8-407)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: **مسئلہ:** ''جہاں ایک دَم یا صدقہ ہے، قارن پر دو ہیں''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:762)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''جہاں ایک دَم یا صدقہ ہے، قارن پر دو ہیں''۔ (بہارِ شریعت، حصہ ششم، ص:1162)۔ صدر الشریعہ کے موقف کی تائید صاحبِ ہدایہ (علامہ برہان الدین مرغینانی) کی اس عبارت سے ہوتی ہے: وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلَهُ الْقَارِنُ مِمَّا ذَكَرْنَا أَنَّ فِيهِ عَلَى الْمُفْرِدِ دَمًا، فَعَلَيْهِ دَمَانِ دَمٌ لِحَجَّتِهِ، وَدَمٌ لِعُمْرَتِهِ۔
ترجمہ: ''اور ہر وہ (موجبِ دَم) جنایت جو قارن سے سرزد ہو، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، اس میں مُفرِد (صرف حج کرنے والے) پر ایک دَم ہوگا اور قارن (ایک احرام کے ساتھ حج وعمرہ کرنے والے) پر دو دَم عائد ہوں گے، ایک عبادتِ حج میں جنایت کا دَم اور دوسرا عبادتِ عمرہ میں جنایت کا دَم''۔ (ہدایہ، جلد:2، ص:319، مکتبۃ البشریٰ)

علامہ علاؤ الدین حصکفی اور علامہ ابن عابدین شامی نے قارن پر دو دَم ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے جو تفصیلی بحث کی ہے، اس کی روشنی میں یہ ضابطہ بنتا ہے کہ اگر قارن نے احرام کی کسی جنایت کا ارتکاب کیا، جیسے سلا ہوا لباس پہننا، خوشبو لگانا، ناخن یا بال کاٹنا، تو اُس پر دو دَم لازم ہوں گے، کیونکہ اُس نے دو احرام کی نیت کر رکھی ہے اور یہ جنایت دونوں احرام کی مانی جائے گی، لہٰذا جزا بھی متعدد ہوں گی اور اگر قارن نے حج یا عمرہ کے کسی واجب کو ترک کیا، جیسے اُس نے حج کی سعی یا رَمی چھوڑ دی یا میدانِ عرفات سے مغرب سے

قبل چلا گیا یا حج یا عمرے کا طواف اُس نے حالتِ جُنب یا حالتِ اِحداث میں کیا، تو اُس پر ایک ہی کفارہ ہوگا، کیونکہ یہ افعال محض احرام کی جنایات نہیں ہیں بلکہ یہ تو حج یا عمرے کے واجبات میں سے کسی واجب کو ترک کرنا ہے، لہٰذا ایک جرم کی صرف ایک ہی جزا ہوتی ہے''۔ (ملخصاً از الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، ص: 546)

علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: اگر طوافِ زیارۃ یا عمرے کا طواف حالت جنابت یا بے وضو حالت میں کیا، تو اُس پر ایک جزا ہے، اس میں قارِن اور مُفرِد بالحج کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ طواف زیارۃ کی جنایت حج کے ساتھ خاص ہے، خواہ مُفرِد ہو یا قارِن اور اپنے احرام سے حلق کر کے نکل گیا ہو یا نہ نکلا ہو۔ اور طوافِ عمرہ کی جنایت صرف عمرہ کرنے والے کے لیے خاص ہے جیسا کہ اس پر کلمہ ''اَوْ'' دلالت کرتا ہے، جو کسی چیز یا کسی مسئلے کی دو قسموں (اور ان کے احکام) کو بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب قارِن نے عمرے کا طواف حالتِ جنابت میں یا بے وضو کیا اور طوافِ زیارۃ بھی ایسے ہی حال میں کیا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دو جزا لازم ہوں گی اور ماتن کے اس قول کے یہی معنی ہیں: ''اگر عمرے اور حج کا طواف حالتِ جنابت واحداث میں کرے گا، تو اس پر دو جزا ہوں گی، خواہ عمرہ اور حج الگ احرام کے ساتھ کرے یا قران کرے''۔

(ارشاد الساری الی مناسک الملا علی القاری: 407)

صاحب ہدایہ (علامہ برہان الدین علی بن ابوبکر مرغینانی)، امام احمد رضا قادری اور صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہم اللہ تعالیٰ کی عبارات سے اگرچہ بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ قارِن پر علی الاطلاق دو دَم یا دو صدقے لازم آئیں گے، خواہ جنایت کے ارتکاب کا تعلق احرام سے ہو یا حج یا عمرے کے کسی واجب کے ترک سے ہو، لیکن علامہ ابن عابدین شامی اور علامہ ملا علی القاری رحمہما اللہ تعالیٰ کی مذکورہ وضاحت کی روشنی میں ان اکابر کے اقوال کو مُطلق نہ سمجھا جائے بلکہ اس پر محمول کیا جائے کہ اگر قارِن نے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کیا ہو، جس کا تعلق احرام کے ساتھ ہو، تو اس پر دو جزائیں (دَم یا صدقہ جو بھی صورت ہو) لازم

آئیں گی اور اگر عمرے یا حج کے کسی واجب کو ترک کیا ہو تو قارِن پر صرف ایک ہی دَم ہوگا۔ یہ مسئلہ جو جنایات کے حوالے سے بیان ہوا، دَمِ قران (یعنی عمرے اور حج کی عبادت کے جمع ہونے پر شکرانے کی قربانی) اس سے الگ ہے، جو بہرحال قارِن پر واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

عمرے کا طریقہ

سوال:

عمرے کا طریقہ کیا ہے اور رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت بیان فرمائیں؟

(عبدالمجید چانڈیو، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی)

جواب:

عمرہ احرام باندھنے کے بعد چند افعال کا نام ہے، جس کا مفصل طریقہ درج ذیل ہے:

میقات سے پہلے احرام باندھے، جب احرام باندھنے کا ارادہ ہو تو پہلے غسل کرے (اگر کوئی مجبوری ہو تو وضو بھی کافی ہے)، حجامت کرائے، ناخن تراشے، بدن کی اچھی طرح صفائی کر کے احرام باندھ لے، احرام کی دو چادریں (نئی یا دھلی ہوئی سفید بہتر ہیں)، ایک اوڑھیں اور ایک تہبند کے طور پر باندھیں، سنت طریقہ یہ ہے کہ طواف کے وقت چادر داہنی بغل کے نیچے کر کے دونوں پلو بائیں مونڈھے پر ڈالیں اور طواف کے علاوہ باقی وقتوں میں عادت کے مطابق چادر اوڑھی جائے یعنی دونوں مونڈھے اور پیٹ، سینہ سب چھپا رہے۔

وقتِ مکروہ نہ ہو تو دو رکعت نماز بہ نیتِ احرام پڑھیں، پھر نیت کریں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْعُمْرَةَ فَیَسِّرْهَا لِیْ وَتَقَبَّلْهَا مِنِّیْ، نَوَیْتُ الْعُمْرَةَ وَاَحْرَمْتُ بِهَا مُخْلِصًا لِلّٰهِ تَعَالٰی۔

ترجمہ: ''اے اللہ! میں عمرہ کرنے کا ارادہ کرتا ہوں میرے لیے اسے آسان فرما اور مجھ سے اسے قبول فرما اور میں خالص اللہ کے لیے احرام باندھتا ہوں۔ پھر تلبیہ

(لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ لَبَّیْكَ لَاشَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ

لَاشَرِیْکَ لَکَ)

پڑھے اور کثرت سے چلتے پھرتے ، اٹھتے بیٹھتے پڑھتا رہے، یاد رہے کہ خانۂ کعبہ پر جب پہلی نظر پڑے تو دعا مانگے، اس وقت جو بھی دعا کرے گا، ضرور قبول ہوگی۔ حجر اسود کے سامنے پہنچے تو یہ دعا پڑھے:

لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْکَ لَهٗ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

طواف شروع کرنے سے قبل مرد اضطباع کرلے یعنی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر کہ دائیں مونڈھا کھلا رہے اور دونوں کنارے بائیں مونڈھے پر ڈال دے۔ حرم شریف پہنچنے کے بعد کعبہ کی طرف منہ کر کے حجرِ اسود کے داہنی طرف رکن یمانی کی جانب سنگِ اسود کے قریب اس طرح کھڑا ہو کہ حجرِ اسود داہنے ہاتھ کی طرف رہے، پھر طواف کی نیت کرے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ طَوَافَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ فَیَسِّرْهُ لِیْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّیْ۔

اس نیت کے بعد کعبہ کی طرف منہ کیے ہوئے اپنی دہنی جانب چلے، کانوں تک ہاتھ اٹھا کر (کہ ہتھیلیاں حجرِ اسود کی طرف رہیں) پڑھے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ۔

ممکن ہو تو دونوں ہتھیلیاں اور ان کے بیچ میں منہ رکھ کر حجرِ اسود کو بوسہ دے یا ہاتھ سے چھو کر یا اشارے سے یا لکڑی سے چھو کر بوسہ دو، اسے ''اِستلام'' کہتے ہیں۔ طواف کے پہلے تین پھیروں میں مرد رَمَل کرتا ہوا چلے یعنی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے شانے ہلاتے ہوئے چلے لیکن اس عمل میں کسی کو ایذا نہ دے، باقی چار پھیروں میں آہستہ بغیر شانے ہلائے معمول کی رفتار سے چلے۔ جب سات پھیرے مکمل ہو جائیں تو آخر میں حجرِ اسود کو بوسہ دے ہر ایک پھیرے کی طرح۔ ساتوں پھیروں میں جو مسنون دعائیں ہیں انہیں کسی معتبر کتاب سے یاد کرلے۔ مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھے، حدیث مبارک میں ہے

کہ: جو مقامِ ابراہیم پر دو رکعت پڑھے اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ پھر ملتزَم پر آکر دعا کرے، پھر زمزم پی کر صفا ومروہ کے درمیان سعی کرے، سعی عمرے کے واجبات میں سے ہے۔ کوہِ صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے گا، اگر مروہ سے شروع کی تو یہ شمار نہیں ہوگی۔ سعی کے ساتوں پھیرے پے در پے کرے "میلین اخضرین" کے دوران ہلکی رفتار سے دوڑے (نوٹ: آج کل ان کی نشاندہی کے لیے مَسعیٰ میں ہری روشنی والی دو لائٹیں لگی ہوئی ہیں)، سعی کے بعد حلق یا قَصر کرے، اگر بال اتنے چھوٹے ہوں کہ ایک پور کے برابر نہ کتروا سکے تو حلق ہی کرنا ہوگا۔ حلق کے معنی سر منڈانا ہے اور قصر سے مراد کم از کم انگلی کی ایک پور کے برابر بال کتروانا ہے۔ حلق یا قصر کے بعد احرام کھول دے، عام لباس پہنے، اس طرح عمرہ مکمل ہوگیا۔ متبرک مقامات کی زیارت مستحب ہے۔

عورتیں احرام میں سلے ہوئے کپڑے ہی پہنے رہیں، صرف چہرہ کھلا رہے، تلبیہ بلند آواز سے نہ پڑھیں بلکہ آہستہ آہستہ پڑھیں رمل نہ کریں۔ سعی کے وقت "میلین اخضرین" کے درمیان عام رفتار سے چلیں۔ سعی کے بعد اپنے بالوں کے آخری سرے سے صرف ایک پورا انگلی کے برابر بال کتریں، ان کے لیے حلق جائز نہیں۔

مخصوص ایام میں اِحرام باندھنے کا شرعی حکم

سوال:

میں عمرے پر جارہی ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ماہانہ ایام شروع ہوگئے ہیں، ایسے میں کیا میں اِحرام باندھ کر جاؤں یا جدہ میں کچھ دن رک کر طہارت کے بعد اِحرام باندھوں۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی رجوع کیا تھا، اُنہوں نے کچھ دوائیں دی ہیں جس سے ممکنہ طور پر اتوار تک ماہواری بند ہوجائے گی، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو کیا میں اِحرام باندھ کر روانہ ہوجاؤں؟، (معرفت منور احمد، ملیر، کراچی)

جواب: فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق حیض ونفاس احرام سے مانع نہیں ہیں۔ حیض یا نفاس والی عورت اِحرام باندھ سکتی ہے، اُسے چاہیے کہ حیض یا نفاس ہی کی حالت

میں غسل کر کے احرام باندھ لے اور حج یا عمرے کے لیے روانہ ہوجائے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَإِذَا أَرَادَ الْإِحْرَامَ اغْتَسَلَ أَوْ تَوَضَّأَ وَالْغُسْلُ أَفْضَلُ إِلَّا أَنَّ هٰذَا الْغُسْلَ لِلتَّنْظِيفِ حَتّٰى تُؤْمَرَ بِهِ الْحَائِضُ كَذَا فِي الْهِدَايَةِ وَيُسْتَحَبُّ فِي حَقِّ النُّفَسَاءِ وَالصَّبِيِّ الخ۔

ترجمہ: ''(عازم حج وعمرہ) جب احرام کا ارادہ کرے تو غسل کرے یا وضو کرے اور غسل کرنا افضل ہے، مگر یہ غسل (نجاست صغریٰ یا کبریٰ سے طہارت کے لیے نہیں بلکہ) صفائی کیلیے ہے، یہاں تک حائض عورت کو بھی اس کا حکم دیا جائے گا، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے اور نفاس والی عورت اور بچے کے لیے بھی غسل مستحب ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 222)

ائمۂ اربعہ کے نزدیک عورت کا احرام کے لیے غسل کرنا مستحب ہے۔ آپ غسل کر کے احرام باندھ لیں اور عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ پڑھ لیں، اس طرح آپ ''مُحرِمہ'' ہوجائیں گی۔ آپ احرام کے لیے نفل نہیں پڑھیں گی۔ آپ حرم شریف پہنچ کر ہوٹل پر قیام کریں یا جدہ میں کوئی آپ کا محرم ہے، تو اس کے ہاں بھی قیام کرسکتی ہیں، ایامِ حیض ختم ہونے پر غسل طہارت کریں اور پھر جا کر اپنا عمرہ ادا کریں۔ آپ جدہ جا کر بھی ایامِ حیض ختم ہونے پر پاک ہوکر احرام باندھ سکتی ہیں، لیکن اگر آپ یہاں سے احرام باندھ کر جائیں گی تو آپ کا یہ سارا سفر عمرے کی عبادت میں شمار ہوگا اور اس پر آپ کو اجر ملے گا۔

عمرہ کے بعد حج کی فرضیت کا حکم

سوال:

ہم نے سنا ہے کہ عمرہ کرنے کے بعد حج فرض ہوجاتا ہے اور اُس وقت تک اُس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتے جب تک کہ حج ادا نہ کرلیں (یہاں پہلا حج مراد ہے) بخاری شریف میں بھی روایت موجود ہے، حج کی اقسام کی صورت میں۔ شرعی رہنمائی فرمائیں۔ (مسز عدنان)

جواب:

یہ گمان یا مفروضہ بالکل غلط ہے کہ عمرہ ادا کرنے سے اسی سال حج ادا کرنا لازم ہوجاتا

ہے، حج کی فرضیت کی شرط ''استطاعت'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ: ''اور بیت اللہ کا حج کرنا ان لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس کے راستہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جس نے (اس فریضۂ ربانی کا قولاً یا عملاً) انکار کیا تو بلاشبہ اللہ سب جہانوں سے بے نیاز ہے، (آل عمران:97)''۔ اس آیت سے واضح ہوگیا کہ استطاعت کے بغیر حج فرض نہیں ہوتا۔

استطاعت کی تفسیر میں مولانا امجد علی لکھتے ہیں:

''سفرخرچ اور سواری پر قادر ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ یہ چیزیں اس کی حاجت سے فاضل ہوں، یعنی مکان، لباس، خادم اور سواری کا جانور اور پیشہ کے اوزار اور خانہ داری کے سامان۔ اور قرض سے اتنا زائد ہو کہ سواری پر مکہ معظمہ جائے اور وہاں سے سواری پر واپس آئے۔ اور جانے سے واپسی تک کے ایام کا نفقہ اور مکان کی مرمت کے لیے کافی مال چھوڑ جائے اور جانے آنے میں اپنے نفقے اور گھر اہل وعیال کے نفقے میں قدر متوسط کا اعتبار ہے، نہ کمی نہ اسراف۔ عیال سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نفقہ اس پر واجب ہے''۔

(بہارشریعت (بحوالہ: درمختار، عالمگیری)، جلد:6، ص:11,12، شیخ علی اینڈ سنز، کراچی)

حدیث پاک میں ہے: مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ، فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا۔

ترجمہ: ''جو شخص بیت اللہ تک پہنچنے کیلیے زادِراہ (یعنی مصارفِ سفر) اور سواری کا مالک ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر مرے، (سُنن ترمذی:812)''۔ اس موضوع پر تفصیلی فتویٰ روزنامہ جنگ 11 ستمبر 2015ء کی اشاعت میں چھپ چکا ہے۔

نکاح کے مسائل

ارتداد سے لازم شدہ مہر ساقط نہیں ہوتا

سوال:

میں اور میری اہلیہ نے عیسائی مذہب سے اسلام قبول کیا اور کورٹ میرج کی۔ کچھ عرصے بعد میری اہلیہ نے دوبارہ عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے، کیا میں اُسے حق مہر کی رقم ادا کروں یا ساقط ہوگئی، (صفوان احمد، کراچی)۔

جواب:

مہر کی ادائیگی خلوتِ صحیحہ یا فریقین میں سے کسی کے فوت ہوجانے کی صورت میں لازم ہوجاتی ہے یعنی مہر محض نکاح سے واجب ہوجاتا ہے۔ اگر خلوتِ صحیحہ سے پہلے عورت مرتدہ ہوجائے تو مہر ساقط ہوجائے گا لیکن اگر خلوتِ صحیحہ ہوچکی ہے، تو عورت کے ارتداد کے باوجود پورا مہر ادا کرنا ہوگا۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أَنَّ الْمَهرَ وَجَبَ بِنَفسِ الْعَقْدِ، لٰکِن مَعَ اِحْتِمَالِ سُقُوطِهٖ بِرِدَّتِهَا أَوتَقبِيلِهَا اِبنَهٗ أَوْ تَنَصُّفِهٖ بِطَلَاقِهَا قَبلَ الدُّخُولِ، وَاِنَّمَا يَتَأَكَّدُ لُزُوْمُ تَمَامِهٖ بِالْوَطْئِ وَنَحْوِهٖ۔

ترجمہ: ''مہر محض نکاح سے واجب ہوجاتا ہے، لیکن مرتدہ ہوجانے یا شوہر کے بیٹے کو بوس وکنار کرنے سے ساقط ہوجانے کا احتمال باقی رہتا ہے یا دخول سے قبل طلاق ہوجانے کی بنا پر نصف مہر کا احتمال ہوسکتا ہے، اور مباشرت سے پورا مہر لازم ہوجاتا ہے، اسی پر فتویٰ ہے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 8، ص: 350، دمشق)''۔

مزید لکھتے ہیں: (وارتداد احدھما) ای الزوجین (فسخ)۔۔۔(فللموطوٓۃ) ولوحکما کل مهرها لتاکدہ به (ولغیرها نصفه)

ترجمہ: ''میاں بیوی میں سے کوئی ایک مرتد ہوگیا تو نکاح فوراً ٹوٹ گیا اور یہ فسخ ہے، پس موطونہ کے لیے اگرچہ حکمی ہو، پورا مہر ہے اُس کے نکاح سے مؤکد ہونے کی وجہ سے اور اگر غیر موطوئۃ ہے تو اس کے لیے نصف ہے''۔ (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 8، ص:

645،دمشق)

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

''انها اذا ارتدت والعياذ بالله أو مكنت ابن زوجها فان كان ذلك بعد الدخول كان لها المهر لتأكده بالدخول وان كان قبله فلا مهر لها''۔

ترجمہ:''یعنی اگر کوئی عورت معاذ اللہ مرتد ہوگئی یا اپنے شوہر کے بیٹے کے ساتھ بدکاری کی، پس اگر یہ دخول کے بعد ہے تو اُس کے لیے پورا مہر ہے، کیونکہ دخول سے مہر مؤکد ہوگیا ہے اور اگر یہ ارتداد یا شوہر کی بیٹے سے بدکاری دخول سے پہلے ہے تو اس کے لیے کوئی مہر نہیں ہے''۔(فتح القدیر، ج:3،ص:398)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا اگر بیوی کو فاسقہ ہوجانے کی وجہ سے مرد نے طلاق دے دی ہوتو کیا اس کا مہر ساقط ہوجائے گا یا نہیں؟،آپ نے جواباً مہر کے وجوب کی صورتوں کو بیان کرنے کے بعد لکھا:''ہاں !اگر مہر کو پکا کرنے والی مذکورہ تین چیزوں سے قبل عورت معاذ اللہ مرتد ہوجائے یا خاوند کے باپ یا بیٹے سے یعنی اس کے اصول وفروع میں سے کسی کے ساتھ زنا کیا یا ان میں سے کسی کا شہوت سے بوسہ لیا یا دیا یا اُن کی شرمگاہ کو چھولیا یا ان کی شرمگاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھا، یا اپنی شیر خوار سوتن کو دودھ پلا یا یا زوجین میں سے کسی کو خیارِ بلوغ تھا تو اس اختیار سے نکاح فسخ کردیا یا نکاح فاسد تھا تو حقیقی وطی سے قبل متارکہ ہوگیا، توان تمام صورتوں میں پورا مہر ساقط ہوجائے گا''۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد12،ص:127)

سو اگر آپ میاں بیوی، بیوی کے مرتد ہونے سے پہلے حالتِ اسلام میں کچھ عرصہ ازدواجی زندگی گزار چکے ہیں، یعنی خلوتِ صحیحہ متحقق ہوچکی ہے تو اس صورت میں آپ کو مہر پورا ادا کرنا لازم ہوچکا ہے اور ارتداد کی بنا پر فوری تفریق کے ساتھ مہر کی ادائیگی بھی لازم ہے یعنی آپ مہر پورا کا پورا ادا کریں گے۔

دو بہنوں سے نکاح

میری بیٹی کوثر کا نکاح سکندر لاشاری کے ہمراہ 2010ء میں ہوا۔ جولائی 2015ء میں وہ میری چھوٹی بیٹی یاسمین کو دھوکے سے بھگا کر لے گیا اور نکاح کر لیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا دو بہنیں بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں رہ سکتی ہیں؟۔

(شہناز پروین، نارتھ ناظم آباد کراچی)

جواب:

کسی شخص کے نکاح میں بیک وقت دو بہنیں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ

ترجمہ: ''اور (جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ) تم دو بہنوں کو (بیک وقت نکاح میں) جمع کرو''۔ (نساء:23)

جس بہن سے بعد میں نکاح کیا، وہ نکاح فاسد ہے، پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد بھی مرد اُس وقت تک اپنی پہلی مطلقہ بیوی کی بہن سے نکاح نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہ عورت عدت میں ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

فَاِنْ تَزَوَّجَ الْاُخْتَيْنِ فِیْ عَقْدَةٍ وَاحِدَةٍ يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا وَبَيْنَهُ، فَاِنْ كَانَ قَبْلَ الدُّخُوْلِ فَلَا شَيْئَ لَهُمَا، وَاِنْ كَانَ بَعْدَ الدُّخُوْلِ يَجِبُ لِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا الْاَقَلُّ مِنْ مَهْرِ مِثْلِهَا اَوْمِنَ الْمُسَمّٰى، كَذَا فِی ''الْمُضْمَرَاتِ''۔ وَاِنْ تَزَوَّجَهُمَا فِیْ عَقْدَتَيْنِ، فَنِكَاحُ الْاٰخِيْرَةِ فَاسِدٌ وَيَجِبُ عَلَيْهِ اَنْ يُفَارِقَهَا، وَلَوْعَلِمَ الْقَاضِیْ بِذٰلِكَ يُفَرِّقُ بَيْنَهُمَا، فَاِنْ فَارَقَهَا قَبْلَ الدُّخُوْلِ لَايَثْبُتُ شَيْئٌ مِنَ الْاَحْكَامِ وَاِنْ فَارَقَهَا بَعْدَ الدُّخُوْلِ فَلَهَا الْمَهْرُ وَيَجِبُ الْاَقَلُّ مِنَ الْمُسَمّٰى وَمِنْ مَهْرِ الْمِثْلِ وَعَلَيْهَا الْعِدَّةُ وَيَثْبُتُ النَّسَبُ وَيَعْتَزِلُ عَنِ امْرَاَتِهٖ حَتّٰى تَنْقَضِیَ عِدَّةُ اُخْتِهَا كَذَا فِیْ ''مُحِيْطِ السَّرَخْسِی''۔

ترجمہ: ''اگر دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیا (تو کسی سے بھی نکاح نہیں ہوا) فوراً اس شخص اور ان کے درمیان علیحدگی کردی جائے گی، اگر ازدواجی تعلق قائم ہونے سے پہلے ہی

علیحدگی کی گئی تو کوئی مہر واجب نہ ہوا اور اگر مباشرت کے بعد علیحدگی ہوئی، تو ان میں سے ہر ایک کو (اگر دونوں سے دخول ہوا ہو تو) ''مہرِ مثل'' اور ''مقرّر مہر'' میں سے جو کم ہو، وہ دیا جائے گا، ''مضمرات'' میں اسی طرح ہے۔ اور اگر دونوں بہنوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا ہو، تو جس سے بعد میں نکاح کیا، وہ فاسد ہوگا اور شوہر پر واجب ہے کہ اس سے فوراً علیحدگی اختیار کرلے، اگر قاضی کو اس کا علم ہو جائے تو وہ تفریق کرادے، پس اگر (قاضی نے) مباشرت سے پہلے تفریق کرائی تو اس کے لیے کوئی حکم ثابت نہیں ہے، اور اگر مباشرت کے بعد تفریق ہوئی، تو وہ مہرِ مثل یا مقرر مہر میں سے جو بھی کم ہو، اس کی حق دار ہوگی اور اس پر عدت لازم ہوگی، (بچہ پیدا ہو تو) ثابت النسب ہوگا، اور اپنی بیوی سے دور رہے گا جب تک اس کی بہن کی عدّت پوری نہ ہو جائے، ''محیط سرخسی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 277، 278، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

نابالغہ کا نکاح

سوال:

ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح ڈھائی سال یا تین سال کی عمر میں گواہان اور برادری کی موجودگی میں کردیا تھا، اب جب کہ وہ لڑکی بالغہ ہوگئی ہے اور وہ اس شخص کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی، کیونکہ اس لڑکے کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے، اس لڑکی نے اس رشتہ کو ناپسند کیا اور لڑکے سے طلاق کا مطالبہ کیا، لیکن لڑکے نے طلاق دینے سے انکار کردیا، جس کے بعد لڑکی کے والد نے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے اس لڑکی کے حق میں فیصلہ دے دیا، اب اس لڑکی نے دوسری جگہ اپنی پسند سے نکاح کرلیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اس لڑکی کو اور اس کے شوہر کو اور نکاح خواں کو برادری کے سب لوگ لعن طعن کرتے ہیں کہ لڑکی کا نکاح ٹھیک نہیں ہے کیونکہ پہلے والے شوہر نے طلاق نہیں دی ہے، نکاح خواں نے عدالتی فیصلہ کی وجہ سے لڑکی کا نکاح دوسری جگہ پڑھا دیا۔ اب اس نکاح کے بارے میں کیا حکم ہے؟ نیز بتایئے کہ اگر کسی لڑکی کو اس کا شوہر طلاق نہ دے اور اس کو لٹکا کے رکھے تو وہ

عدالت سے اگر تنسیخ کرا لے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(قاری محمد افضل ہاشمی، احسان پور پنجاب)

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق نابالغہ لڑکی کا نکاح اگر اُس کے باپ نے یا اس کے دادا نے کیا ہو، تو وہ صحیح طور پر منعقد ہوجاتا ہے اور بلوغت کے بعد لڑکی کو خیارِ بلوغ نہیں رہتا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

فَاِنْ زَوَّجَهُمَا الْاَبُ وَالْجَدُّ فَلَا خِيَارَ لَهُمَا بَعْدَ بُلُوْغِهِمَا وَاِنْ زَوَّجَهُمَا غَيْرُ الْاَبِ وَالْجَدِّ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الْخِيَارُ اِذَا بَلَغَ، اِنْ شَآءَ اَقَامَ عَلَى النِّكَاحِ وَاِنْ شَآءَ فَسَخَ وَهٰذَا عِنْدَ اَبِيْ حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى وَيُشْتَرَطُ فِيْهِ الْقَضَاءُ۔

ترجمہ: ''اگر نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ان کے باپ اور (باپ کی عدم موجودگی میں) دادا نے کیا ہو، تو ان دونوں کو بالغ ہونے کے بعد (فسخِ نکاح کا اختیار نہیں ہے) اور اگر ان دونوں کا نکاح باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہو، تو بالغ ہونے پر ان دونوں کو اختیار حاصل رہے گا کہ اگر چاہیں تو نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کردیں، اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے اور اس میں قضا شرط ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1 ص:285)''۔ نباہ نہ ہونے کی صورت میں زوجین کو باہمی رضامندی سے خلع کی تدبیر اختیار کرنی چاہیے اور خاندان کے بزرگوں اور علاقے کے بااثر لوگوں کو اس کے لیے مثبت کردار ادا کرنا چاہیے۔

فقہ حنفی کی رُو سے باپ کی وفات کی صورت میں دادا نے ولی کی حیثیت سے نابالغہ بیٹی یا پوتی کا نکاح کردیا ہو تو بالغ ہونے پر اس کے پاس خیار بلوغ نہیں رہتا اور اگر کسی نابالغہ کا باپ یا باپ کی وفات کی صورت میں دادا نے نہ کیا بلکہ کسی اور ولی نے کیا ہو تو بالغ ہونے پر لڑکی کو خیار بلوغ کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ البتہ فقہ حنفی کی رُو سے بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر منعقد نہیں ہوتا، وہ اپنے نکاح کی اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لَا یَجُوْزُ نِکَاحُ اَحَدٍ عَلٰی بَالِغَۃٍ صَحِیْحَۃِ الْعَقْلِ مِنْ اَبٍ اَوْ سُلْطَانٍ بِغَیْرِ اِذْنِہَا بِکْرًا کَانَتْ اَوْ ثَیِّبًا فَاِنْ فَعَلَ ذٰلِکَ فَالنِّکَاحُ مَوْقُوْفٌ عَلٰی اِجَازَتِہَا فَاِنْ اَجَازَتْہُ جَازَ وَاِنْ رَدَّتْہُ بَطَلَ کَذَا فِی السِّرَاجِ الْوَھَّاجِ۔

ترجمہ: ''کسی بھی عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، خواہ وہ نکاح اس کے والد یا حاکمِ وقت نے منعقد کیا ہو، اگر کسی نے (اس کی اجازت کے بغیر) یہ نکاح کر بھی دیا ہو، تو یہ نکاح اُس (لڑکی) کی اجازت پر موقوف ہے، اگر اطلاع ملنے پر وہ اسے قبول کرلے (اور قائم رکھے) تو جائز ہے اور اگر وہ رَد کردے تو نکاح باطل ہوجائے گا، ''السّراج الوہّاج'' میں بھی اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 287)

یہ ہم نے شرعی حکم بیان کیا ہے، قانونی معاملات کے لیے ماہرین قانون سے رجوع کریں۔ ویسے اس دور میں باپ دادا کو اپنی نابالغہ بیٹی یا پوتی کا نکاح کرنے سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے بعد میں لاینحل معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ہمارے میڈیا میں رونق افروز لبرل اور سیکولر عناصر ہماری معاشرتی کمزوریوں اور خرابیوں کا سارا ملبہ مذہب پر ڈالنے اور اپنی بڑھاس نکالنے کے لیے تلے رہتے ہیں۔

محرمات کے بارے میں شرعی حکم

سوال:

بہو کے لیے سسر کس حد تک محرم ہے، اسی طرح داماد کے لیے ساس؟ ان کے ساتھ کس طرح کے معاملات رکھنے چاہییں یا رکھے جاسکتے ہیں؟۔

جواب:

محرمات یعنی وہ عورتیں جن سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے، نکاح حرام ہونے کے چند اسباب ہیں، اُن اسباب کو نو اقسام پر منقسم کیا جاتا ہے۔ ان نو اقسام میں دوسرا سبب حُرمتِ مصاہرت ہے۔ ساس اور بہو اسی دوسری قسم میں داخل ہیں۔ یہ حُرمت ابدی ہے

یعنی بیوی کے نکاح میں رہتے ہوئے یا طلاق کی صورت یا انتقال ہو جانے کے بعد بھی ساس سے نکاح نہیں ہوسکتا، اِسی طرح حقیقی بیٹے کی بیوی سے نکاح نہیں ہوسکتا۔تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے: وَحَرُمَ بِالْمُصَاهَرَةِ۔۔۔۔ اُمُّ زَوْجَتِهٖ۔ ترجمہ:''زوجہ کی ماں حُرمتِ مصاہرت کے سبب حرام ہے''۔(جلد 8،ص:102،مکتبہ دارالثقافۃ والتراث، دمشق)

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر لکھتے ہیں:

وَلَا بِأُمِّ اِمْرَأَتِهِ الَّتِیْ دَخَلَ بِهَا أَوْلَمْ یَدْخُلْ،لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی:''وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُم''،مِنْ غَیْرِ قَیْدِالدُّخُول،۔۔۔۔وَلَا بِاَمْرَاَۃِ اِبْنِهٖ وبَنِیْ اَوْلَادِہٖ،لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی:''وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِینَ مِنْ أَصلَابِكُم''

ترجمہ:''زوجہ کی ماں سے نکاح جائز نہیں،خواہ وہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:''اورتم پرحرام کی گئی ہیں تمہاری بیویوں کی مائیں''،بغیر قیدِدخول کے۔اور بیٹے کی بیوی اور بیٹے کی اولاد کی بیویوں سے بھی نکاح جائز نہیں ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:''اور(تم پر حرام کیا گیا ہے)تمہارے نسلی بیٹوں کی بیویاں''۔(ہدایہ،جلد 3،ص:9-8)''۔

ستر وحجاب کا فرق

سوال:

محرم مردوں کے سامنے عورت کوکس حد تک ستر یا حجاب کھولنے کی اجازت ہے؟۔ عورت کا پورا بدن ستر ہے تو اس کے سر اور بدن سے اترنے والے بالوں کے لیے کیا حکم ہے؟۔ایک ہی چھت تلے رہنے والے نامحرموں جیسے چچازاد، تایازاد، دیور، جیٹھ وغیرہ سے پردے کے حوالے سے کیا احتیاط کرنی چاہئیں اوران سے کس طرح کے معاملات رکھنے چاہئیں؟۔بہنوئی، پھوپھا، خالو سے پردے کے کیا احکامات ہیں؟۔(سیدہ آمنہ، کراچی)

جواب:

عورت کے ستر اورحجاب کے احکام الگ الگ ہیں۔قرآن مجید کی سورۃ النور میں عورتوں کے ستر کا بیان ہےاورسورۃ الاحزاب میں حجاب کا حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ

کا فرمان ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ

ترجمہ: "اے نبی (ﷺ)! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہیے کہ وہ (گھر سے نکلتے وقت) اپنی چادروں کا کچھ حصہ (اپنے منہ پر) لٹکالیا کریں"۔

(الاحزاب:59)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں: "جلباب وہ چادر ہے جس کو عورت کمبل کی طرح اوپر سے اوڑھ لیتی ہے، ابوعبید نے کہا ہے کہ ازہری نے یہ بیان کیا ہے کہ ابن الاعرابی نے جو یہ کہا ہے کہ جلباب ازار (تہبند) ہے، اس سے مراد وہ چادر نہیں ہے جو کمر پر باندھی جاتی ہے بلکہ اس سے مراد وہ چادر ہے جس سے تمام جسم کو ڈھانپ لیا جاتا ہے"۔

(لسان العرب، جلد 1، ص:273)

علامہ غلام رسول سعیدی قاضی ناصر الدین بیضاوی شافعی کے حوالے سے اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "يُغَطِّيْنَ وُجُوْهَهُنَّ وَاَبْدَانَهُنَّ اِذَا بَرَزْنَ لِحَاجَةٍ وَمِنْ لِلتَّبْعِيْضِ فَاِنَّ الْمَرْاَةَ تَرْخِىْ بَعْضَ جِلْبَابِهَا وَتَتَلَفَّعُ بِبَعْضٍ

ترجمہ: "(جب عورتیں کسی کام سے باہر نکلیں تو) اپنے چہرے اور بدن کو ڈھانپ لیں، "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے کیونکہ عورتیں چادر کے بعض حصے کو (چہرہ پر) لٹکالیتی ہیں اور بعض کو بدن کے گرد لپیٹ لیتی ہیں"۔

(بیضاوی علی ہامش الخفاجی، جلد 7، ص:185۔ تبیان القرآن، جلد 9، ص:559)

ازواج مطہرات اور مسلم خواتین جب کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلتیں تو نقاب پہنتیں یا چادروں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِيْنَةَ، وَهُوَ عَرُوْسٌ بِصَفِيَّةَ بِنْتِ حُيَيٍّ، جِئْنَ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ فَاَخْبَرْنَ عَنْهَا، قَالَتْ: فَتَنَكَّرْتُ وَتَنَقَّبْتُ فَذَهَبْتُ، فَنَظَرَ

رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلٰى عَيْنِيْ فَعَرَفَنِيْ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب خیبر سے مدینہ تشریف لائے ،تو اُس وقت آپ نے حضرت صفیہ بنت حُیَیّ سے شادی کی ہوئی تھی ،انصار کی عورتوں نے آکر حضرت صفیہ کے متعلق بیان کیا، میں نے اپنا حلیہ بدلا اور نقاب پہن کر گھر سے نکلی۔رسول اللہ ﷺ نے میری آنکھوں کو دیکھ کر پہچان لیا''۔

(سُنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:1980)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت ایسا اسکارف یا نقاب پہن سکتی ہے،جس میں آنکھ کھلی ہو اور اُسے دیکھنے میں دشواری نہ ہو۔جوان عورتوں کو نامحرم مردوں کے سامنے چہرہ چھپانے کا حکم ہے۔تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(وَتُمْنَعُ) اَلْمَرْاَۃُ الشَّابَّۃُ (مِنْ كَشْفِ الْوَجْهِ بَيْنَ الرِّجَالِ) لَا لِاَنَّهٗ عَوْرَةٌ بَلْ (لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ) كَمَسِّهٖ وَاِنْ اَمِنَ الشَّهْوَةَ لِاَنَّهٗ اَغْلَظُ

ترجمہ:''جوان عورت کو (نامحرم) مردوں کے سامنے چہرہ کھولنے سے منع کیا جائے ،اس لیے نہیں کہ اُس کا ستر واجب ہے بلکہ فتنہ کے خوف سے منع کیا گیا ہے،جیسے عورت کا چھونا ، خواہ شہوت کا اندیشہ نہ ہو، کیونکہ چہرے کا کھلا ہونا چھونے سے زیادہ سنگین بات ہے''۔

(جلد 2،ص:72)

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(فَاِنْ خَافَ الشَّهْوَةَ) اَوْشَكَّ (اِمْتَنَعَ نَظَرُهٗ اِلٰى وَجْهِهَا) فَحِلُّ النَّظَرِ مُقَيَّدٌ بِعَدَمِ الشَّهْوَةِ وَاِلَّا فَحَرَامٌ، وَهٰذَا فِيْ زَمَانِهِمْ، وَاَمَّا فِيْ زَمَانِنَا فَمُنِعَ مِنَ الشَّابَّةِ'' قُهُسْتَانِيْ'' وَغَيْرُهٗ۔

ترجمہ:''اگر شہوت کا خوف یا شک ہو تو مرد کا عورت کے چہرہ کی جانب نظر کرنا منع ہے،نظر کا حلال ہونا شہوت نہ ہونے کے ساتھ مقید ہے ورنہ حرام ہے اور یہ یعنی شہوت نہ ہونے کی صورت میں عورت کو دیکھنے کا جواز گزشتہ زمانہ کے اعتبار سے تھا اور ہمارے زمانے میں تو

جوان عورت کا چہرہ دیکھنا ہر طرح ممنوع ہے یعنی فسادِ زمانہ کے سبب، جیسا کہ ''قہستانی'' وغیرہ میں ہے''۔(جلد9،ص:451)

ستر کا تعلق عورت کے جسم کے اُس حصہ اور اُن اعضاء سے ہے، جن کو شوہر کے سوا ہر شخص سے چھپانا واجب ہے، خواہ وہ شخص اس عورت کا محرم ہو یا غیر محرم اور وہ عورت کے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ اس کا پورا جسم ہے اور پیروں میں اختلاف ہے، چہرے اور ہاتھوں کے سوا باقی جسم کو عورت نہ اپنے مَحارم (مثلاً باپ، بھائی، بیٹا وغیرہ) پر ظاہر کر سکتی ہے اور نہ اجنبی مردوں پر، اور حجاب کا تعلق عورت کے پورے جسم سے ہے اور یہ اجنبی مردوں کے لحاظ سے ہے، سو اجنبی مردوں کے لحاظ سے عورت کا پورا جسم واجبُ السَّتر (چھپانے کی چیز) ہے اور عورت باقی جسم کے علاوہ اپنا چہرہ اور ہاتھ بھی اجنبی مردوں پر ظاہر نہیں کر سکتی البتہ ضروریات مستثنیٰ ہیں۔اسی طرح ستر کی دو قسمیں ہیں، ایک نماز کے اعتبار سے ستر ہے اور یہ چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ عورتوں کا پورا جسم ہے، سو اجنبی مردوں کے لحاظ سے عورت کا پورا جسم واجبُ السَّتر ہے اور اس کو چھپانا واجب ہے۔

مُتقدمین فقہاء میں سے بعض فقہاء نے ستر اور حجاب میں فرق نہیں کیا اور عورت کے چہرے اور ہاتھوں کو حجاب سے مستثنیٰ رکھا ہے، لیکن جمہور فقہاءِ اسلام نے ستر اور حجاب میں فرق کیا ہے اور اجنبی مردوں کے سامنے عورت کے چہرے اور ہاتھوں کے چھپانے کو بھی واجب قرار دیا ہے اور یہی چیز قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے منشا کے مطابق ہے، امام شافعی کے ایک قول کے مطابق، امام احمد اور متاخرین فقہاءِ احناف کے نزدیک فتنہ کی وجہ سے اجنبی مردوں کا عورتوں کے چہرے کو دیکھنا مطلقاً ناجائز ہے اور امام مالک اور امام شافعی کے دوسرے قول کے مطابق اور متقدمین فقہاءِ احناف کے نزدیک اگر شہوت کا اندیشہ ہو تو عورت کے چہرے کو دیکھنا حرام ہے اور اگر شہوت کا اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، لیکن یہ رائے ہمارے نزدیک راجح نہیں ہے۔

ستر کا تعلق جسم کے اُن حصوں سے ہے جن کو شوہر کے سوا دوسروں پر ظاہر کرنا شرعاً منع

ہے۔ اِن میں ایک تو عورت کے محارم ہیں، مَحرَم کسی عورت کے اس مرد رشتے دار کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ اس کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو۔ مَحرَم کے ساتھ چونکہ عورت کا واسطہ زیادہ ہوتا ہے، اس لیے شریعت نے اس میں عُسر وحرج سے بچنے کے لیے رعایت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں میں سے کسی کے شہوت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو ناگزیر طور پر محرم مرد عورت کے سر، چہرے، سینے، پنڈلی اور بازوؤں پر نظر ڈال سکتا ہے ہے، یعنی اس پر وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ البتہ جہاں یا جس مرحلے پر شہوت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو وہاں فوراً نظر ہٹالے یا عورت اپنے ستر کو چھپالے ورنہ گنہگار ہوں گے۔

کوئی عورت ضرورت کے وقت اجنبی مرد کے سامنے اپنے چہرے اور ہاتھوں سے پردہ ہٹا سکتی ہے یا اچانک اجنبی مرد کی نظر کسی عورت کے اُن اعضاء پر پڑ جائے تو عُسر اور حرج سے بچنے کے لیے جائز ہے، لیکن اگر کسی مرحلے پر نظر میں خیانت کا عنصر شامل ہو جائے یا شہوت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو احتیاط واجتناب لازم ہے''

(شرح صحیح مسلم، جلد خامس، ص:612)

صورت یا رنگ کی مشابہت نہ ہونے کی وجہ سے نسب میں شک کرنا

سوال:

بعض اوقات کسی کے بیٹے یا بیٹی کا رنگ، خدوخال اور صورت ماں باپ سے مشابہت نہیں رکھتی تو لوگ اُن کے صحیح النسب ہونے کے بارے میں شک کرنے لگتے ہیں۔ کیا یہ رویہ یا قیاس درست ہے؟، (منور احمد، ملیر، کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ أَنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللهِ وُلِدَ لِی غُلَامٌ أَسْوَدُ، فَقَالَ: هَلْ لَكَ مِنْ اِبِلٍ، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: مَا أَلْوَانُهَا؟، قَالَ: حُمْرٌ، قَالَ: هَلْ فِیهَا مِنْ اَوْرَقٍ، قَالَ: نَعَم، قَالَ: فَاَنّٰی ذٰلِكَ، قَالَ: لَعَلَّهٗ نَزَعَهُ عِرْقٌ فَقَالَ: فَلَعَلَّ اِبْنَكَ هٰذَا

نَزَعَهُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے (شکایتی انداز میں) عرض کی: یارسول اللہ! میرے ہاں ایک سیاہ بچے نے جنم لیا ہے، آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں؟، اس نے جواب دیا: جی ہاں ہیں، فرمایا: اُن کا رنگ کیسا ہے؟، اُس نے کہا: سرخ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اُن میں کوئی خاکستری بھی ہے، کہنے لگا: ہاں ہے، آپ ﷺ نے پوچھا: تو وہ کہاں سے آ گیا؟، اُس نے کہا: شاید کسی رگ نے اسے کھینچ لیا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: شاید تمہارے بیٹے کو بھی کسی رگ نے کھینچ لیا ہوگا''۔ (صحیح بخاری: 5305)

عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَهٗ مَا وُلِدَ لَكَ؟، قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا عَسٰی اَنْ یُّوْلَدَ لِیْ اِمَّا غُلَامٌ وَاِمَّا جَارِیَةٌ قَالَ: مَنْ یَّشْبَهُ؟، قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا عَسٰی اَنْ یَّشْبَهَ اِمَّا اَبَاهُ وَاِمَّا اُمَّهٗ. فَقَالَ النَّبِیُّ مَهْ لَا تَقُوْلَنَّ هٰكَذَا اِذَا اسْتَقَرَّتِ النُّطْفَةُ فِی الرَّحِمِ اَحْضَرَهَا اللّٰهُ كُلَّ نَسَبٍ بَیْنَهَا وَبَیْنَ آدَمَ اَمَا قَرَأْتَ قَوْلَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ: فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (الانفطار: 8)

ترجمہ: ''حضرت علی بن رباح اپنے والد کے توسط سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اُن سے پوچھا: تمہارے ہاں کیا پیدا ہوا؟، اُنہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے ہاں جو بھی پیدا ہوگا وہ یا لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کس پر جائے گا؟، عرض کی: یارسول اللہ! اپنے باپ پر جائے گا یا ماں پر۔ نبی ﷺ نے فرمایا: رکو اور آئندہ اس طرح مت کہنا، جب کوئی نطفہ رحم میں ٹھہرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور حضرت آدم کے درمیان تمام نسبی رشتوں کو حاضر فرماتا ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں پڑھا: پس اللہ جس صورت میں چاہتا ہے اُس بچے کو بنا دیتا ہے''۔

(الانفطار: 8)، (تفسیر طبری: 36567، دارالکتب العلمیہ بیروت، معجم طبرانی کبیر: 4624)

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ دَخَلَ عَلَیَّ مَسْرُوْرًا

تَبْرُقُ أَسَارِيرُ وَجهِهِ، فَقَالَ: أَلَمْ تَرَى أَنَّ مُجَزِّزاً آنِفاً إِلَى زيد بن حَارِثَةَ وَأُسَامَةَ بنِ زَيد رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فَقَالَ: إِنَّ بَعضَ هٰذِهِ الأَقْدَامِ لَمِن بَعضٍ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے دراں حالیکہ خوشی سے آپ کا چہرہ انور دمک رہا تھا، آپ نے فرمایا: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ایک قیافہ شناس نے ابھی ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید کے قدموں کو دیکھ کر بتایا ہے کہ ان میں سے ایک قدم دوسرے قدم کا جز ہے''۔

(صحیح مسلم: 1459)

علامہ نووی لکھتے ہیں:

وَاخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي الْعَمَلِ بِقَولِ الْقَائِفِ فَنَفَاهُ أَبُوحَنِيفَةَ وَأَصْحَابُهُ وَالثَّورِيُّ وَإِسحَاقُ وَأَثْبَتَهُ الشَّافِعِيُّ وَجَمَاهِيرُ الْعُلَمَاءِ، وَالْمَشْهُورُ عَن مَالِكٍ إِثْبَاتُهُ فِي الْإِمَاءِ وَنَفْيُهُ فِي الْحَرَائِرِ وَفِي رِوَايَةٍ عَنْهُ اثْبَاتُهُ فِيهِمَا، وَدَلِيلُ الشَّافِعِي حَدِيثُ مُجَزِّزٍ لِأَنَّ النَّبِيَّ ﷺ فَرِحَ لِكَونِهِ وَجَدَ فِي أُمَّتِهِ مَن يُمَيِّزُ أَنسَابَهَا عِندَ اشْتِبَاهِهَا وَلَوكَانَتِ الْقِيَافَةُ بَاطِلَةً لَم يَحْصُلْ بِذٰلِكَ سُرُورٌ

ترجمہ: ''قیافہ شناس کے قول کو قبول کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام ثوری اور امام اسحاق قیافہ شناس کے قول کا اعتبار نہیں کرتے، امام شافعی اور جمہور علماء قیافہ شناس کے قول کا اعتبار کرتے ہیں، امام مالک باندیوں کے حق میں قیافہ شناس کے قول کا اعتبار کرتے ہیں اور آزاد عورتوں کے حق میں نہیں کرتے اور امام مالک سے ایک روایت ہے کہ وہ آزاد اور غلام دونوں میں قیافہ شناس کے قول کا اعتبار کرتے ہیں۔ امام شافعی کی دلیل قیافہ شناس کی وہ روایت ہے کہ نبی ﷺ اس بات سے خوش ہوئے کہ آپ کی امت میں ایسے لوگ ہیں جو نسب کے مشتبہ ہونے کی صورت میں نسب میں تمیز کر سکتے ہیں اور اگر قیافہ شناسی باطل ہوتی تو آپ کو اس کے سبب خوشی حاصل نہ ہوتی''۔

(شرح النووی، جلد 10، ص: 36)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

وَنَفَاهُ أَبُوْ حَنِيْفَةَ مُطْلَقًا لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء:36) وَلَيْسَ فِيْ حَدِيْثِ الْمُدْلِجِي دَلِيْلٌ عَلٰی وُجُوْبِ الْحُكْمِ بِقَوْلِ الْقَافَةِ لِاَنَّ اُسَامَةَ كَانَ نَسَبُهٗ ثَابِتًا مِنْ زَيْدٍ قبلَ ذٰلِكَ، وَلَمْ يَحْتَجِ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ ذٰلِكَ اِلٰی قَوْلِ اَحَدٍ، وَاِنَّمَا تَعَجَّبُ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ اِصَابَةِ مُجَزِّزٍ كَمَا يَتَعَجَّبُ مِنْ ظَنِّ الرَّجُلِ الَّذِی يُصِيْبُ ظَنُّهٗ حَقِيْقَةَ الشَّيِّ الَّذِیْ ظَنَّهٗ، وَلَا يَثْبُتُ الْحُكْمُ بِذٰلِكَ، وَتَرَكَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الْاِنْكَارَ عَلَيْهِ لِاَنَّهٗ لَمْ يَتَعَاطَ فِیْ ذٰلِكَ اِثْبَاتُ مَا لَمْ يَكُنْ ثَابِتًا۔

ترجمہ: ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ قیافہ شناسی کا بالکل اعتبار نہیں کرتے اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''اور اُس بات کی ٹوہ میں نہ لگ جاؤ جس کا تمہیں علم نہیں ہے''، اور مدلجی کی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ قیافہ شناس کا قول لازمی حجت ہے، کیونکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا نسب حضرت زید بن حارثہ سے اس سے پہلے بھی ثابت تھا اور نبی ﷺ ان کے نسب کے ثبوت کے سلسلے میں کسی کے قول کے محتاج نہیں تھے۔ البتہ نبی ﷺ کو قیافہ شناس کی رائے کے درست ہونے پر تعجب ہوا جس طرح کسی شخص کا گمان کسی چیز کی حقیقت کے بارے میں درست ثابت ہو جائے تو اس پر (انسان کو) تعجب ہوتا ہے اور (اگر کسی قطعی ثبوت سے وہ چیز ثابت نہیں ہے تو محض) اس گمان سے اس کا حکم ثابت نہیں ہوتا اور رسول اللہ ﷺ نے انکار اس لیے نہیں فرمایا کہ اس سے کوئی غیر ثابت شدہ چیز تو ثابت نہیں ہو رہی تھی''۔ (عمدۃ القاری، جلد 16، ص:153)

ان احادیث مبارکہ سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

(الف) قرائن کی بنا پر کسی کے نسب کا انکار شرعاً درست نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے غیر معمولی مسرت کا اظہار فرمایا کہ کچھ لوگوں نے حضرت اسامہ بن زید کے صحیح نسب کے بارے میں شبہات کا اظہار کیا اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے انہی کے قیافہ شناسوں کو ان پر حجت بنا دیا۔

(ب)امام اعظم کے حجت نہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ صحت قاطعہ نہیں ہے، بلکہ محض ظن وتخمین ہے، کیونکہ اس کے قطعی ماننے سے کوئی شخص دو اجنبیوں کے درمیان نسبی رشتے کا دعویٰ کرسکتا ہے،جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں اور نسب و وراثت کے لیے ظنی شہادت کافی نہیں ہے اور دیگر ائمہ کے اسے حجت ماننے کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی شخص اس کے نتیجے میں ناروا طعن سے بچ سکتا ہے اور حضرت اسامہ بن زید کا نسب تو پہلے ہی ثابت شدہ تھا اور وہ الحمدللہ صحیح النسب تھے۔

(ج)اولاد اور ماں باپ کے درمیان رنگ یا صورت اور خدوخال کے فرق سے صحیح النسب کے نسب کو مشکوک یا مشتبہ نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور آج کی جدید سائنس کا مدار بھی رنگ وروپ، خدوخال اور صورت کے بجائے DNA پر ہے،اگرچہ یہ بھی ظنی ہے۔

(د) بعض طبی یا قدرتی وجوہات کی بنا پر اولاد اور ماں باپ کی رنگت میں فرق واقع ہوسکتا ہے اور صحیح بخاری کی حدیث کی رُو سے رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے سائل کے گمان کو رَد کیا، ورنہ اس سے سنگین خطرات کے حامل معاشرتی مسائل پیدا ہوسکتے تھے اور کوئی شخص اپنی بیوی کے بارے میں بدگمانی کرسکتا تھا۔

پس اسلام دینِ حق اور دینِ فطرت ہے اور الحمدللہ علیٰ احسانہٖ اس میں اُمت کو درپیش ہر مسئلے کا شافی وکافی اور اطمینان بخش حل موجود ہے۔

طلاق کے مسائل

موبائل SMS کے ذریعے طلاق

سوال:

میرا اور میرے شوہر کا تعلق اہلسنّت سے ہے۔ میرے شوہر محمد اقبال ولد بشیر احمد نے مجھے بتایا کہ اس نے تین ماہ قبل بذریعہ فون message تین طلاقیں لکھ کر ارسال کردی تھی لیکن میں نے یہ message نہیں پڑھا تھا۔ پھر انہوں نے بتایا انہوں نے بھی قاری/ مولوی صاحبان سے دریافت کیا کہ کیا ایسی صورت میں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں کہ نہیں؟۔ مولوی صاحب نے قرآن پاک سے پڑھ کر بتایا کہ نہیں ہوئیں اور میرا شوہر مجھے آکر اپنے گھر لے گیا اور میں ان دنوں حمل سے تھی۔ بعد ازاں میں اپنی ماں کے گھر واپس آگئی تو میں نے بھی مفتی صاحب سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ میری لڑکے (شوہر) سے بات کراؤ تو میں نے فون پر اپنے شوہر سے مفتی صاحب کی بات کرائی تو میرے شوہر نے فون پر بتایا کہ اس نے لڑکی (اپنی بیوی عائشہ) کو تین بار طلاق دے دی ہے، message پر لکھا تھا۔ مفتی صاحب نے میرے شوہر سے بات کرنے کے بعد بتایا کہ مجھے تین طلاقیں ہوگئی ہیں۔ لیکن میں ابھی کشمکش میں ہوں کہ آیا مجھے طلاقیں واقع ہوگئی ہیں کہ نہیں، (عائشہ بشیر بنت محمد بشیر، ساندہ خورد، لاہور)

جواب:

طلاق دینے کے تین طریقے ہیں: ۱۔ یہ کہ لفظاً طلاق دی جائے اور یہی طلاق میں اصل ہے، یعنی کوئی شخص اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ کہے: ''میں نے تجھے طلاق دی'' یا بیوی کا نام لے کر کہے: ''میں نے فلانہ بنت فلاں کو طلاق دی''۔ یہ طلاق کا نہایت واضح طریقہ ہے اور اس میں کوئی اشکال اور ابہام نہیں رہتا۔ ۲۔ یہ کہ کسی کو طلاق دینے کے لیے اپنا وکیل بنائے، اسے ''توکیل بالطلاق'' کہتے ہیں۔ ۳۔ یہ کہ لکھ کر طلاق دے۔ طلاق جس طرح لفظاً اور زبانی واقع ہوتی ہے، اسی طرح تحریری طلاق بھی مؤثر

ہوتی ہے۔ تحریری طلاق کی کئی صورتیں ہیں، عالمگیری میں ہے:

اَلْكِتَابَةُ عَلٰى نَوْعَيْنِ مَرْسُوْمَةٌ وَغَيْرُ مَرْسُوْمَةٍ، وَنَعْنِيْ بِالْمَرْسُوْمَةِ اَنْ يَكُوْنَ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا، مِثْلَ مَايُكْتَبُ اِلَى الْغَائِبِ، وَغَيْرُ الْمَرْسُوْمَةِ لَا يَكُوْنُ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا، وَهُوَ عَلٰى وَجْهَيْنِ مُسْتَبِيْنَةٌ وَغَيْرُ مُسْتَبِيْنَةٍ، فَالْمُسْتَبِيْنَةُ مَايُكْتَبُ عَلَى الصَّحِيْفَةِ وَالْحَائِطِ وَالْاَرْضِ عَلٰى وَجْهٍ يُمْكِنُ فَهْمُهٗ وَقِرَاءَتُهٗ. وَغَيْرُ الْمُسْتَبِيْنَةِ مَايُكْتَبُ عَلَى الْهَوَاءِ وَالْمَاءِ وَشَيْءٍ لَا يُمْكِنُ فَهْمُهٗ وَقِرَاءَتُهٗ. فَفِيْ غَيْرِ الْمُسْتَبِيْنَةِ لَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوٰى، وَاِنْ كَانَتْ مُسْتَبِيْنَةً لٰكِنَّهَا غَيْرُ مَرْسُوْمَةٍ، اِنْ نَوَى الطَّلَاقَ يَقَعُ وَاِلَّا فَلَا. وَاِنْ كَانَتْ مَرْسُوْمَةً يَقَعُ الطَّلَاقُ، نَوٰى اَوْ لَمْ يَنْوِ، ثُمَّ الْمَرْسُوْمَةُ لَا تَخْلُوْ، اِمَّا اِنْ اَرْسَلَ الطَّلَاقَ بِاَنْ كَتَبَ: ''اَمَّا بَعْدُ فَاَنْتِ طَالِقٌ''، فَلَمَّا كَتَبَ هٰذَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَتَلْزَمُهَا الْعِدَّةُ مِنْ وَقْتِ الْكِتَابَةِ. وَاِنْ عَلَّقَ طَلَاقَهَا بِمَجِيْءِ الْكِتَابِ. بِاَنْ كَتَبَ: ''اِذَا جَاءَكِ كِتَابِيْ هٰذَا فَاَنْتِ طَالِقٌ''، فَمَا لَمْ يَجِئْ اِلَيْهَا الْكِتَابُ. لَا يَقَعُ. كَذَا فِيْ فَتَاوٰی ''قَاضِيْ خَان''۔

ترجمہ: ''تحریری طلاق کی دو قسمیں ہیں، مرسومہ اور غیر مرسومہ: مرسومہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ باقاعدہ مکتوب الیہ کے نام اور عنوان سے شروع کیا جائے، جیسے کسی غائب کو خط لکھا جاتا ہے (عربی میں لکھتے ہیں: الی فلان اور اردو میں لکھتے ہیں: بنام فلاں یا فلاں کے نام، فلاں کی جگہ مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا ہے)۔ غیر مرسومہ سے مراد یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا نام لکھ کر باقاعدہ اُسے مخاطب نہ کیا جائے۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں: واضح ہو یا غیر واضح۔ واضح اور نظر آنے والا وہ ہے جسے کاغذ یا دیوار یا زمین پر اس طرح لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن ہو۔ اور غیر واضح سے مراد یہ ہے کہ جسے ہوا یا پانی یا کسی ایسی چیز (جیسے انگلی سے شفاف شیشے پر لکھنا) پر لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن نہ ہو، تو غیر واضح تحریر سے طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ لکھنے والے نے نیت بھی کی ہو۔ اور اگر تحریر تو واضح ہے، لیکن مکتوب الیہ کو نام کے ساتھ مخاطب کر کے نہیں لکھی گئی، تو اگر لکھنے والے نے اپنی بیوی کو

طلاق دینے کی نیت سے لکھا ہے، تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر اُس نے طلاق کی نیت سے نہیں لکھا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر تحریر واضح ہے اور اپنی بیوی کو نام کے ساتھ مخاطَب کرکے طلاق نامہ لکھا ہے، تو نیت کی ہو یا نہ، طلاق واقع ہوجائے گی۔ پھر اگر طلاق مرسومہ ہے، یعنی اپنی بیوی کا نام لکھ کر طلاق نامہ لکھا ہے، تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ طلاق کو کسی شرط پر مقید نہیں کیا، یعنی شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور اُسے مخاطَب کرکے یوں لکھا: ''تجھے طلاق ہے''، تو جس وقت یہ تحریر لکھی، اُسی وقت سے طلاق واقع ہوجائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی۔

(۲) اور اگر شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور پھر اُسے مخاطَب کرکے لکھا: ''جیسے ہی میری یہ تحریر یا خط یا طلاق نامہ آپ کو ملے، آپ پر طلاق ہے''، تو جب تک اُس کی بیوی کو تحریر نہیں ملے گی، طلاق واقع نہیں ہوگی (اور تحریر ملتے ہی طلاق واقع ہوجائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی)''۔ (جلد:01،ص:378)

حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا: ''ایک شخص نے اپنی بیوی مسمات فاطمہ کو یہ تحریر لکھ کر بھیجی کہ: ''میں نے فاطمہ بی بی کو طلاق دے دی''، نیچے اپنے دستخط کردیئے طلاق ہوگئی یا نہیں؟''۔ مفتی صاحب جواب میں لکھتے ہیں: ''اگر شوہر نے طلاق کی نیت سے یہ عبارت لکھی ہے، تو طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، ورنہ نہیں۔ کیونکہ جو طلاق اَلقاب وآداب کے بغیر ویسے ہی لکھ دی جاوے، وہ نیت پر موقوف ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتابت کی اقسام اور تعریفات کے حوالے سے وہی عبارات لکھیں، جو ہم نے اوپر درج کی ہیں، انہوں نے ''مُصَدَّرًا وَ مُعَنْوَنًا'' کے معنی لکھے ہیں: ''با قاعدہ القاب وآداب کے ساتھ''۔ (ص:150)

موبائل فون سے اپنی بیوی کو SMS کرکے طلاق دینا، مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں طلاق بالکتابت ہی کی ایک قسم ہے اور یہ ''طلاقِ غیر مرسوم، مُستبین، غیر معلّق بوصولِ الکتاب'' کی ایک جدید شکل ہے۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کی رُو سے

شوہر اقراری ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں، لہٰذا طلاق واقع ہو چکی ہے اور آپ دونوں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ چونکہ طلاق دینے کے وقت آپ حاملہ تھیں، اس لیے آپ کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ پیدا ہونے) تک ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت (کی انتہا) ان کا وضع حمل ہے''۔ (الطلاق: 4)

سو عدت مکمل ہونے یعنی وضع حمل تک آپ کا نفقہ سابق شوہر کے ذمے ہے، لیکن عدت کے دوران بھی آپ دونوں کا باہم ازدواجی تعلق قائم کرنا حرام ہے، آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔

ثبوتِ طلاق کے لیے شوہر کا اقرار کافی ہے

سوال:

ایک آدمی فون پر اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیتا ہے، جب وہ پہلی بار طلاق کہتا ہے تو بیوی فون بند کر دیتی ہے۔ کچھ گھنٹے بعد اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم نے طلاق ہوش و حواس میں دی ہے، تو وہ گواہی دیتا ہے کہ ہاں! میں نے طلاق ہوش و حواس میں دی ہے، تو کیا طلاق ہوگئی یا نہیں؟ کیا رجوع کیا جا سکتا ہے۔ کچھ گھنٹے بعد طلاق دینے والا آدمی رونا شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ غصے میں دی تھی اور میں رجوع کرنا چاہتا ہوں، ائمۂ اربعہ کا کیا موقف ہے؟۔ خاص طور پر امام ابوحنیفہ اور اہلِ حدیث حضرات کیا کہتے ہیں؟۔

(تنویر احمد، سیالکوٹ)

جواب:

ثبوتِ طلاق کے لیے شوہر کا اقرار کافی ہے۔ طلاق غصے ہی میں دی جاتی ہے ایسی حالت نہیں تھی جس میں عقل زائل ہوگئی ہو اور یہ پتا نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز لکھتے ہیں: غصہ مانع وقوعِ طلاق نہیں بلکہ وہی طلاق پر حامل ہوتا ہے، تو اُسے مانع قرار دینا گویا حکمِ طلاق کا راسأ (سرے سے) ابطال (باطل قرار دینا)

ہے، ہاں! اگر شدّتِ غیظ و جوشِ غضب اس حد کو پہنچ جائے کہ اس سے عقل زائل ہو جائے، خبر نہ رہے کہ کیا کہتا ہوں زبان سے کیا نکلتا ہے، تو بیشک ایسی حالت کی طلاق ہرگز واقع نہ ہوگی''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص:383)

ائمہ ومشائخ عظام نے تصریح فرمائی ہے کہ غصہ ارادۂ طلاق کی علامت ہے۔ ملک العلماء علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَحَالُ الْغَضَبِ وَمُذَاكَرَةُ الطَّلَاقِ دَلِيْلُ اِرَادَةِ الطَّلَاقِ ظَاهِراً، فَلَا يُصَدَّقُ فِي الصَّرْفِ عَنِ الظَّاهِرِ،

ترجمہ: ''غصہ کی حالت (حالتِ غضب) اور مذاکرۂ طلاق (یعنی بیوی شوہر سے طلاق کا مطالبہ کررہی ہو اور اس پر بحث جاری ہو) ظاہری طور پر طلاق کے ارادہ پر دلیل ہوتے ہیں، لہٰذا طلاق کے کلمات بولنے کے بعد اگر شوہر کلام کے ظاہری معنی کے خلاف مراد بیان کرے، تو اُس کی تصدیق نہیں کی جائے گی''۔ (بدائع الصنائع، جلد 3، ص:149)

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: (۱) ''آج کل اکثر لوگ طلاق دے بیٹھتے ہیں، بعد کو افسوس کرتے اور طرح طرح کے حیلہ سے یہ فتویٰ لیا چاہتے ہیں کہ طلاق واقع نہ ہو۔ ایک عذر اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ غصہ میں طلاق دی تھی۔ مفتی کو چاہیے کہ یہ امر ملحوظ رکھے کہ مطلقاً غصہ کا اعتبار نہیں، معمولی غصہ میں طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ صورت کہ عقل غصہ سے جاتی رہے، بہت نادر ہے، لہٰذا جب تک اس کا ثبوت نہ ہو محض سائل کے کہہ دینے پر اعتماد نہ کرے (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:113)''۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

''طلاق اکثر غصے ہی میں ہوتی ہے اور غصہ میں جو طلاق دی جاتی ہے، واقع ہوتی ہے، مگر جب کہ غصہ اس حد کا ہو کہ عقل تکلیفی زائل ہو جائے کہ غصہ کی شدت میں مجنون اور پاگل کی طرح ہو جائے کہ اسے کچھ امتیاز ہی باقی نہ رہے، جو کچھ کہے اُس کا علم نہ رہے کہ کیا کہتا ہے تو اس صورت میں طلاق واقع نہ ہوگی، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر واقع میں اس حد کا غصہ نہ ہوا اور لوگوں پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ مجھے بالکل خبر نہیں کہ کیا کہا تو اپنے اس جھوٹے بیان سے

مؤاخذہ اُخروی سے بری نہ ہوگا۔ اور وہ بیانِ طلاق کو عنداللہ منع نہ کرے گا اور اگر معمولی غصہ تھا تو جتنی طلاقیں دی ہیں'' ۔ واقع ہیں، (فتاویٰ امجدیہ، دوم، ص: 197)

ائمۂ اربعہ کے نزدیک تین طلاقوں سے دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو جاتے ہیں۔

علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی شافعی لکھتے ہیں:

وَقَدِ اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِيمَنْ قَالَ لِامْرَأَتِهِ: أَنْتِ طَالِقٌ ثَلٰثًا. فَقَالَ الشَّافِعِيُّ وَمَالِكٌ وَأَبُوحَنِيفَةَ وَأَحْمَدُ وَجَمَاهِيرُالْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ: يَقَعُ الثَّلَاثُ۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے تین طلاق (یا تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں)، تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، (ائمۂ مذاہب) امام شافعی، امام مالک، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اجمعین اور جمہور علماء سلف وخلف رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی'' ۔ (شرح صحیح مسلم للنووی، جلد 10، ص: 60)

طلاق کا حکم

سوال:

میں نے دس دن پہلے اپنی بیوی کو سخت غصے میں لڑائی کے دوران کہا: ''میں تجھے آج بھی طلاق دیتا ہوں، کل بھی طلاق دیتا ہوں، پرسوں بھی طلاق دیتا ہوں''، شرعی حکم کیا ہے؟

(محمد لطیف، ڈالمیا کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی پر ہر روز ایک طلاق واقع ہوئی اور تیسرے روز تیسری طلاق واقع ہونے کے بعد دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو گئے، تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی قطعاً گنجائش نہیں۔ تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

وَبِقَوْلِهِ: (أَنْتِ طَالِقٌ غَدًا أَوْفِي غَدٍ يَقَعُ عِنْدَ) طُلُوعِ (الصُّبْحِ، وَصَحَّ فِي الثَّانِيْ نِيَّةُ الْعَصْرِ) أَيْ: آخِرِالنَّهَارِ (قَضَاءً، وَصُدِّقَ فِيهِمَا دِيَانَةً) وَمِثْلُهُ: أَنْتِ طَالِقٌ شَعْبَانَ أَوْ فِي شَعْبَانَ۔

ترجمہ:''شوہر نے بیوی سے کہا:'' تجھے کل طلاق ہے یا کل میں طلاق ہے''،ان کلمات سے (اگلے دن) طلوعِ صبح کے وقت طلاق واقع ہوگی، اور اگر شوہر نے'' تجھے کل میں طلاق ہے'' کے کلمات سے اگلے دن کے آخری حصے یعنی بعد العصر کی نیت کی،تو قضاءً درست ہے۔اور اگر وہ یہ کہے کہ دونوں کلمات میں میری نیت اگلے دن بعد العصر کی تھی،تو دیانۃً اس کی تصدیق کی جائے گی،اسی کی مانند یہ قول بھی ہے کہ:'' تجھے شعبان کو طلاق ہے یا شعبان میں طلاق ہے''،اگر مُطلَق مراد لیا ہے،تو قولِ اوّل کے مطابق طلوعِ شعبان کے ساتھ ہی طلاق واقع ہوجائے گی،لیکن اگر وہ کہے کہ:'' تجھے شعبان میں طلاق ہے'' سے میری مراد ماہِ شعبان کا آخر ہے،تو قضاءً اس کی تصدیق کی جائے گی (اور شعبان کا مہینہ ختم ہونے پر طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر وہ یہ کہے کہ دونوں کلمات سے میری مراد آخرِ شعبان ہے،تو دیانۃً دونوں اقوال میں اس کی تصدیق کی جائے گی''۔(جلد9،ص:209-207،دمشق)

پس صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی کو پہلی طلاق اسی وقت واقع ہوجائے گی اور دوسری طلاق اگلے دن کے طلوع ہونے پر اور تیسری طلاق اس کے بعد والے دن کے طلوع ہونے پر واقع ہوجائے گی۔

طلاق کا ایک مسئلہ

سوال:

گھر میں شوہر کے ساتھ کسی نہ کسی بات پر اکثر جھگڑا رہتا تھا لیکن تنقید کا اظہار شوہر کی طرف سے ہی ہوتا تھا۔3 جولائی 2010 کو ہمارا جھگڑا گھر سے باہر ہوا۔جھگڑے کی شدت میں سڑک پر ہی میرے شوہر نے یہ الفاظ بولے: **تم میرے سے فارغ ہو تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں اور تم اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ اور میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔** انہوں نے مجھے وہیں چھوڑا،اس کے بعد میں خود ہی واپس اپنے شوہر کے گھر آگئی۔ایک ہفتے تک ہمارا بولنا ایک دوسرے کے ساتھ بند رہا نہ تو ہمارا زبانی کلامی کوئی تعلق رہا اور نہ ہی جسمانی۔پورا ایک ہفتہ مکمل ناراضی رہی اس کے بعد دوسری بار 12 جولائی 2010 کو

پھر زیور کے مسئلے پر جھگڑا ہوا اور یہ جھگڑا بھی اس وقت ہوا جب گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ لڑائی کی شدت بڑھتی گئی اور اسی شدت میں پھر دوبارہ یہ الفاظ کہے: **میں نے تمہیں طلاق دی (ایک ہی دفعہ کہا)**۔ اس کے بعد تقریباً ساڑھے تین ماہ تک میں نے اپنے شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے شوہر کو اس مسئلے کی نوعیت اور اس کا حل بتایا اور اس پر عمل کرنے یعنی تجدید نکاح کے لیے کہا۔ شوہر کا کہنا ہے کہ اس نے طلاق دی ہی نہیں ہے۔

بالآخر تقریباً چار ماہ گزرنے کے بعد میرا اس گھر میں رہنا مناسب نہیں تھا کیونکہ شوہر رجوع کی خواہش کا اظہار کرتا اور میں طلاق کے وہم میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ پاتی کہ کیا ہمارا یہ رجوع جائز بھی ہے یا نہیں۔ بالآخر اس کے کہنے پر میں 27 اکتوبر 2010 کو اپنے میکے واپس آ گئی۔ کیا طلاق ہو گئی ہے؟ اور 5 سال کے اس عرصے کی کیا اہمیت ہے جس دوران زوجیت کے کوئی حقوق بھی پورے نہیں کیے گئے، (حمیرا علوی، اسلام آباد)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ''تم میرے سے فارغ ہو تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں اور تم اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ اور میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں''، کنایات میں سے ہے اور اگر یہ کلمہ طلاق کی نیت سے بولا ہو تو ایک طلاقِ بائن واقع ہو گی۔ شوہر کا غصہ ہی نیت طلاق پر دلیل ہے، شامی میں ہے: ''لان دلالة الحال قائمة مقام النية، (باب الصریح، ج:2، ص:430)''۔ مفتی نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''وہ کلمات کنائیہ جو صالحۂ زدو سب نہیں اور صالحۂ طلاق ہیں، غصے کی حالت میں طلاق ہیں، اگرچہ نیت طلاق کا صریح انکار کرے''۔ (فتاویٰ نوریہ، ج:3، ص:143)

لیکن اگر شوہر حلفیہ کہتا ہو کہ اِن الفاظ سے اُس کی طلاق کی نیت نہیں تھی، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہو گی۔ ''**میں نے تمہیں طلاق دی**'' صریح ہے، طلاقِ بائن کے بعد عدت کے دوران دی جانے والی صریح طلاق بائن کو لاحق ہو گئی اور دو طلاقیں بائن ہو گئیں، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: اَلصَّرِيْحُ يَلْحَقُ الصَّرِيْحَ وَيَلْحَقُ الْبَائِنَ بِشَرْطِ الْعِدَّةِ۔

ترجمہ:''صریح طلاق،صریح کو لاحق ہوتی ہے،اور صریح، بائن کو بھی لاحق ہوتی ہے (یعنی پہلے انت طالق کہا، دوبارہ انت طالق کہا یا طلاق مال کے عوض تو یہ (دونوں صریح ہیں) دوسری طلاق بھی واقع ہوگئی اس لیے کہ صریح،صریح کو لاحق ہوتی ہے یا انت بائن کہا، پھر انت طالق کہا تو یہ دوسری صریح طلاق پہلی بائن کولاحق ہوگی اور بائن ہوجائے گی) بشرطیکہ پہلی بائنہ کی عدت میں واقع ہو (یعنی عورت عدت میں ہوتو دوسری طلاق پہلی طلاق کو لاحق ہوسکتی ہے اور عدت پوری ہونے کے بعد لاحق نہیں ہوسکتی)''۔''ویلحق البائن'' کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

كَمَالَوْقَالَ لَهَا: اَنْتِ بَائِنٌ أَوْ خَالَعَهَا عَلٰى مَالٍ ثُمَّ قَالَ: اَنْتِ طَالِقٌ أَوْ هٰذِهٖ طَالِقٌ۔ ''بحر'' عن ''البزازية''، ثُمَّ قَالَ: وَاِذَا لَحِقَ الصَّرِيْحُ الْبَائِنَ كَانَ بَائِناً، لِاَنَّ الْبَيْنُوْنَةَ السَّابِقَةَ عَلَيْهِ تَمْنَعُ الرَّجْعَةَ كَمَافِي ''الْخُلَاصَةِ''۔

ترجمہ:''جیسے کسی شخص نے کہا: تجھے طلاق ہے یا طلاق مال کے عوض، پھر کہا: انت طالق، یا یہ رہی طلاق، ''البحر الرائق'' میں بزازیہ سے منقول ہے۔ پھر کہا: اگر بائنہ طلاق کے بعد رجعی طلاق دی تو وہ رجعی بھی بائنہ ہوجائے گی، کیونکہ پہلی بائنہ کے بعد رجوع ممنوع ہوجاتا ہے، جیسا کہ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4،ص:405،دار احیاء التراث العربی، بیروت)

طلاقِ بائن کا حکم یہ ہے کہ محض رجوع کافی نہیں ہوگا بلکہ باہمی رضامندی سے نئے مہر کے ساتھ تجدیدِ نکاح کرنا ہوگا، کیونکہ طلاقِ بائن کی صورت میں عدت کے دوران اور عدت کے بعد بھی سابق شوہر تجدیدِ نکاح کے ساتھ رجوع کرسکتا ہے بشرطیکہ عورت بھی راضی ہو۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

اِذَا كَانَ الطَّلَاقُ بَائِنًا دُوْنَ الثَّلَاثِ فَلَهٗ أَنْ يَتَزَوَّجَهَا فِي الْعِدَّةِ وَبَعْدَ اِنْقِضَائِهَا،

ترجمہ:''اور جب طلاقِ بائن تین سے کم ہوں (یعنی ایک یا دو ہوں) تو شوہر عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد (بیوی کی رضامندی سے دوبارہ) نکاح کرسکتا ہے، (عالمگیری،

جلد:01،ص:472)۔اس کے لیے نیا مہر مقرر کرنا ہوگا، پہلا حق مہر اگر ادا نہیں کیا تھا تو اُس کی ادائیگی بھی شوہر پر واجب ہے۔ لیکن اس عقدِ ثانی کی صورت میں پہلے شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا۔ اور اگر خدانخواستہ اُس نے مستقبل میں (حسبِ صورت) ایک طلاق مزید دیدی تو سابق دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر یہ تین ہو جائیں گی اور پھر تحلیلِ شرعی کے بغیر دونوں میں رجوع بالنکاح نہیں ہو سکے گا۔ عدّت کے بعد عورت آزاد ہے، جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے جب کہ کوئی مانع شرعی نہ ہو۔

آپ کا کہنا ہے کہ شوہر طلاق کا انکار کر رہا ہے، قضاءً یعنی دنیوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو عادل گواہ موجود ہوں اور اگر عورت طلاق کا دعویٰ کرتی ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو اسے قسم دی جائے گی، اگر وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ میری نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، تو اسے قضاءً مان لیا جائے، اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، حدیث پاک میں ہے: نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: اَلْبَیِّنَةُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلَی الْمُدَّعٰی عَلَیْهِ۔ ترجمہ: ''کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لیے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعوی کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی:1340)''۔ یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لیے مدعی پر لازم ہے کہ وہ دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم دی جائے گی، شوہر کی قسم کے بعد فیصلہ ہوگا اور اس طرح قضاءً نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ شوہر کے قسم اٹھانے کے بعد فیصلہ اُس کے حق میں دے دیا جائے گا اگر شوہر جھوٹی قسم اٹھاتا ہے تو گناہ کا وبال اُس پر ہوگا۔

توکیلِ طلاق

سوال:

میرے اپنی بیوی سے کچھ اختلافات ہوگئے، میں اپنے ایک وکیل دوست کے پاس مشاورت کے لیے گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھے بغیر طلاق نامہ بنایا، جس میں تین طلاقیں لکھی تھیں، میں نے کہا: میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں نہیں دینا چاہتا۔ دوست کہنے لگا کہ تین طلاقیں ایک ہی ہوتی ہیں، میں نے بہت روکا اور منع کیا لیکن وہ اپنی بات پر بضد رہا، بالآخر میں نے اس کی بات کو درست سمجھتے ہوئے دستخط کردیے۔ دو دن بعد میری بیوی گھر واپس آگئی، عدت کے اندر ہم نے رجوع کرلیا، شرعی حکم بیان فرمائیں، (ڈاکٹر عبداللہ، محمودآباد)۔

جواب:

اگر صورتِ مسئولہ میں سائل کا بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے، تو چونکہ شوہر کا ارادہ ایک طلاق دینے کا تھا، وکیل کے زائد طلاقیں لکھنے سے وہ واقع نہیں ہوں گی۔ ایک طلاقِ رجعی واقع ہونے کا حکم دیا جائے گا اور شوہر کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہے، مفتی محمد عبداللہ نعیمی فتاویٰ انقرویہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

قَالَ لِلصَّکَّاکِ اُکْتُبْ طَلَاقَ اِمْرَأَتِیْ تُطَلَّقُ کَتَبَ اَوْلَمْ یَکْتُبْ وَصَحَّ فِیْ ''الْقُنْیَۃِ'' اَنَّہٗ لَایَقَعُ مَالَمْ یَکْتُبْ۔

ترجمہ: ''وثیقہ نویس سے کہا کہ میری بیوی کو طلاق لکھ دے، طلاق واقع ہوجائے گی، خواہ کاتب لکھے یا نہ لکھے اور ''قنیہ'' میں ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر کاتب نے نہ لکھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی''۔ مزید لکھتے ہیں: لیکن کاتب حکم میں وکیل کے ہے، کاتب کو آمر کے حکم کے بغیر ایک طلاق سے زائد لکھنے کا کوئی حق نہیں ہے، (فتاویٰ مجددیہ نعیمیہ، ج 1 ص: 253-254)۔ صرف ایک طلاق واقع ہوئی، بقیہ طلاقیں مؤثر نہیں ہیں۔

مُطلّقہ غیر حاملہ کی عدت تین حیض گزرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ

ترجمہ:''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرۃ:228)''۔ چونکہ عدت کے دوران آپ نے رجوع کرلیا تھا لہٰذا نکاح بدستور قائم ہے، تحلیلِ شرعی کی حاجت نہیں ہے اور آئندہ دوطلاقوں کا اختیار آپ کو حاصل ہوگا۔ خدانخواستہ آئندہ جب بھی آپ نے اپنی بیوی کو دوطلاقیں دے دیں، تو دونوں ایک دوسرے پر حرام ہوجائیں گے۔

غیر منقسم ترکے کے کاروبار میں ورثاء کا استحقاق

سوال:

40 سال قبل ہمارے نانا خواجہ مشتاق احمد مرحوم نے ایک دکان 3000 روپے پگڑی پر لی تھی، ماہانہ کرایہ =/250 روپے تھا۔ دو بیٹے خواجہ انور مشتاق، خواجہ عامر مشتاق ساتھ کام کرتے تھے۔ نانا کے انتقال کے بعد یہی دونوں بیٹے دکان چلاتے رہے، نانا کے انتقال کے وقت دکان میں تین لاکھ روپے مالیت کا سامان موجود تھا۔ 2000ء میں دکان کے مالک نے پگڑی ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور آفر دی کہ پانچ لاکھ روپے لے لو اور دکان چھوڑ دو یا مجھے پانچ لاکھ دے کر دکان اپنے نام کرالو۔ نانا کے دو اور بیٹے خواجہ اشفاق اور انجم مشتاق تھے۔ انور مشتاق اور عامر مشتاق نے ان دونوں سے مشورہ لیا، انہوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی، انور مشتاق اور عامر مشتاق نے مل کر پانچ لاکھ روپے ادا کیے اور دکان اپنے نام کرالی۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ دکان کا مالک کسے شمار کیا جائے گا اور بطور ترکہ تقسیم ہوگا یا نہیں؟۔

خواجہ مشتاق احمد مرحوم کی مالیت تین ہزار جمع تھی، جن کی ویلیو 2000ء میں پانچ لاکھ روپے ہوگئی، دکان میں تین لاکھ روپے کا سامان بھی تھا۔ کیا یہ مشتاق احمد کا ترکہ شمار ہوگا؟۔ اسی دکان سے ماموؤں نے کمایا، خرچ کیا، نانا کے قرضے بھی اتارے، ان سب امور کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟، (مولانا محمد حسن رضا قادری، الماس مسجد، عزیز آباد کراچی)۔

جواب:

باپ کی زندگی میں جو کاروبار تھا، جو بیٹے ساتھ مل کر کام کرتے تھے، وہ مال میں شریک

نہیں ہیں، تمام مال باپ کی ملکیت ہوتا ہے اور باپ کے انتقال کے بعد تمام وارثوں کا ہے، اُس میں جتنا اضافہ ہوگا، وہ ورثاء کا ہوگا۔ اگرچہ کاروبار چلانے والے چند افراد ہوں اور باقی ورثاء عملی طور پر کام نہ کررہے ہوں۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

يَقَعُ كَثِيْرًا فِي الْفَلَّاحِيْنَ وَنَحْوِهِمْ أَنَّ أَحَدَهُمْ يَمُوْتُ فَتَقُوْمُ أَوْلَادُهٗ عَلٰى تَرِكَتِهٖ بِلَا قِسْمَةٍ وَيَعْمَلُوْنَ فِيْهَا مِنْ حَرْثٍ وَزِرَاعَةٍ وَبَيْعٍ وَشِرَاءٍ وَاسْتِدَانَةٍ وَنَحْوِ ذٰلِكَ، وَتَارَةً يَكُوْنُ كَبِيْرُهُمْ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَلّٰى مُهِمَّاتِهِمْ وَيَعْمَلُوْنَ عِنْدَهٗ بِأَمْرِهٖ، وَكُلُّ ذٰلِكَ عَلٰى وَجْهِ الْإِطْلَاقِ وَالتَّفْوِيْضِ۔

ترجمہ: ''اکثر کاشتکار اور دیگر (پیشوں سے وابستہ) لوگوں میں یہ ہوتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی فوت ہوجائے، تو اُن کی اولاد ترکے کو تقسیم کیے بغیر اسی طرح قائم رکھتی ہے اور وہ اُس زمین میں کھیتی باڑی، خرید وفروخت، قرض کا لین دین اور دوسرے اُمور جاری رکھتے ہیں۔ اور کبھی فوت ہونے والے کا بڑا بیٹا تمام کاموں کی نگرانی کرتا ہے اور چھوٹے اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، یہ سب ایک طرح سے غیر رسمی تفویضِ اختیار ہوتا ہے (یعنی وہاں کے لوگوں کا عرف یا عادت ہے)''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

فَاِذَا كَانَ سَعْيُهُمْ وَاحِدًا وَلَمْ يَتَمَيَّزْ مَا حَصَّلَهٗ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ بِعَمَلِهٖ، يَكُوْنُ مَا جَمَعُوْهُ مُشْتَرَكًا بَيْنَهُمْ بِالسَّوِيَّةِ، وَاِنِ اخْتَلَفُوْا فِي الْعَمَلِ وَالرَّأْيِ كَثْرَةً وَصَوَابًا. كَمَا أَفْتٰى بِهٖ فِي ''الْخَيْرِيَّةِ''، وَمَا اشْتَرَاهُ أَحَدُهُمْ لِنَفْسِهٖ يَكُوْنُ لَهٗ وَيَضْمَنُ حِصَّةَ شُرَكَائِهٖ مِنْ ثَمَنِهٖ اِذَا دَفَعَهٗ مِنَ الْمَالِ الْمُشْتَرَكِ، ترجمہ: ''پس جب ان کی سعی ایک ہو اور ہر ایک کی محنت کی کمائی جدا جدا نہ ہو، تو سب جمع شدہ مال میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اگرچہ ذہنی وفکری عمل کی مقدار ایک جیسی نہ ہو، ''فتاویٰ خیریہ'' میں اسی طرح کا فتویٰ دیا ہے۔ اور ان میں سے اگر کسی نے اپنی ذات کے لیے کچھ خریدا تو وہ اُس کا مالک ہوجائے گا اور اگر اُس نے مشترکہ مال سے قیمت دے کر خریدا تھا، تو اس میں شرکاء کا جو حصہ صرف ہوا، اس کا وہ ضامن ہوگا''۔ (جلد6، ص:372)

صورتِ مسئولہ میں اگر عامر مشتاق اور انور مشتاق نے پانچ لاکھ روپے مشترکہ کاروبار سے دے کر دکان نام کرائی ہے، تو اس رقم کو وراثت یعنی ترکے میں شامل کر کے سب ورثاء کو تناسب کے مطابق حصہ دینا ہوگا اور پانچ لاکھ روپے ادا کر کے اپنے نام کرنے سے پہلے جو دکان کی بازاری قیمت تھی، وہ رقم بھی مجموعی ترکے میں شامل کرنی ہوگی۔

خرید وفروخت
کے مسائل

ڈیلر یا کمیشن ایجنٹ کی اجرت کا تعین ضروری ہے

سوال:

زید چند لوگوں کو کہتا ہے کہ مجھے مکان یا پلاٹ خریدنا ہے، کسی کی نظر میں ہو تو بتانا۔ کسی فرد کے ذریعے زید کو مکان یا پلاٹ مل جاتا ہے، وہ از خود یا اُس شخص کے ساتھ جا کر خرید لیتا ہے، تو زید نے جتنے لوگوں کو کہا تھا، یہ سب زید کے وکیل ہو جاتے ہیں یا نہیں؟، وکیل بنانے کے لیے کس شرط کا لحاظ کیا جائے گا؟۔ زید کے رشتے دار بسا اوقات اُس پر اعتماد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں پلاٹ لے کر دیں، جبکہ زید ڈیلر نہیں ہے۔ زید ڈیلرز سے مل کر پلاٹ دلوا دیتا ہے، ڈیلر سے شرط رکھتا ہے کہ پلاٹ لینے والے سے کمیشن زید لے گا اور پلاٹ لینے والوں کو کہتا ہے کہ کمیشن ڈیلر نے لیا ہے، کیا زید کا اس طرح سے کمیشن لینا جائز ہے؟۔ (سجاد، ملتان)

جواب:

وکالت کا لغوی معنیٰ: ''تفویض یا سپرد کرنا، اعتماد کرنا اور اپنے کام کے لیے کسی کو نائب بنانا'' ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: اَلتَّوکِیلُ أَن تَعتَمِدَ عَلیٰ غَیرِکَ وَتَجعَلَہُ نَائِبًا عَنکَ، ترجمہ: ''توکیل کسی دوسرے شخص پر اعتماد کرنا اور اُسے اپنے کام کا نائب بنانا ہے''۔ (المفردات، ص:569)

مذکورہ عمل سے کوئی شخص وکیل نہیں بنے گا، کیونکہ زید نے محض اتنی بات کی تھی کہ جس کسی کی نظر میں کوئی مکان یا پلاٹ ہو تو زید کو آگاہ کرے۔ جبکہ وکیل بنانے کے لیے لازم ہے کہ مذکورہ کام وکیل کے سپرد کر دیا جائے اور خریدنے کا اختیار دیا جائے، خریدی جانے والی شے کی صفت بیان کی جائے اور ثمن واضح کیا جائے۔ وکیل کے لیے عاقل وبالغ ہونا شرط ہے۔

زید کا پلاٹ لینے والوں کے علم میں لائے بغیر کمیشن لینا غبن ہے۔ اگر زید پلاٹ لینے والوں کو بتا کر اپنا کمیشن رکھتا ہے اور پلاٹ لینے والے اس پر رضامندی بھی ظاہر کر دیتے

ہیں، تو زید کے لیے یہ منافع جائز ہے۔ جواز کی صورت یہ ہوگی کہ زید پلاٹ لینے والوں کا وکیل بنے اور اُجرت طے کرلے، اس صورت میں وکالت کا معاملہ اجارہ کی طرح ہو جائے گا۔ شرح المجلّۃ میں ہے:

اِذَا اشْتُرِطَتِ الاُجْرَۃُ فِی الْوکالۃِ وَأَوْفَاھَا الْوَکِیلُ یَسْتَحِقُّھَا وَاِنْ لَمْ تَشْتَرِطْ وَلَمْ یَکُنِ الْوَکِیلُ مِمَّنْ یَخْدِمُ بِالاُجْرَۃِ یَکُونُ مُتَبَرِّعًا وَلَیْسَ لَہٗ مُطَالَبَتُہٗ بِاُجْرَۃٍ

ترجمہ: ''جب وکالت میں اُجرت کی شرط لگا دی ہو اور وکیل نے اپنی ذمہ داری پوری کردی ہو، تو وہ اُجرت کا مستحق ہو جائے گا اور اگر اُجرت کی شرط نہ کی ہو اور کسی شخص کو اجرت پر وکیل نہ مقرر کیا ہو (اور وہ کوئی تعاون کرے) تو وہ بطور تبرُّع ہوگا اور اس کے لیے اپنی خدمت (یا تعاون) پر اجرت کا مطالبہ جائز نہیں ہوگا''۔ (مادہ: 1467، جلد 4، ص: 445)

نوٹ: تبرُّع کا انگلش مُتبادل ہے: Voluntarily، یعنی بلا معاوضہ کوئی چیز یا مال دینا یا کوئی خدمت بجالانا، اسی کو فضل و احسان بھی کہتے ہیں۔

زید اگر یہ خدمت ڈیلر یا ایجنٹ کے طور پر بجالانا چاہتا ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی خدمت اور اس کی اجرت کو مؤکِّل پر واضح کرے، اسے مخفی یا مجہول نہ رکھے، بلکہ معلوم اور معیّن ہونا ضروری ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ ''اجارۂ فاسدہ'' کے بیان میں لکھتے ہیں:

اَلْفَسَادُ قَدْ یَکُونُ لِجِھَالَۃِ قَدْرِ الْعَمَلِ بِاَنْ لَایُعَیِّنَ مَحَلَّ الْعَمَلِ وَقَدْ یَکُونُ لِجَھَالَۃِ قَدْرِ الْمَنْفَعَۃِ بِاَنْ لَایُبَیِّنَ الْمُدَّۃَ وَقَدْ یَکُونُ لِجَھَالَۃِ الْبَدَلِ۔

ترجمہ: ''اور کبھی اجارہ کام کی مقدار کے مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے، اس طور پر کہ کام کی جگہ مقرر نہ ہو اور کبھی منفعت کی مقدار مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے کہ مدت بیان نہ کی گئی ہو اور کبھی بدل یعنی معاوضے کے مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص: 439)

صحیح بخاری میں سمسار (کمیشن ایجنٹ) کے ساتھ عقد کے جواز کی ایک صورت اَثر

عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ'' بِعْ ھٰذَا الثَّوبَ، فَمَازَادَعَلٰی کَذَاوَکَذَا فَھُوَلَکَ '' یعنی یہ کپڑا اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو رقم تمہیں ملے وہ تمہاری ہے۔ ابن سیرین تابعی نے کہا کہ: اِذَا قَالَ بِعہُ بِکَذَا، فَمَا کَانَ مِن رِبحٍ فَھُوَلَکَ، أَوْ بَینِی وَبَینَکَ، فَلَا بَاسَ بِہٖ ترجمہ:'' ایک شخص نے (کمیشن ایجنٹ) سے یہ کہا کہ یہ چیز اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو نفع ملے، وہ تمہارا ہے یا ہم دونوں نصف نصف کے حق دار ہوں گے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، (صحیح البخاری: 2274)''۔ تو جہاں یہ عرف رائج ہو تو بطور استحسان یہ جائز ہے۔

عقدِ مُضارِبت میں نفع میں کمی بیشی پر اختلاف

سوال:

میرے چھوٹے بھائی نے 2014ء میں ایک دوست کے ساتھ کاروبار میں تقریباً 40 لاکھ روپے کیش اور پے آرڈر کی صورت میں انویسٹ کیے زبانی یہ طے پایا کہ نفع ونقصان کی صورت میں 50/50 کا حصہ ہوگا۔ کاروبار میں تقریباً رقم ہماری تھی، یہ کاروبار مویشی منڈی سہراب گوٹھ میں کار پارکنگ کے ٹھیکے کی مد میں عید الفطر سے عید الاضحیٰ تک ہوتا ہے، اس کاروبار میں تمام اخراجات کرنے کے بعد اچھا خاصا نفع حاصل ہوا۔ جب میرے بھائی نے حساب کتاب کی بات کی، تو اس نے کہا کہ جو نفع ہوا ہے، اُس کا 60% میں لوں گا اور 40% تمہیں دوں گا (نفع سے حاصل ہونے والی کچھ رقم ادا بھی کی)۔ کام کے دوران ہونے والی آمدنی کی رقم میرے پاس لکھی ہوئی ہے، مگر اخراجات کی تفصیل میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے تفصیل کا کہا تو اس نے کہا: دکھادوں گا، دوسال کا عرصہ ہو چکا ہے، آج تک معاملہ اٹکا ہوا ہے۔ شرعی اعتبار سے کیا حکم ہے؟۔

(فرخ ظفر، جنگ گروپ، کراچی)

جواب:

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، یہ مُضاربت کا عقد ہے۔ اس میں ایک فریق کا

سرمایہ ہوتا ہے اور وہ رَبُّ المال (Capital Provider) کہلاتا ہے اور دوسرے فریق کی محنت ہوتی ہے اور وہ مُضارِب (Working Partner) کہلاتا ہے۔ عقدِ مُضاربت کے وقت نفع میں جو تناسب طے ہو، دونوں اس کے پابند ہوتے ہیں، البتہ اگر رَبُّ المال تبرُّع اور فضل واحسان کے طور پر مضارب کو کچھ زیادہ دینا چاہے، تو وہ ایسا کرسکتا ہے، اگر تناسب کے بارے میں فریقین میں اختلاف ہو تو ربُّ المال کا قول معتبر ہوگا، (عالمگیری، جلد 4، ص:324)۔ معاملات میں تحریری دستاویز مُرتب کرنی چاہیے تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو، اس حوالے سے قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی آیتِ مداینہ میں واضح احکامات موجود ہیں۔ شرعی حکم یہی ہے کہ آخرت کی جوابدہی اور خداخوفی کے جذبے سے فریقین کو اپنا معاملہ خوش اسلوبی سے طے کرلینا چاہیے اور مُضارِب کو آپ کی رقم منافع کے حصے سمیت پوری پوری دے دینی چاہیے اور اگر کوئی نزاع ہے تو اسے طے کرنے کے لیے آپ لوگ دو دیانت دار کاروباری حضرات کو، جو اس کاروبار کی نوعیت اور طریقۂ کار سے واقف ہوں، ثالث اور حکم بنالیں اور ان کا فیصلہ برضا ورغبت تسلیم کریں۔ شرعی معاونت کے لیے آپ دونوں کسی مفتی سے رجوع کرسکتے ہیں۔

بیع بالتقسیط کی ایک صورت

سوال:

میں اپنی گاڑی دس لاکھ روپے میں فروخت کرنا چاہتا ہوں، ایک صاحب نے مجھے آفر دی کہ پانچ لاکھ ابھی لے لیں اور دو ماہ بعد مزید ساڑھے پانچ لاکھ روپے لے لیں، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟، (میاں محمد فرحان رفیع، یوکے)۔

جواب:

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے، اسے ''بیع بالتقسیط'' (یعنی قسطوں پر خرید وفروخت) کہتے ہیں۔ لیکن اس کے جواز کی شرط یہ ہے کہ ایک قیمت (مثلاً آپ کی بیان کی ہوئی صورت میں ساڑھے پانچ لاکھ روپے) پر عاقدین (بائع ومشتری) کا اتفاق ہو

جائے، یہ نہ ہو کہ بائع کہے کہ نقد پانچ لاکھ روپے ہے اور اُدھار ساڑھے پانچ لاکھ روپے ہے۔ یہ بیع مؤجّل ہے اور اس میں مَبیع (Sold Item) بائع کی ملک میں دے دی جاتی ہے اور یکمشت یا قسطوں میں قیمت کی ادائیگی کے لیے مدت طے کر لی جاتی ہے اور اسلام ایفائے عہد کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے خریدار قیمت بروقت ادا نہ کر سکے تو اضافی مدت کے عوض قیمت نہیں بڑھائی جائے گی، ورنہ یہ سود شمار ہوگا۔

کسی شراکت دار کے لیے نفع کے حصے میں باہمی رضامندی سے اضافہ

سوال:

میں ایک کمپنی میں اکاؤنٹنٹ ہوں، کمپنی کے شیئر ہولڈرز کی تعداد 600 ہے، کمپنی قانون کے مطابق کم از کم سات ڈائرکٹرز منتخب کیے جاتے ہیں جو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے کمپنی کے معاملات چلانے کے مختار ہوتے ہیں۔ ہماری کمپنی میں سات ڈائرکٹرز ہیں، دو ورکنگ اور پانچ نان ورکنگ ان کی ذمے داریوں، تجربہ اور قابلیت کی بنیاد پر تنخواہ مقرر کی جاتی ہے۔ ورکنگ ڈائرکٹرز کی تنخواہ دو لاکھ روپے مقرر کی ہے، تو یہ ڈائرکٹر پانچ لاکھ روپے وصول کر رہے ہیں اور کھاتوں میں تین لاکھ کی زائد رقم کو تنخواہ کے بجائے دیگر اخراجات کی مد میں لکھا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ غلط ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہماری مارکیٹ ویلیو یہی ہے اور اگر یہ غلط ہے تو آپ درست طریقے سے ہمیں پانچ لاکھ روپے ادا کریں، ہمیں تو اتنے ہی لینے ہیں۔ ان ڈائرکٹرز نے مزید بتایا کہ دیگر ڈائرکٹرز کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کھاتوں میں غلط اندراج اس لیے کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کا متعلقہ ادارہ اعتراض کر سکتا ہے۔ مزید عرض یہ ہے کہ یہ ڈائرکٹرز آپس میں رشتے دار ہیں۔ سال کے اختتام پر شیئر ہولڈرز کے سامنے حسابات تصدیق کے لیے رکھے جاتے ہیں، تو یہ تصدیق بھی کر لیے جاتے ہیں، کیونکہ کسی کو بھی نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے۔

مزید عرض یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ کے متعلقہ ادارے کی دخل اندازی کو نظر انداز کر دیا جائے اور معاملہ کمپنی کے شیئر ہولڈرز کے اجلاس میں منظوری کے لیے پیش کیا جائے تو چونکہ

ورکنگ ڈائرکٹرز اوران کی فیملی کے پاس کمپنی کے 70 فیصد شیئرز ہیں، آسانی سے ان کے حق میں فیصلہ ہوسکتا ہے، لیکن گورنمنٹ کے متعلقہ ادارے کے خوف سے وہ ایسا نہیں کر رہے۔ سوال یہ ہے کہ: کیا ورکنگ ڈائرکٹرز کا زائد رقم لینا جائز ہے؟، میرے لیے کیا احکام ہیں؟، (محمد عاطف راؤ، لاہور)۔

جواب:

مذکورہ ڈائرکٹرز کا زائد تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، کھاتوں میں غلط اندراج کرنا دھوکا دہی اور فریب کے زمرے میں آتا ہے، جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے، حدیث مبارک میں اس کی شناعت کو یہ بیان فرمایا: مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا ترجمہ: ''جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں''۔ (صحیح مسلم:279)

ورکنگ ڈائرکٹرز کی جو تنخواہ مقرر کی گئی ہے، اُس سے زائد لینا غبن ہے، حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلَى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا أَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُولٌ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کسی کو ہم کسی کام کے لیے مقرر کریں اور اُسے اُس کی اُجرت ادا کر دیں، تو اپنی اجرت کے علاوہ وہ جو کچھ بھی لے گا، وہ غبن کے زمرے میں آئے گا''۔

(سنن ابوداؤد:2941)

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، رَفَعَهُ، قَالَ: إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ: أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ، مَا لَمْ يَخُنْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَإِذَا خَانَهُ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزّوجل فرماتا ہے: ''دو شریکوں کا ثالث میں ہوتا ہوں، جب تک اُن میں سے کوئی خیانت

نہ کرے اور جب خیانت کرتا ہے تو ان سے جدا ہو جاتا ہوں''۔(سنن ابوداؤد:3381)

آپ کے بقول ورکنگ ڈائرکٹر اور نان ورکنگ ڈائرکٹر 70 فیصد شیئر ہولڈر ہیں، لیکن 30 فیصد شیئرز یقیناً دوسرے لوگوں کے ہوں گے، کل منافع سے اُن کا بھی حصہ ہوتا ہے، جو اخراجات میں غلط اندراج کے بعد غبن کیا جا رہا ہے، اگر یہ زائد لی جانے والی رقم منافع میں شامل رہے تو 30 فیصد شیئر ہولڈرز کے نفع میں بھی اضافے کا سبب بنے گا، جو نہ دینا اُن کی حق تلفی ہے۔

شریک کو علیحدہ سے تنخواہ لینے کا حق نہیں، یہ ہوسکتا ہے کہ کسی شریک کا کاروبار میں حصہ کم ہو لیکن شرحِ منافع اُسے زیادہ دی جائے، کیونکہ وہ کاروبار میں دوسرے شرکاء کے مقابلے میں زیادہ مہارت رکھتا ہے یا دوسرے شرکاء کی بہ نسبت زیادہ وقت دیتا ہے، تو اُس کے لیے شرحِ منافع زیادہ طے کی جاسکتی ہے، جیسا کہ فقہ حنفی کی معروف کتاب''المجلۃ الاحکام العدلیہ''میں ہے:

يَتَقَوَّمُ الْعَمَلُ بِالتَّقْوِيْمِ أَیْ اَنَّ الْعَمَلَ يَتَقَوَّمُ بِتَعْيِيْنِ الْقِيْمَةِ. وَيَجُوْزُ أَنْ يَكُوْنَ عَمَلُ شَخْصٍ أَكْثَرَ قِيْمَةً بِالنِّسْبَةِ اِلٰی عَمَلِ شَخْصٍ آخَرَ مَثَلًا اِذَا كَانَ رَأْسُ الْمَالِ مَالَ الشَّرِيْكَيْنِ فِیْ شَرِكَةِ عِنَانٍ مُتَسَاوِيًا وَكَانَ مَشْرُوْطًا عَمَلَ كِلَيْهِمَا فَاِذَا شَرَطَ لِاَحَدِهِمَا حِصَّةً زَائِدَةً فِی الرِّبْحِ جَازَ. لِاَنَّهٗ يَجُوْزُ اَنْ يَكُوْنَ اَحَدُهُمَا اَكْثَرَ مَهَارَةً مِنَ الْآخَرِ فِی الْبَيْعِ وَالشِّرَاءِ وَعَمَلُهٗ اَزْيَدُ وَاَنْفَعُ۔

ترجمہ:''کام بھی ان چیزوں میں سے ہے، جن کی قیمت مقرر کی جاتی ہے یعنی عمل کی باقاعدہ قیمت مقرر کی جاسکتی ہے، اس لیے یہ جائز ہے کہ ایک شخص کا عمل (اُس کی پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے) دوسرے شخص کے عمل سے زیادہ قیمتی قرار پائے۔ مثلاً دو شراکت داروں نے ایک شرکت قائم کی، سرمایہ دونوں کا برابر تھا اور یہ بھی شرط تھی کہ دونوں کام کریں گے، اُس کے باوجود اگر معاہدۂ شرکت میں یہ شرط بھی رکھ دی جائے کہ ایک شریک، منافع میں سے زائد حصہ لے گا، تو یہ شرط جائز ہوگی۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک شریک دوسرے کے بہ نسبت

خرید وفروخت میں زیادہ مہارت رکھتا ہو اور اس کا کام زیادہ نفع بخش ہو، (مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ:1345)"۔ مختصر یہ کہ کسی شراکت دار کا نفع میں حصہ اس کی محنت وصلاحیت کے پیشِ نظر زیادہ مقرر کیا جا سکتا ہے، الگ سے تنخواہ مقرر کرنا ناجائز ہے۔

آپ کی ذمے داری ہے کہ شرعی احکام مذکورہ بورڈ آف ڈائرکٹرز کے علم میں لائیں اور اُنہیں آمادہ کریں کہ ورکنگ ڈائرکٹرز کے لیے نفع کے تناسب میں جائز طریقے سے زیادہ حصہ مقرر کیا جا سکتا ہے، علیحدہ سے تنخواہ مقرر نہیں کی جائے گی۔ آپ حقائق اُن کے علم میں لاکر اپنا فریضہ ادا کردیں، نیز اگر کسی دوسری جگہ شفاف ملازمت دستیاب ہوتو مذکورہ ملازمت چھوڑ دیں۔

حقِ شفعہ میں ترجیح شریک کا حق پڑوسی پر مُقدّم ہے

سوال:

ضلع قلات بلوچستان میں ایک اراضی کے اصل مالکان دو بلوچ قبیلے (سیاہ پاذ اور سوپک) ہیں، یہ فریقِ اول ہیں اور یہ ان کی مشترکہ زمین تھی۔ پھر دونوں نے اس شرط پر فریقِ دوم گرگناڑی قبیلے کو دی کہ اس بنجر زمین کو اپنے خرچ اور محنت سے آباد کریں، بارہواں حصہ ہمارا ہوگا اور گیارہ حصے زمین مع منافع تمہارا ہوگا۔ فریقِ دوم گرگناڑی نے یہ زمین فریقِ سوم محمد صالح گورانجو کو اس طور پر دی کہ تم اسے آباد کرو، نفع کا نصف حصہ تمہارا ہوگا۔ پھر فریقِ سوم محمد صالح نے فریقِ دوم کی اجازت اور موجودگی میں فریقِ اول کے پورے حصے کو خریدا۔ اس کے بعد کئی سال گزر گئے، محمد صالح گورانجو کا بھی انتقال ہوگیا۔ بعد ازاں پھر اس کے بیٹوں اور بھتیجوں نے فریقِ دوم گرگناڑی سے ان کے حصے کا 16واں حصہ خریدا۔ اس کے چار ماہ بعد ایک شخص عبدالواحد بن وڈیرہ محمد ساسولی نے حقِ شفعہ کا دعویٰ کیا۔ چالیس سال قبل جب فریقِ سوم محمد صالح نے فریقِ اول کے حصے کو خریدا تھا اس وقت عبدالواحد کے والد محمد ساسولی نے حقِ شفعہ کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ کیا عبدالواحد ساسولی شفعہ کا حق رکھتا ہے؟۔ جس زمین میں کوئی پہلے شفعہ کا دعویٰ کرے، شرعی وقانونی طریقے

سے عدالت سے شفعہ حاصل نہ ہوتو کیا اب وہ حق ملکیت کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

(عبدالرسول، پرانا گولیمار کراچی)

جواب:

غیرمنقول جائیداد کو کسی شخص نے جتنی رقم کے عوض خریدا، اُتنے ہی میں اُس جائیداد کے مالک ہونے کا حق جس دوسرے شخص کو حاصل ہوجاتا ہے، اُسے شریعت کی اصطلاح میں ''شفیع'' اور اُس حق کو ''حقِ شُفعہ'' کہتے ہیں۔

شُفعہ کا حق غیرمنقولہ جائیداد (Immovable Property) میں ہوتا ہے، یعنی جب کوئی شخص اپنی ملکیتی زمین کو فروخت کرنا چاہے، تو پہلے اپنے شفیع (Preemptor/Intercessor) کو پیشکش کرے کہ آیا وہ اِسے خریدنا چاہتا ہے، اگر وہ خریدنا چاہتا ہے، تو بازاری قیمت یا طے شدہ قیمت پر اُسے دیدے، یعنی اُس کا حق کسی بھی دوسرے خریدار پر مُقدّم ہے۔

اگر زمین کا مالک اُس (شفیع) کو نظرانداز کرکے یا اُس کی لاعلمی میں کسی اور شخص پر اپنی زمین فروخت کرتا ہے، تو اُسی قیمت پر شفیع کو اُس زمین کے لینے کا جبری (Bounden/Compulsory) حق حاصل ہے، یعنی بائع (Seller) کی مرضی کے برعکس وہ اِسے خرید لے گا اور دوسرے خریدار کی بیع کالعدم ہوجائے گی۔ تفصیلی دلائل درجِ ذیل ہیں:

علامہ بدرالدین ابومحمد محمود بن احمد العینی لکھتے ہیں:

وَقِيْلَ:هِيَ تَمَلُّكُ الْعَقَارِ عَلٰى مُشْتَرِيْهِ جَبْرًا بِمِثْلِ ثَمَنِهٖ،وَقَالَ أَصْحَابُنَا: اَلشُّفْعَةُ تَمَلُّكُ الْبُقْعَةِ جَبْرًاعَلَى الْمُشْتَرِيْ بِمَا قَامَ عَلَيْهِ۔وَقِيْلَ:هِيَ ضَمُّ بُقْعَةٍ مُشْتَرَاةٍ إِلٰى عَقَارِ الشَّفِيْعِ بِسَبَبِ الشَّرِكَةِ أَوِالْجِوَارِ،وَهٰذَا أَحْسَنُ،

ترجمہ: ''ایک قول کے مطابق کسی مشتری نے جو زمین خریدی ہے، اُسی قیمت پر پڑوسی کو جبراً مالک بننے کا جو حق حاصل ہوتا ہے، اُسے شفعہ کہتے ہیں۔ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ

خریدار کو اس کا معاوضہ دے کر اس کی خریدی ہوئی زمین جبراً ملکیت کے حق کو شفعہ کہتے ہیں۔ ایک تعریف (یوں کی جاتی) ہے: ''شرکت یا پڑوس کی بنا پر خریدی ہوئی زمین کے ٹکڑے کو شفیع کا اپنی زمین کے ساتھ ملانا اور یہ (تعریف) زیادہ اچھی ہے''۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد 12، ص:101)

شُفعہ کی تعریف میں تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

وَشَرْعًا: تَمْلِيْكُ الْبُقْعَةِ جَبْرًا عَلَى الْمُشْتَرِي بِمَا قَامَ عَلَيْهِ بِمِثْلِهِ لَوْمِثْلِيًا، وَإِلَّا فَبِقِيْمَتِهٖ (وَسَبَبُهَا اِتِّصَالُ مِلْكِ الشَّفِيْعِ بِالْمُشْتَرٰى) بِشِرْكَةٍ أَوْجِوَارٍ۔

ترجمہ: ''شریعت میں شفعہ کے معنیٰ ہیں: خریدار کو ایک حصہ جس ثمنِ مثلی یا قیمت میں پڑا ہو، اُس حصہ کا جبراً کسی کو مالک بنانا ''شفعہ'' ہے اور اس کا سبب شفیع کی ملک کا فروخت شدہ زمین کے ساتھ اتصال ہے، خواہ شرکت کی وجہ سے اتصال ہو یا جوار (پڑوس) کی وجہ سے''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:261-260)

شُفعہ کب، کہاں اور کسے حاصل ہوتا ہے: حدیثِ پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَمْرِوبْنِ الشَّرِيْدِ قَالَ: وَقَفْتُ عَلَى سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ، فَجَاءَ الْمِسْوَرُ بْنُ مَخْرَمَةَ، فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلَى إِحْدَى مَنْكِبَيَّ، اِذْجَاءَ أَبُو رَافِعٍ مَوْلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: يَاسَعْدُ اِبْتَعْ مِنِّي بَيْتَيَّ فِي دَارِكَ، فَقَالَ سَعْدٌ: وَاللهِ مَاأَبْتَاعُهُمَا، فَقَالَ الْمِسْوَرُ: وَاللهِ لَتَبْتَاعَنَّهُمَا، فَقَالَ سَعْدٌ: وَاللهِ لَاأَزِيْدُكَ عَلَى أَرْبَعَةِ آلَافٍ مُنَجَّمَةً، أَوْمُقَطَّعَةً، قَالَ أَبُورَافِعٍ: لَقَدْ أُعْطِيْتُ بِهَا خَمْسَمِائَةِ دِيْنَارٍ، وَلَوْلَاأَنِّي سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: اَلْجَارُ أَحَقُّ بِسَقَبِهٖ، مَا أَعْطَيْتُكَهَا بِأَرْبَعَةِ آلَافٍ وَأَنَا أُعْطَى بِهَا خَمْسَمِائَةِ دِيْنَارٍ، فَأَعْطَاهَا اِيَّاهُ۔

ترجمہ: ''عمرو بن شرید بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس کھڑا ہوا تھا، اسی اثنا میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ آئے، پس انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ایک کندھے پر رکھا، اسی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ

آئے، تو انہوں نے کہا: اے سعد! تم مجھ سے اپنی حویلی کے دو گھر خرید لو، حضرت سعد نے کہا: اللہ کی قسم! میں ان دو گھروں کو نہیں خریدوں گا، حضرت مسور بن مخرمہ نے کہا: اللہ کی قسم! تم ان دو گھروں کو ضرور خریدو گے، تب حضرت سعد نے کہا: اللہ کی قسم! میں تم کو ان گھروں کے عوض چار ہزار درہم قسط وار سے زیادہ نہیں دوں گا، حضرت ابورافع نے کہا: مجھے ان گھروں کے عوض پانچ سو دینار مل رہے ہیں اور اگر میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ پڑوسی اپنے پڑوس کی وجہ سے خریدنے کا زیادہ حق دار ہے، تو میں تم کو یہ چار ہزار درہم کے عوض فروخت نہ کرتا جب کہ مجھے ان کے عوض پانچ سو دینار مل رہے ہیں پھر اُنہوں نے حضرت سعد کو وہ گھر فروخت کر دیئے"۔ (صحیح بخاری: 2258)

اس سے صحابیِ رسول کی خدا خوفی کا پتا چلتا ہے کہ جس جائیداد کے انہیں پانچ سو دینار مل رہے ہیں، اُسے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں چار ہزار درہم میں فروخت کر رہے ہیں اور ایک ہزار درہم کا نقصان برداشت کر رہے ہیں، لیکن ان کی نظر میں ارشادِ نبوی کی تعمیل کی اہمیت اس رقم سے بہت زیادہ ہے۔

(۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: اَلْجَارُ اَحَقُّ بِشُفْعَتِہٖ وَیُنْتَظَرُ بِہٖ اِنْ کَانَ غَائِبًا اِذَا کَانَ طَرِیْقُھُمَا وَاحِدًا۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پڑوسی اپنے پڑوس میں شُفعہ کرنے کا زیادہ حق دار ہے، اگر وہ غائب ہو تو اس کا انتظار کیا جائے گا، جبکہ اُن کا راستہ ایک ہو"۔ (سُنن ترمذی: 1369)

(۳) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: قَضٰی رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ بِالشُّفْعَۃِ فِیْ کُلِّ مَا لَمْ یُقْسَمْ، فَاِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ، وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ، فَلَا شُفْعَۃَ۔

ترجمہ: "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ ہر غیر منقسم (Undivided) چیز میں شُفعہ ہے اور جب حدود واقع ہو گئیں اور راستے تقسیم ہو گئے، تو اب شُفعہ نہیں (یعنی شرکت کی وجہ سے جو شُفعہ تھا، وہ اب

نہیں رہا)''۔ (صحیح بخاری:2257)

(۴) عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِيْ كُلِّ شِرْكَةٍ لَمْ تُقْسَمْ، رَبْعَةٍ أَوْ حَائِطٍ، لَا يَحِلُّ لَهٗ أَنْ يَبِيْعَ حَتّٰى يُؤْذِنَ شَرِيْكَهٗ، فَإِنْ شَاءَ أَخَذَ، وَإِنْ شَاءَ تَرَكَ، فَإِذَا بَاعَ وَلَمْ يُؤْذِنْهُ فَهُوَ أَحَقُّ بِهٖ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہر شرکت والے غیر منقسم مکان یا باغ میں رسول اللہ ﷺ نے شُفعہ کا فیصلہ فرمایا، اس کو شریک سے اجازت لیے بغیر فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اگر وہ (شریک) چاہے تو لے لے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے، پھر اگر وہ شریک کو خبر دیے بغیر فروخت کردے، تو شریک اُس کا زیادہ حق دار ہے''۔
(صحیح مسلم:4104)

حقِ شُفعہ اتّصال کے سبب حاصل ہوتا ہے اور اتّصال میں تین فریق شامل ہیں:
(۱) جس کی عینِ مبیع میں شرکت ہو۔ (۲) شرکت تھی، اب بٹوارا ہوگیا لیکن راستے اور پانی میں شراکت باقی ہے۔ (۳) پڑوسی

علامہ برہان الدین ابوبکر علی بن حسن الفرغانی حنفی لکھتے ہیں:
قَالَ: اَلشُّفْعَةُ وَاجِبَةٌ لِلْخَلِيْطِ فِيْ نَفْسِ الْمَبِيْعِ، ثُمَّ لِلْخَلِيْطِ فِيْ حَقِّ الْمَبِيْعِ، كَالشِّرْبِ وَالطَّرِيْقِ، ثُمَّ لِلْجَارِ، أَفَادَ هٰذَا اللَّفْظُ ثُبُوْتَ حَقِّ الشُّفْعَةِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْ هٰؤُلَاءِ، وَأَفَادَ التَّرْتِيْبَ۔

ترجمہ: ''(صاحب ''بدایۃ المبتدی'' نے) فرمایا: نفسِ مبیع میں جو شریک ہے، شُفعہ اُس کے لیے ثابت ہے، پھر جو حقِ مبیع میں شریک ہے، اُسے شُفعہ کا حق حاصل ہے، جیسے پانی کا گھاٹ یا کنواں اور راستہ مشترک ہو، پھر پڑوسی کے لیے، اِس لفظ (ثُمَّ) نے ان میں سے ہر ایک کے لیے حقِ شُفعہ کا فائدہ دیا اور ترتیب کا بھی فائدہ دیا''۔ (ہدایہ، جلد7، ص:3)

یعنی تینوں کا حقِ شُفعہ مساوی درجے میں نہیں ہے بلکہ اسی ترتیب کے مطابق ہے۔
جس کا عینِ مبیع میں حصہ ہو، اُسے ''شریک'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس کا حقوقِ مبیع میں

اشتراک ہو، اُس کو"خلیط" اور پڑوسی کو "شفیع" سے تعبیر کیا گیا ہے۔مزید لکھتے ہیں:

وَأَمَّا التَّرْتِيْبُ، فَلِقَوْلِهِ عليه السلام: اَلشَّرِيْكُ أَحَقُّ مِنَ الْخَلِيْطِ، وَالْخَلِيْطُ أَحَقُّ مِنَ الشَّفِيْعِ، فَالشَّرِيْكُ فِيْ نَفْسِ الْمَبِيْعِ، وَالْخَلِيْطُ فِيْ حُقُوْقِ الْمَبِيْعِ، وَالشَّفِيْعُ هُوَالْجَارُ، وَلِأَنَّ الاِتِّصَالَ بِالشَّرِكَةِ فِي الْمَبِيْعِ أَقْوٰى، لِأَنَّهُ فِيْ كُلِّ جُزْءٍ، وَبَعْدَهُ الاِتِّصَالُ فِي الْحُقُوْقِ، لِأَنَّهُ شَرِكَةٌ فِيْ مَرَافِقِ الْمِلْكِ، وَالتَّرْجِيْحُ يَتَحَقَّقُ بِقُوَّةِ السَّبَبِ، وَلِأَنَّ ضَرَرَ الْقِسْمَةِ إِنْ لَمْ يَصْلُحْ عِلَّةً صَلَحَ مُرَجِّحًا۔

ترجمہ: "بہر حال نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق (حق شفعہ) میں ترتیب یہ ہے کہ شریک خلیط سے زیادہ حق دار ہے اور خلیط شفیع سے زیادہ حق دار ہے، شریک نفس مبیع میں ہے اور خلیط حقوقِ مبیع (جیسے راستہ، پانی وغیرہ) میں اور شفیع پڑوسی ہے اور اس لیے مبیع میں شرکت کی صورت میں اتصال زیادہ قوی ہے کہ یہ ہر جُزء میں ہے اور اس کے بعد حقوق میں اتصال ہے، اس لیے کہ یہ منافع ملک میں اتصال ہے اور ترجیح سبب کی قوت سے پیدا ہوتی ہے اور تقسیم کا نقصان اگرچہ علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، (مگر) ترجیح دینے (Preference) کی صلاحیت تو رکھتا ہے"۔(ہدایہ، جلد7،ص:6)

خلیط سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کی اپنی ملکیتی زمین اس زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہے، جس پر شفعہ کیا جارہا ہے، کیونکہ یہ دونوں زمین سے متعلق حقوق (مثلاً راستہ، پانی کا کنواں یا نالی وغیرہ) میں شریک ہوتے ہیں۔یعنی اصل سبب اِتّصال (Adjacency) یعنی باہم ملا ہوا ہونا ہے، تو اِتّصال جس قدر قوی ہوگا، شُفعہ کی بنا پر خریداری کا جبری حق بھی اُتنا ہی قوی ہوگا اور ملکیت میں شرکت کا اتصال حقوق میں شرکت سے زیادہ ہے۔

علامہ برہان الدین ابوبکر علی بن حسن الفرغانی حنفی نے شُفعہ کے متعلق جو لکھا ہے، آسان الفاظ میں اُس کا مفہوم درج ذیل ہے:

(۱) ایک شخص زمین کی ملکیت میں شریک ہے اور اُس کا دوسرا شریک اپنا حصہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو اِس شریک کا حق سب سے مقدم ہے۔

(۲) ایک شخص فروخت کی جانے والی زمین کی ملکیت میں تو شریک نہیں ہے، لیکن اس کی زمین اس کے ساتھ متصل ہے اور اس بنا پر دونوں کا راستہ مشترک ہے یا پانی کا کنواں یا گھاٹ مشترک ہے، تو اسے فقہ کی اصطلاح میں ''خلیط'' کہتے ہیں۔ شریک کے بعد بطور شفیع پھر اُس خلیط کا حق مُقدّم ہے، یعنی یہ اصل مبیع میں تو شراکت نہیں ہے لیکن حقوق ومنافع میں شراکت ہے۔

(۳) ایک شخص کی زمین دوسرے شخص کی زمین کے ساتھ متصل ہے، نہ ملکیت میں شراکت ہے اور نہ حقوق ومنافع میں، بس صرف پڑوس کی بنا پر اُس کی زمین دوسرے شخص کی زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہو اور وہ اُسے فروخت کرنا چاہتا ہے، تو پھر کسی بھی دوسرے غیر متعلق خریدار کے مقابلے میں حقِ اتصال کی بنا پر اُس پڑوسی کا حق مُقدّم ہے، خواہ فروخت کرنے والے کی مرضی ہو یا نہ ہو، اسی بنا پر اس حق کو جبری یا اجباری کہا جاتا ہے، یعنی یہ بائع کی مرضی کے برعکس بھی نافذ ہوجاتا ہے اور کسی بھی دوسرے شخص کے ساتھ اُس کی بیع کالعدم ہوجاتی ہے۔

آپ کے بیان کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ سیاہ پاد اور سو پک فریقِ اول ہیں اور یہ ان کی مشترکہ زمین تھی۔ پھر فریقِ دوم گرگناڑی قبیلے کے توسط سے فریقِ سوم محمد صالح گورانجو کو اس طور پر دی کہ تم اسے آباد کرو، نفع کا نصف حصہ تمہارا ہوگا۔ پھر فریقِ سوم محمد صالح نے فریقِ دوم کی اجازت اور موجودگی میں فریق اول کے پورے حصے کو خریدا۔ اب عینِ مبیع میں سیاہ پاد، سو پک اور گرگناڑی اور فریقِ سوم صالح محمد گورانجو شریک ہیں، صالح محمد گورانجو کے بیٹوں اور بھتیجوں نے فریقِ دوم گرگناڑی سے ان کے حصے کا 16 واں حصہ خریدا ہے، جائیداد میں شریک ہونے کی وجہ سے حقِ شفعہ میں انہی کو ترجیح دی جائے گی، لہٰذا عبدالواحد ساسولی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

شراکتی کاروبار میں نقصان کا ضمان

سوال:

اکبر نے مجھے کچھ رقم دی کہ تم اِس رقم سے کاروبار کرو، جو نفع ہوگا، اُس کا 30 فیصد تمہارا اور 70 فیصد میرا ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں 40 فیصد لوں گا، اگر نقصان ہوا تو میں ذمہ دار ہوں تمہاری پوری رقم واپس دوں گا۔ اس کی شرعی حیثیت بیان فرمائیں''۔

(محمد شعبان، لاہور)

جواب:

آپ اُس شخص سے عقدِ مُضاربت کر سکتے ہیں اور یہ جائز ہوگا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ مُضاربت میں ربُّ المال (Capital Provider) اور مضارِب (Working Partner) کے درمیان منافع کی تقسیم کا تناسب (Ratio) پہلے سے طے ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں تنازع پیدا نہ ہو۔ اور اگر خدانخواستہ نقصان ہو تو مضارِب کی محنت ضائع ہوگی اور بے ثمر رہے گی اور ربُّ المال سارا نقصان برداشت کرے گا۔ نقصان کی صورت میں حاصل شدہ کل نفع سے اُس کی تلافی کی جائے گی، تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: (وَمَاهَلَكَ مِنْ مَالِ الْمُضَارَبَةِ يُصْرَفُ إِلَى الرِّبْحِ) لِأَنَّهُ تَبَعٌ (فَإِنْ زَادَ الْهَالِكُ عَلَى الرِّبْحِ لَمْ يَضْمَنْ)

ترجمہ: ''مالِ مضاربت میں سے جو مال ہلاک ہوا، اس کی کمی نفع سے پوری کی جائے گی، کیونکہ نفع اصل زر (رأس المال) کے تابع ہے، پس اگر نقصان اتنا ہوا کہ نفع سے اس کو پورا نہیں کر سکتا، تو مضارب پر ضمان نہیں ہے (بلکہ یہ نقصان ربُّ المال پر عائد ہوگا)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 8، ص: 385)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: رَجُلٌ دَفَعَ لِآخَرَ أَمْتِعَةً وَقَالَ بِعْهَا وَاشْتَرِهَا وَمَا رَبِحْتَ فَبَيْنَنَا نِصْفَيْنِ فَخَسِرَ فَلَا خُسْرَانَ عَلَى الْعَامِلِ۔

ترجمہ: ''ایک شخص (ربُّ المال) نے دوسرے شخص (مُضارِب) کو کچھ سامان دیا اور کہا:

اس سے خرید وفروخت (یعنی کاروبار) کرو اور جو نفع آئے، وہ ہمارے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا اور (اگر بالفرض) اُسے (کاروبار میں) نقصان ہوگیا، تو عامل (یعنی مُضارِب) کے ذمے نقصان میں سے کچھ نہیں آئے گا (بس اسے صرف محنت کا اجر نہیں ملے گا)''۔

(ردالمحتار، جلد:8، ص:374)

مُضاربت میں نفع کا تناسب باہمی رضامندی سے طے کرنا جائز ہے، البتہ آپ کی بیان کردہ صورت میں آپ کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سارا نقصان میں برداشت کروں گا۔ آپ کا نقصان میں زیادہ سے زیادہ حصہ اس کاروبار میں حاصل شدہ نفع کی حد تک ہے، خدانخواستہ نقصان اس سے زیادہ ہوجائے، تو اُس کا بار ربُّ المال پر آئے گا۔

حدِّ سرقہ کے لیے شرعی ثبوت ضروری ہے

سوال:

ایک گاؤں میں ایک شخص کے یہاں چوری ہوئی، چور کے بارے میں جاننے کے لیے اسپیشل ٹریننگ یافتہ کتے منگوائے گئے، وہ کتے ایک گھر میں پہنچ گئے۔ گاؤں والوں کا جرگہ ہوا، جرگے نے فیصلہ دیا کہ یہ گھر والے تو چوری میں مُلوّث نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا دوبارہ کتے منگوائے گئے، وہ پھر اُسی گھر میں پہنچ گئے۔ جرگہ دوبارہ ہوا، فیصلہ یہ ہوا کہ اگرچہ یہ گھر والے چوری میں مُلوث نہیں ہیں، لیکن چور کہیں ان کے گھر آکر بیٹھا تھا، اِسی وجہ سے کتے یہاں آئے ہیں۔ لہٰذا ان گھر والوں پر دولاکھ روپے بطورِ تعزیر ڈال دیے گئے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ: کیا ان کتوں کی شہادت قابلِ عمل ہے اور جرگے کا فیصلہ درست ہے؟

(قاری صادق حسین، پہلوان گوٹھ، گلستانِ جوہر کراچی)

جواب:

چوری کے ثبوت کے دوطریقے ہیں ایک یہ کہ چور عدالت کے سامنے خود اقرار کرے، دوسرا یہ کہ دو مرد گواہی دیں اور وہ شہادت عدالت کے لیے قابل قبول ہو، اس صورت میں اگر اسلام کا قانون نافذ ہے، تو اس پر حدِّ سرقہ یعنی ہاتھ کلائی سے کاٹنے کی سزا نافذ ہوگی

اور چوری شدہ مال بھی مالک کو واپس کرنا پڑے گا۔لیکن حدِ سرقہ کے نفاذ کے لیے کُتبِ فقہ میں تفصیلی اَحکام ہیں۔تفتیش کے لیے کتوں کا استعمال یا کسی دوسرے ذرائع سے مدد لینا تو ممکن ہے لیکن اِسے سو فیصد درست قرار دے کر اس معنی میں بطور شہادت تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے نتیجے میں چور پر حدِ سرقہ نافذ کردی جائے۔ہاں !اگر کتے کی نشاندہی کی صورت میں کسی شخص کے گھر سے چوری شدہ مال برآمد ہوجاتا ہے،تو وہ مال اصل مالک کے حوالے کردیا جائے گا۔اس سلسلے میں ملکی قانون کیا کہتا ہے؟کسی ماہر وکیل سے مشورہ کیا جائے۔اِس کی بنیاد پر چور کا سراغ لگایا جاسکتا ہے لیکن کسی شخص کو چور قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جرگے کا فیصلہ درست نہیں،شریعت میں مالی جرمانہ جائز نہیں ہے،ہاں !کوئی شخص اگر کسی شخص کا مال ضائع کردے تو اس سے مال کی قیمت لی جاسکتی ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ: اَلْمَالُ بِالْمَالِ یعنی اگر کسی کا مالی نقصان ہوجائے تو وہ اس کے بدلے مال لے سکتا ہے۔

شریعت میں تعزیر بالمال منسوخ ہے،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

مَعْنَی التَّعْزِیْرِ بِاَخْذِ الْمَالِ عَلَی الْقَوْلِ بِہٖ اِمْسَاکُ شَیْءٍ مِنْ مَالِہٖ عِنْدَہٗ مُدَّۃً لِیَنْزَجِرَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ الْحَاکِمُ اِلَیْہِ ،لَا اَنْ یَاْخُذَہٗ الْحَاکِمُ لِنَفْسِہٖ اَوْ لِبَیْتِ الْمَالِ ،کَمَا یَتَوَھَّمُہُ الظَّلَمَۃُ ، اِذْلَایَجُوْزُ لِاَحَدٍ الْمُسْلِمِیْنَ اَخْذُ مَالِ اَحَدٍ بِغَیْرِ سَبَبٍ شَرْعِیٍّ۔ ۔ ۔وَفِی ''شَرْحِ الْآثَارِ'': اَلتَّعْزِیْرُ بِالْمَالِ کَانَ فِی اِبْتِدَاءِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ نُسِخَ۔

ترجمہ:''(جن فقہاء کرام نے)تعزیر بالمال (یعنی مالی جرمانے کے جواز کی)بات کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کا وہ مال کچھ مدت کے لیے روک لیا جائے تاکہ وہ جرم سے باز آجائے، پھر حاکم وہ مال واپس کردے گا، یہ معنی نہیں کہ حاکم اس مال کو اپنے لیے یا بیت المال کے لیے وصول کرے جیسا کہ ظالم (حکمرانوں) نے سمجھ رکھا ہے، کیونکہ کسی مسلمان کے لیے شرعی جواز کے بغیر کسی دوسرے مسلمان کا مال لینا جائز نہیں ہے۔''شرح الآثار'' میں ہے کہ تعزیر بالمال ابتدائے اسلام میں جائز تھی، پھر منسوخ ہوگئی''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد6،ص:77)

کسی جرگے یا پنچایت وغیرہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے، اُنہیں اس سے باز آنا چاہیے۔مُجاز عدالتیں ثبوت وشواہد کی بنیاد پر سزا دے سکتی ہیں۔

سورۃ النسا کی آیت:105 کا ترجمہ ہے:''بیشک ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا کرنے والے نہ بنیں''۔

اس آیت کے سببِ نزول میں مُفسّرین نے سُنن ترمذی کی حدیث نمبر:3036 کے حوالے سے لکھا ہے کہ''یہ چند آیات ایک واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جو عہدِ رسالت میں وقوع پذیر ہوا تھا۔انصار کے بنی ظفر قبیلے کے ایک شخص مسمّٰی طعمہ بن اُبیرق نے اپنے ہمسایہ قتادہ بن نعمان کے مکان میں نقب لگا کر کچھ زِرہیں اور آٹے کی بوری چرالی اور ایک یہودی زید بن سمین کے ہاں جاکر رکھ آیا۔صبح ہوئی اور حضرت قتادہ کو جب چوری کا پتا چلا تو اُنہوں نے اپنے پڑوسی طعمہ سے دریافت کیا، اُس نے صاف انکار کردیا اور قسم کھائی کہ مجھے اس کے متعلق علم تک نہیں۔اتفاق یہ ہوا کہ آٹے کی بوری میں سوراخ تھا،جس سے آٹا گرتا گیا، اُنہوں نے اس گرے ہوئے آٹے کے نشانات کا پیچھا کیا، چنانچہ وہ یہودی کے مکان تک پہنچ گئے۔تلاش کرنے پر مالِ مسروقہ برآمد ہوگیا، اُس یہودی نے کہا کہ میں چور نہیں بلکہ میرے پاس طعمہ یہ چیزیں رکھ گیا ہے۔کئی یہودیوں نے اس کی تصدیق کی،طعمہ کے قبیلہ والوں نے کہا: چلو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چلیں، چنانچہ سب حاضر ہوئے، بنوظفر کو اب علم ہو چکا تھا کہ چور یہودی نہیں بلکہ طعمہ ہے لیکن اپنی بدنامی کے خوف سے وہ طعمہ کو ہر طریقہ سے بری ثابت کرنا چاہتے تھے، اس لیے اس کی حمایت میں بڑی سرگرمی دکھانے لگے، حتیٰ کہ حضور کی جناب میں بھی عرض کرنے لگے کہ اگر فیصلہ طعمہ کے خلاف ہوا تو بے چارا ہلاک ہوجائے گا اور ذِلّت ورسوائی کی کوئی حد نہ رہے گی اور یہودی جو اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہے، وہ صاف بری ہوجائے گا ،حضور ﷺ کو بھی خیال گزرا کہ بنوظفر جو مسلمان ہیں، سچے ہوں گے، (چنانچہ کوئی فیصلہ صادر ہونے سے پہلے وحی الٰہی پہنچ گئی، جس میں

حقیقتِ حال آشکارا ہوگئی) ارشادِ ربانی ہوا: ''ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تا کہ آپ اس علم یقینی کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا کریں جو آپ کو اپنے رب کی طرف سے عطا فرمایا گیا ہے''۔ (ضیاء القرآن، جلد اول، ص: 386-385)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے ہاں چوری کے سامان کا برآمد ہونا بھی اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اسی نے چوری کی ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی کا مال چوری کر کے کسی کے ہاں اُس کی لاعلمی میں رکھ آئے یا اُس کو بتا کر رکھے لیکن اس کو یہ نہ بتائے کہ یہ چوری کا سامان ہے، جس طرح یہودی کے ہاں بعض نشانیوں کی وجہ سے مال برآمد ہوا۔ مزید یہ کہ عدل بے لاگ ہونا چاہیے نہ کہ اپنے اور غیر کے لیے معیار الگ الگ ہو۔ آپ کے بیان کردہ واقعے میں تو محض کتے کی مُخبری ہے، چوری کا مال بھی برآمد نہیں ہوا۔ یہ محض ظنی چیزیں ہیں، جبکہ حدود اللہ کے لیے قطعی ثبوت درکار ہوتا ہے۔

استحقاق کے بغیر ملنے والے اضافے کا شرعی حکم

سوال:

زید 42 سالہ گورنمنٹ ملازمت سے ریٹائر ہوا ہے، اس دورانیے میں متعدد ترقیاں ملیں، ایک مرحلے پر اس کی تنخواہ میں ایک سالانہ وظیفہ اضافی ملا، جس کا استحقاق اسے حاصل نہیں تھا، یہ سالانہ وظیفہ وہ تقریباً 22 سال تک لیتا رہا۔ جب پینشن کے کاغذ تیار ہوئے، AG آفس نے پڑتال کی تو تین سالانہ وظیفے کم کر کے حساب کتاب بے باق کر دیا۔ اس اثنا میں زید کو پتا چلا کہ سپریم کورٹ نے آرڈر دیا ہے کہ پینشنر سے کسی غلطی کے نتیجے میں کوئی کٹوتی نہیں کی جائے گی۔ لہٰذا زید نے AG آفس کو درخواست دی اور AG آفس دو سالانہ وظیفے پر پینشن کے بقایا جات دینے کو تیار ہو گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اضافی رقم زید کو لینی چاہیے یا نہیں جبکہ 23 سال اضافی رقم سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔

(غلام یاسین سومرو، کراچی)

جواب:

آپ کے بیان کے مطابق زید نے ماضی میں قواعد وضوابط کے خلاف اپنی مقررہ تنخواہ سے اضافی رقم لی ہے۔سوال میں یہ بھی واضح نہیں ہے کہ اُس نے کسی مُجاز اتھارٹی کے ساتھ ملی بھگت کر کے یا رشوت دے کر یہ اضافی فائدہ حاصل کیا ہے، کیونکہ اس صورت میں تو دونوں مجرم قرار پائیں گے۔غلطی سے تو بظاہر یہ مراد ہوتا ہے کہ غیر ارادی طور پر یا متعلقہ عملے کے صرفِ نظر یا تساہل سے ایسا ہوگیا ہے،جیسے کمپیوٹر میں Miss Feeding ہو جاتی ہے۔حکومت کے قوانین میں اس کی گنجائش نہیں ہے،تو یہ سارا عمل ناجائز ہے،خواہ اس سے استفادے کی مدت کم ہو یا زیادہ، یہ رقم اُسے سرکاری خزانے میں جمع کردینی چاہیے اور اس پر پنشن میں حاصل ہونے والا اضافہ بھی درست نہیں ہے۔لیکن اگر افسرانِ اعلیٰ کے علم میں یہ بات آچکی تھی اور انہوں نے سروسز رول کے تحت اسے جاری رکھا،تو درست ہے اور اس پر پنشن میں حاصل ہونے والا اضافی فائدہ بھی درست ہے۔جب تک سپریم کورٹ کا فیصلہ سامنے نہ ہو، ہم اس پر کوئی رائے دینے سے قاصر ہیں،بہتر یہ ہے کہ اس پر سپریم کورٹ کے فیصلے کا انتظار کیا جائے، کیونکہ اپنے کسی سابق فیصلے کی وہ خود بہتر طور پر تعبیر وتشریح (Interpretation) کرسکتی ہے اور اسے قانون کا درجہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے سے ہی واضح ہوگا کہ ''غلطی'' سے کیا مراد ہے۔

ویزوں کی خرید وفروخت

سوال:

میرا بھائی PIA میں جاب کرتا ہے،غیر ملکی کمپنیاں پاکستانیوں کو جاب آفر کرتی ہیں اور ویزے جاری کرتی ہیں۔میرے بھائی ان کمپنیوں سے ویزے خرید لیتے ہیں اور کچھ منافع (مثلاً فی ویزا ایک لاکھ یا پچاس ہزار روپے) لے کر ضرورت مند لوگوں کو فروخت کردیتے ہیں۔کیا میرے بھائی کا یہ منافع لینا یا ویزے زیادہ قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے؟۔

(ارسلان،حیدرآباد)

جواب:

ویزا اگر کسی خاص شخص کے نام پر جاری ہوا ہے، تو اس کے استعمال کرنے کا حق اُسی کو حاصل ہے، اس میں رَدوبدل کرنا شرعاً وقانوناً ناجائز ہے البتہ جو شخص ویزوں کا کاروبار کرتا ہے اور وہ ویزے بیرونِ ملک اپنی کلائنٹ کمپنی سے جاب کے حوالے سے لیتا ہے، مثلاً انجینئر، اکاؤنٹنٹ، ڈاکٹر، الیکٹریشن، معمار، مزدور وغیرہ کہ جو اُس اہلیت کا حامل (Bearer) ہو، وہ اس پر سعودی عرب کے سفارتخانے یا قونصل خانے سے اپنے پاسپورٹ پر ویزا الگوا سکتا ہے، تو ویزا خریدنے والا جسے چاہے، اُسے فروخت کرسکتا ہے۔ بعض صورتوں میں ویزا جاری کرنے والا ادارہ اپنے ریکروٹمنٹ ایجنٹ کو مختلف کاموں (Jobs) کے لیے مفت ویزے جاری کرتا ہے اور وہ انہیں کمیشن بھی دیتا ہے، تو اس صورت میں انہیں لوگوں سے مزید رقم نہیں لینی چاہیے۔ الغرض یہ ویزہ جاری کرنے والے اور ویزہ حاصل کرنے والے فرد یا ادارے کی معاہدے کی شرائط پر منحصر ہے۔ یہ حقوق کی بیع ہے، جو آج کل رائج ہے اور اگر یہ کاروباری بنیاد پر ہے تو وہ شخص اس پر نفع لے سکتا ہے، کاروبار نفع ہی کے لیے ہوتا ہے، نفع کا مدار طلب اور رَسد پر ہوتا ہے، لیکن نفع منصفانہ ہو تو اچھا ہے، لوگوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ویزا اگر اشخاص کے نام پر ہے اور کوئی شخص یا ادارہ متعلقہ ملک کے سفارت خانے سے ویزا الگوا کر ضرورت مند شخص کو دینے پر اجرت لے سکتا ہے، اسے اجارت الخدمات (Contract of Service) کہتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنی اجرت اجیر (Employee) اور مستاجر (Employer) کے ساتھ طے کرلے، کیونکہ وہ مستاجر کو اس کی مطلوبہ قابلیت کے افراد فراہم کرنے میں اور اجیر کو ملازمت فراہم کرنے میں مدد کرتا ہے، کیونکہ کسی بھی عقد کی شرائط کا پہلے سے طے ہونا ضروری ہے کہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو۔

کتے کی خرید وفروخت کا شرعی حکم

سوال:

میں ایک فلیٹ میں رہتا ہوں، جس کی چھت کافی بڑی ہے۔ میں اعلیٰ نسل کے کتوں (Dogs) کا کاروبار کرنا چاہتا ہوں، میں یہ بزنس اُس کی چھت پر کرنا چاہتا ہوں، کیا یہ بزنس اسلامی لحاظ سے جائز ہے؟، (شہر یار)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے: عَنْ أَبِی مَسْعُودٍ الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغِيِّ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت، فاحشہ کی اجرت اور کاہن کی مٹھائی سے منع فرمایا''۔

(صحیح بخاری:2237، صحیح مسلم:1567)

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ، وَالسِّنَّوْرِ إِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شکاری کتے کے سوا کتے اور بلی کی قیمت سے منع فرمایا ہے''۔ (سنن نسائی:4682)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

اَلْاَوَّلُ ثَمَنُ الْكَلْبِ احْتَجَّ بِهٖ جَمَاعَةٌ عَلٰى أَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ بَيْعُ الْكَلْبِ مُطْلَقًا. اَلْمُعَلَّمُ وَغَيْرُهٗ وَمِمَّا يَجُوْزُ اِقْتِنَاؤُهٗ أَوْ لَا يَجُوْزُ وَأَنَّهٗ لَا ثَمَنَ لَهٗ وَإِلَيْهِ ذَهَبَ الْحَسَنُ وَمُحَمَّدُ بْنُ سِيْرِيْنَ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ أَبِيْ لَيْلٰى وَالْحَكَمُ وَحَمَّادُ بْنُ أَبِيْ سُلَيْمَانَ وَرَبِيْعَةُ وَالْاَوْزَاعِيُّ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَإِسْحَاقُ وَأَبُوْ ثَوْرٍ وَابْنُ الْمُنْذِرِ وَأَهْلُ الظَّاهِرِ وَهُوَ إِحْدَى الرِّوَايَتَيْنِ عَنْ مَالِكٍ.

وَقَالَ ابْنُ قُدَامَةَ: لَا يَخْتَلِفُ الْمَذْهَبُ فِيْ أَنَّ بَيْعَ الْكَلْبِ بَاطِلٌ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَكَرِهَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ ثَمَنَ الْكَلْبِ، وَرَخَّصَ فِيْ ثَمَنِ كَلْبِ الصَّيْدِ خَاصَّةً جَابِرٌ وَبِهٖ قَالَ عَطَاءٌ وَالنَّخَعِيُّ

وَاختلف أَصحَابُ مَالِكٍ فَمِنهُم مَن قَالَ: لَا يَجُوزُ وَمِنْهُم مَن قَالَ: اَلكَلبُ المَاذونُ فِي إِمسَاكِهِ يُكْرَهُ بَيعُهُ وَيَصِحُّ وَلَا تَجُوزُ إِجَارَتُهُ نَصَّ عَلَيهِ أَحمَدُ وَهٰذَا قَولُ بَعضِ أَصحَابِ الشَّافِعِي وَقَالَ بَعضُهُمْ يَجُوزُ وَقَالَ مَالِكٌ فِي (المُوْطَا) أَكرَهُ ثَمَنَ الكَلبِ الضَّارِي وَغَيرِالضَّارِي لِنَهْيِهِ عَن ثَمنِ الْكَلبِ وَفِي (شَرحِ المُوْطَا) لِابنِ زَرقُونَ: وَاختَلَفَ قَولُ مَالِكٍ فِي ثَمَنِ الْكَلبِ الْمُبَاحِ اِتِّخَاذُهُ فَاَجَازَهُ مَرَّةً وَمَنَعَهُ أُخرىٰ وَبِإِجَازَتِهٖ قَالَ ابْنُ كِنَانَةَ وَأَبُوحَنِيفَةَ، وَاحتَجُوا بِمَا رُوِيَ فِي هٰذَا الْبَابِ بِالأَحَادِيثِ الَّتِي فِيهَا مَنْعُ بَيعِ الْكَلْبِ وَحُرمَةُ ثَمَنِهِ وَخَالَفَهُمْ فِي ذٰلِكَ جَمَاعَةٌ وَهُم عطاءُ بنُ أَبِي رَبَاحٍ وَإِبرَاهِيمُ النَّخْعِيُّ وَأَبُوحَنِيفَةَ وَأَبُويُوسُفَ وَمُحَمّدٌ وَابنُ كِنَانَةَ وَسَحنُونَ مِنَ المَالِكِيَّةِ ومَالِكٍ فِي رِوَايَةٍ، فَقَالُوا: اَلكلابُ الَّتِي يُنتَفَعُ بِهَا يَجُوزُ بَيعُهَا وَيُبَاحُ أَثْمَانُهَا وَعَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّ الْكَلْبَ الْعَقُورَ لَا يَجُوزُ بَيعُهُ وَلَا يُبَاحُ ثَمَنُهُ

ترجمہ: ''فقہاء کی ایک جماعت نے ان احادیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ کتوں کی بیع مُطلقاً ناجائز ہے، خواہ کتے سدھائے ہوئے ہوں یا نہ ہوں، خواہ ان کا رکھنا جائز ہو یا ناجائز، ہرحال میں ان کی قیمت باطل اور حرام ہے۔ حسن بصری، محمد بن سیرین، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، حَکَم، حماد بن ابی سلیمان، ربیعہ، اوزاعی، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوثور، ابن المنذر اور اہلِ ظاہر کا یہی موقف ہے۔ امام مالک سے بھی ایک روایت یہی ہے اور علامہ ابن قدامہ نے کہا: اس بارے میں مذہب حنبلی میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کتے کی بیع ہر صورت میں باطل ہے اور حضرت ابوہریرہ نے کتے کی قیمت کو مکروہ کہا ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے خاص طور پر شکاری کتے کی قیمت میں رخصت دی ہے اور امام عطاء اور امام نخعی کا بھی یہی قول ہے۔ اور اصحابِ مالک اس بارے میں مختلف الرائے ہیں، ان میں سے بعض نے کہا: جس کتے کو (شریعت میں) رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کی بیع کراہت کے ساتھ جائز ہے اور اس کا کرائے پر دینا جائز نہیں ہے، اس پر امام احمد کی نص ہے اور یہی بعض اصحاب شافعی کا قول ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں کہا: کتا خواہ شکاری ہو

یا غیر شکاری، میں ہر قسم کے کتے کی قیمت کو مکروہ قرار دیتا ہوں، کیونکہ نبی ﷺ نے کتے کی قیمت سے منع فرمایا ہے۔ابن زرقون نے شرح المؤطا میں لکھا ہے کہ: جس کتے کا رکھنا مباح ہے، اس کی قیمت کے بارے میں امام مالک کے اقوال مختلف ہیں، بعض اقوال میں اس کی اجازت دی ہے اور بعض اقوال میں منع کیا ہے۔ابن کنانہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اُس کتے کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، جس کا رکھنا مباح ہے۔

جو فقہاء کتے کی بیع کو مطلقاً ممنوع قرار دیتے ہیں، وہ اس باب کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں، اس کے برخلاف عطا بن ابی رباح، ابراہیم نخعی، امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد، ابن کنانہ، سحنون مالکی اور ایک روایت کے مطابق امام مالک یہ کہتے ہیں کہ جن کتوں سے نفع حاصل کرنا شرعاً جائز ہے، ان کی بیع بھی جائز ہے اور ان کی قیمت مباح ہے اور امام ابوحنیفہ سے ایک روایت یہ ہے کہ کاٹنے والے کتے کی بیع جائز نہیں ہے اور نہ اس کی قیمت مباح ہے''۔(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد12،ص:83-82)

امام المفسرین والمحدثین علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ جن احادیث میں بالعموم کتے کی بیع یا اس کی قیمت سے منع کیا ہے، وہ اُن کتوں کے ماسوا پر محمول ہیں، جن کو رکھنے کی اجازت دی گئی ہے اور اس تخصیص پر ایک قرینہ تو یہ احادیث ہیں، جن میں شکاری کتے کی بیع کی اجازت دی گئی ہے اور دوسرا قرینہ وہ احادیث ہیں، جن میں شکاری کتوں اور کھیت اور مویشیوں کی حفاظت کے کتوں کو رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، جن (احادیث) کی صحت پر اتفاق ہے اور اگر ان کتوں کی بیع ناجائز ہو تو پھر ان کو رکھنے کی اجازت کا کوئی معنی نہیں ہے''۔(شرح صحیح مسلم، جلد4،ص:300)

عَنْ جَابِرِبْنِ عَبْدِ اللّٰہِ یَقُوْلُ: أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِقَتْلِ الْکِلَابِ، حَتّٰی اِنَّ الْمَرْأَۃَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِیَۃِ بِکَلْبِھَا فَنَقْتُلُہٗ، ثُمَّ نَھَی النَّبِیُّ ﷺ عَنْ قَتْلِھَا، وَقَالَ عَلَیْکُمْ بِالْأَسْوَدِ الْبَھِیْمِ ذِی النُّقْطَتَیْنِ، فَإِنَّہٗ شَیْطَانٌ۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں

کُتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، حتّٰی کہ کوئی عورت دیہات سے اپنا کتا لے کر آتی، تو ہم اس کُتے کو بھی قتل کر دیتے، پھر نبی ﷺ نے اس کو قتل کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا: اس کالے کُتے کو قتل کر دو جو دو نقطے والا ہو، کیونکہ وہ شیطان ہے''۔ (صحیح مسلم:3996)

عَن ابنِ مُغفل، قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقَتلِ الْكِلَابِ، ثُمَّ قَالَ: مَا بَالُهُم وَبَالُ الكِلَابِ؟، ثُمَّ رَخَّصَ فِي كَلبِ الصَّيدِ وَكَلبِ الغَنَمِ

ترجمہ:''حضرت ابن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کُتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، پھر فرمایا: کُتے لوگوں کو کیا تکلیف دیتے ہیں؟، پھر آپ نے شکاری کُتے اور بکریوں (کی حفاظت) کے کُتوں کی اجازت دی''۔ (صحیح مسلم:1573)

علامہ بدرالدین عینی حنفی مزید لکھتے ہیں:

وَهٰكَذَا أَجَابَ الطَّحَاوِيُّ عَنِ الأَحَادِيثِ الَّتِي فِيهَا النَّهْيُ عَن ثَمَنِ الْكَلبِ وَأَنَّهُ سُحتٌ، فَقَالَ: إِنَّ هٰذَا إِنَّمَا كَانَ حِينَ كَانَ حُكمُ الْكِلَابِ أَن تُقْتَلَ وَلَا يَحِلُّ إِمسَاكُ شَيْئٍ مِنهَا وَلَا الِانتِفَاعُ بِهَا وَلَا شَكَّ أَن مَا حَرُمَ الِانتِفَاعُ بِهٖ كَانَ ثَمنُهُ حَرَاماً فَلَمَّا أَبَاحَ رَسُولُ اللهِ الِانتِفَاعَ بِهَا لِلِاصطِيَادِ وَنَحوِهٖ مَا نُهِيَ عَن قَتلِهَا، نَسَخَ مَا كَانَ مِنَ النَّهْيِ عَن بَيعِهَا وَتَنَاوُلِ ثَمَنِهَا، فَإِنْ قُلتَ مَا وَجهُ هٰذَا النَّسخِ قُلتُ: وَجهُهٗ ظَاهِرٌ وَهُوَ أَنَّ الأَصلَ فِي الأَشيَاءِ الإِبَاحَةُ فَلَمَّا وَرَدَ النَّهْيُ عَنِ اتِّخَاذِ الْكِلَابِ وَوَرَدَ الأَمرُ بِقَتلِهَا عَلِمنَا أَنَّ اِتِّخَاذَهَا حَرَامٌ وَأَنَّ بَيعَهَا حَرَامٌ أَيضًا لِأَنَّ مَا كَانَ اِنتِفَاعُهٗ حَرَامًا قِيمَتُهٗ حَرَامٌ كَالْخِنزِيرِ وَنَحوِهٖ ثُمَّ لَمَّا وَرَدَتِ الإِبَاحَةُ بِالِانتِفَاعِ بِهَا لِلِاصطِيَادِ وَنَحوِهٖ وَوَرَدَ النَّهْيُ عَن قَتلِهَا عَلِمنَا أَنَّ مَا كَانَ قَبلَ ذٰلِكَ مِنَ الْحُكمَينِ الْمَذكُورَينِ قَدِ انتَسَخَ بِمَا وَرَدَ بَعدَهٗ وَلَا شَكَّ أَنَّ الْاِبَاحَةَ بَعدَ التَّحرِيمِ نسخٌ لِذٰلِكَ التَّحرِيمِ وَرَفعَ لِحُكمِهٖ وَسَيَأتِي زِيَادَةُ بَيَانٍ فِي الْمُزَارَعَةِ وَغَيرِهَا۔

ترجمہ:''جن احادیث میں کُتے کی قیمت سے منع کیا ہے اور اس کو حرام فرمایا ہے، امام طحاوی نے ان احادیث کے جواب میں یہ کہا ہے کہ یہ ممانعت اس وقت تھی، جب کُتوں کو قتل

کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اس وقت کسی کتے کو رکھنا حلال نہیں تھا اور نہ اس وقت کسی کتے سے فائدہ اٹھانا جائز تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس چیز سے نفع اٹھانا حرام ہو، اس کی قیمت بھی حرام ہے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے کتوں سے شکار کرنا مباح کردیا اور اس سے نفع اٹھانا جائز قرار دے دیا اور اس کو قتل کرنے سے منع فرمادیا، تو کتوں کی خرید وفروخت کی ممانعت کا حکم منسوخ ہوگیا، اسی طرح کتوں کی قیمت کی ممانعت کا حکم بھی منسوخ ہوگیا۔
اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ اس نسخ کا سبب کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں: اس کی وجہ ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، پس جب کتے پالنے کی ممانعت اور ان کو قتل کرنے کا حکم وارد ہوا، تو ہمیں معلوم ہوا کہ اُن کا پالنا حرام ہے اور بیچنا بھی (حرام ہے)، کیونکہ جس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اس کی قیمت بھی حرام ہے، جیسے خنزیر وغیرہ۔ پھر جب شکار وغیرہ کے لیے ان سے نفع اٹھانے کی اباحت کا حکم آیا، اس کے قتل کی ممانعت کا حکم بھی آگیا، تو ہمیں معلوم ہوا کہ اس سے پہلے جو دو مذکورہ احکام آئے، وہ بعد والے اباحت کے حکم سے منسوخ ہوگئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حرمت کا حکم آنے کے بعد جب اباحت کا حکم آئے تو یہ (سابق) حرمت کے لیے ناسخ ہوتا ہے اور وہ حکم مرتفع ہوجاتا ہے اور اس اصول کا زیادہ بیان عنقریب مزارعت وغیرہ میں آئے گا، (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد 12، ص: 84)"۔ احادیث مبارکہ اور ائمۂ کرام کے اقوال سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ابتداءً کتے رکھنے کی ممانعت کا حکم آیا، پھر ضرورت کی بنا پر بتدریج اس کی رخصت دی گئی اور اب کسی اختلاف کے بغیر فتویٰ اسی پر ہے کہ کتا رکھنا جائز ہے۔
تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَصَحَّ بَیعُ الْکَلْبِ) وَلَوعَقُوراً۔ ترجمہ: "کتے کی خرید وفروخت صحیح ہے، اگرچہ وہ کاٹنے والا ہو"۔ مزید لکھتے ہیں: لَایَنبَغِی اِتِّخَاذُ کَلْبٍ اِلَّا نخُوفِ لِصٍّ أَو غَیْرِہٖ فَلَا بَأسَ بِہٖ،
ترجمہ: "کتا رکھنا مناسب نہیں، لیکن اگر چوری وغیرہ کا اندیشہ ہو تو رکھنے میں حرج نہیں"۔
اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا اِقْتِنَاؤُهُ لِلصَّيْدِ وَحِرَاسَةِ الْمَاشِيَةِ وَالْبُيُوتِ وَالزَّرْعِ فَيَجُوزُ بِالْإِجْمَاعِ، لٰكِن لَايَنبَغِي أَن يَتَّخِذَهُ فِي دَارِهِ إِلَّا إِنْ كَانَ لُصُوصًا أَوْ أَعْدَاءً لِلْحَدِيثِ الصَّحِيحِ: ''مَنِ اقْتَنَى كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ أَوْ مَاشِيَةٍ نَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطَانِ''۔

ترجمہ: ''شکار کے لیے، مویشیوں کے ریوڑ اور گھروں کی رکھوالی اور فصل کی حفاظت کے لیے بالاجماع کتا رکھنا جائز ہے، لیکن اُسے گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہے، البتہ چوروں یا دشمنوں کا خوف ہو تو صحیح حدیث کی رو سے گھر پر بھی رکھ سکتے ہیں: ''جس نے شکار اور مویشیوں کے ریوڑ (یا گھر بار) کی حفاظت کے بغیر کتا رکھا، اُس کے اجر سے ہر روز دو قیراط کم ہو جاتے ہیں''''۔ (جلد 7،ص:368-369، بیروت)

ان تفصیلی دلائل کی روشنی میں اُن کتوں کی خرید وفروخت اور کاروبار مباح ہے، جو گھر یا مویشیوں کی چوکیداری یا شکار کے لیے رکھے جاتے ہیں، البتہ جو لوگ شوقیہ کتے پالتے ہیں اور ان سے پیار کرتے ہیں، وہ ان کے لباس اور برتنوں میں منہ ڈالتے ہیں، ان کا پالنا اور رکھنا بدستور منع ہے، کیونکہ ان کے ساتھ کوئی انسانی ضرورت یا حاجت یا نفع وابستہ نہیں ہے۔ لیکن کوئی شخص کتا کس مقصد کے لیے خرید رہا ہے یہ اس کی نیت پر موقوف ہے اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہے۔ آج کل چوری کی نشاندہی، مجرموں کی تلاش اور نشہ آور وممنوعہ اشیاء کی نشاندہی کے لیے جو سدھائے ہوئے کتے استعمال کیے جاتے ہیں، یہ بھی ضرورت کی بنا پر جائز ہیں۔ اس لیے سدھائے ہوئے کتے کی نشاندہی پر کسی کا مال برآمد ہو جائے اور ثابت ہو جائے کہ یہ اس کا مال ہے، تو اس مال کو مالک کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ البتہ جب تک مجرم کے اعتراف جرم (Confession) یا شہادتوں سے چوری کا جرم ثابت نہ ہو جائے، اس پر قطع ید (ہاتھ کاٹنے) کی سزا نافذ نہیں کی جا سکتی۔ ثقہ قرائن کی صورت میں قاضی (Judge) تعزیری سزا دے سکتا ہے۔

وراثت کے مسائل

وراثت کا حکم

سوال:

اگر کسی شخص کی صرف بیٹیاں ہوں، اولادِ نرینہ نہ ہو، اسکی وراثت کیسے تقسیم ہوگی۔کیا وہ اپنی منقولہ اورغیرمنقولہ تمام جائیداد کا اپنی زندگی میں اپنی بیٹیوں کو وارث بنا سکتا ہے۔یہ تمام جائیداد اس نے اپنی ذاتی محنت سے بنائی ہے،(اظفر صدیقی، لاہور)۔

جواب:

اصولِ وراثت کے قوانین کے تحت کسی شخص کی ایک بیٹی ہو تو وہ کل ترکے کے نصف کی حقدار ہوتی ہے، دو یا زائد بیٹیوں کے لیے کل ترکے کا دو تہائی بنتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ

ترجمہ:''سو اگر صرف بیٹیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ان کا حصہ (تقسیم وراثت کے ماقبل ضروری امور نمٹانے کے بعد بقیہ) کل ترکے کا دو تہائی ہے اور اگر صرف ایک بیٹی ہو تو اس کا حصہ کل ترکے کا نصف ہے،(النساء:11)''۔اس کے بعد جو ترکہ بچے گا، دیگر اصحابِ فرائض کو دیا جائے گا اور اگر اصحابِ فرائض نہ ہو تو میت کے عصبات کو مل جائے گا۔اور اگر عصبات بھی نہ ہوں تو قانون وراثت کے مطابق بقیہ حصے بیٹیوں پر ان کے حصوں کے مطابق لوٹا دیے جائیں گے، یعنی سارا مال بیٹیوں کو ملے گا۔

اپنی زندگی میں بیٹیوں کے درمیان مال تقسیم کرسکتا ہے، لیکن اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک یا چند وارثوں کو دینا تاکہ دوسرے ورثا محروم ہوجائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلاوجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے، حدیث مبارک میں فرمایا:

''مَنْ فَرَّ مِنْ مِيْرَاثِ وَارِثِهِ، قَطَعَ اللهُ مِيْرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''۔

ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کردے گا،(سنن ابن ماجہ:2703)۔

آپ نے یہ تو لکھا ہے کہ ایک شخص کی نرینہ اولاد نہیں ہے، اس کی وارث صرف بیٹیاں ہیں، لیکن یہ نشاندہی نہیں کی کہ آیا اس کے بھائی وغیرہ بھی ہیں یا نہیں۔ وراثت کا مسئلہ صحیح طور پر جاننے کے لیے تمام وارثوں کی نشاندہی ضروری ہے۔

ترکہ کا مسئلہ

سوال:

ایک شخص کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھے، ایک بیٹا باپ کی زندگی میں فوت ہو جاتا ہے، فوت ہونے والے بیٹے کی ایک بیٹی ہے، ایک سال بعد اس کی بیوہ کا نکاح دیور سے کر دیا گیا۔ جائیداد باپ کے نام ہے، اب چار بیٹے، دو بیٹیاں اور ایک پوتی ہے۔ پوتی کو دادا کی جائیداد سے حصہ ملے گا یا نہیں؟۔ بیوہ کا حصہ ہے، (تنویر احمد، سیالکوٹ)

جواب:

مُورِث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والے شخص) کی زندگی میں کسی وارث کا انتقال ہو جائے اور ورثاء میں مُورث کے حقیقی بیٹے حیات ہوں تو پوتی یا پوتے کو ترکے سے کچھ نہیں ملے گا، بیٹے کی بیوہ کو بھی سسر کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا، اس کے لیے شریعت کا اصول ہے کہ درجے کے اعتبار سے قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے، جیسے اگر وفات پانے والے شخص کا باپ زندہ ہے تو دادا اُس کی وراثت سے محروم رہے گا اور اگر اس کی وفات سے پہلے باپ وفات پا چکا ہے اور دادا زندہ ہے، تو اس صورت میں جو حصہ باپ کو ملنا تھا، وہ دادا کو ملے گا۔۔ وفات یافتہ باپ کا ترکہ اُس کے بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت تقسیم ہوگا، ترکے کی تقسیم سے پہلے کے لازمی مصارف وضع کرنے کے بعد بقیہ ترکے کے دس حصے ہوں گے۔ چاروں بیٹوں کو 8 حصے (فی کس 2 حصے) اور دو بیٹیوں کو 2 حصے (فی کس ایک ایک حصہ) ملیں گے۔ لیکن قرآن مجید میں ترغیبی حکم یہ دیا گیا ہے کہ تقسیم ترکہ سے پہلے اگر تمام وارث اتفاق رائے سے اپنی یتیم بھتیجی کو فضل واحسان کے

طور پر کچھ دیدیں تو عنداللہ یہ پسندیدہ بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَ لْیَخْشَ الَّذِیْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّیَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَیْهِمْ فَلْیَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْیَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝

''اور جب (ترکے) کی تقسیم کے وقت (وراثت سے محروم رہ جانے والے) قرابت دار، یتیم اور مسکین (بھی) موجود ہوں، تو (ترکے سے) اُن کو بھی کچھ دیدو اور اُن سے خیر خواہی کی بات کرو اور وہ (وُرَثاء) یہ سوچ کر (اللہ سے) ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے بے سہارا اولاد چھوڑ جاتے، تو انہیں (اپنی وفات کے وقت) اُن کے بارے میں کس طرح کے خدشات لاحق ہوتے، سوانہیں (یتیموں کی بابت) اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور درست بات کہنی چاہیے''۔ (النساء:9-8)

اس سے بھی زیادہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ اگر کوئی مُورِث اپنی وفات کے وقت یتیم پوتے پوتیاں چھوڑ کر جارہا ہے، تو اسے اپنی وفات سے پہلے ان یتامیٰ کو کچھ نہ کچھ ہبہ کرنا چاہیے یا اُن کے حق میں کوئی وصیت چھوڑ کر جانا چاہیے اور اس میں بھی احسن صورت یہ ہے کہ اتنی مقدار مال کا ہبہ یا وصیت کریں جو ان کے وفات یافتہ بیٹے یا بیٹی کو ان کی وفات کے بعد بصورتِ حیات ملتا۔ علماءِ کرام کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً معاشرتی معاملات میں ترغیب (Motivation) اور ترحُّم (Mercy) کے مسائل لوگوں کو بتایا کریں۔

زندگی میں کچھ دے کر وراثت سے محروم نہیں کیا جاسکتا

سوال:

ہم سات بہنیں اور ایک بھائی ہیں، والدہ نے اپنی زندگی میں گھر اور فیکٹری ہمارے بھائی سید طاہر علی کو دے دی تھی اور وصیت نامہ لکھ دیا تھا، ہم سب بہنوں کو بھی کہہ چکی تھی کہ یہ جائیداد سید طاہر علی کی ملکیت ہے، ہم سب بہنیں اس پر گواہ ہیں۔ سید طاہر علی نے اپنی ذاتی آمدنی سے ایک پلاٹ والدہ کے نام سے خریدا اور اُسے بھی فیکٹری میں شامل کر دیا

تھا۔ تین بہنوں کو بھی والدہ اپنی زندگی میں ان کے حصے کے علیحدہ علیحدہ فلیٹ دے چکی ہیں تاکہ بعد میں یہ حصہ طلب نہ کریں۔ دو بہنوں نے اپنے اپنے فلیٹ فروخت کر دیے ہیں اور اب بھائی سے اُن کا حصہ پراپرٹی سے طلب کر رہی ہیں، جبکہ دونوں اپنے ذاتی گھر میں رہتی ہیں۔ کیا ان کو حصہ مانگنے کا حق ہے؟۔ چار بہنوں کو کچھ نہیں دیا گیا۔ (شبانہ افتخار، کراچی)

جواب:

آپ نے سوال میں لکھا ہے کہ گھر اور فیکٹری کے بارے میں آپ کی والدہ نے سید طاہر علی کے حق میں وصیت لکھی، شرعاً وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''سَمِعتُ أَبَا أمامةَ. سَمِعتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: اِنَّ اللهَ قَدْ اَعْطٰى كُلَّ ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلاَ وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ''۔

ترجمہ: ''ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمارہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے''۔ (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2867)

اگر آپ کی والدہ نے اپنی زندگی میں مذکورہ جائیداد بیٹے کو ہبہ (Gift) کر دی تھی اور سید طاہر علی نے اُس پر قبضہ بھی کر لیا تھا، تو ہبہ مکمل ہو گیا اور مذکورہ جائیداد سید طاہر علی کی ملکیت ہے، کسی وارث کو اُن سے تقسیم کے مطالبے کا حق حاصل نہیں ہے۔ تاہم یہ اُن ورثاء کی حق تلفی ہے، جنہیں جائیداد سے کچھ نہیں دیا گیا۔ آپ کی والدہ کو چاہیے تھا کہ اگر وہ اپنی زندگی میں کچھ مال اولاد کے درمیان تقسیم کر رہی تھیں، تو تمام اولاد (بیٹے اور بیٹیوں) کو مساوی (برابر برابر) ہبہ (Gift) کرتیں، لیکن اگر دونوں بیٹیوں کو اُن کے حصے کے طور پر فلیٹ دیے تھے اور یہ طے پا گیا تھا کہ اب ترکے میں اُن کا مزید کوئی حصہ نہیں ہے۔ تو انہیں مزید مطالبے کا حق حاصل نہیں ہے۔

وارث بننا اختیاری امر نہیں ہے بلکہ شریعت کے تحت ایک جبری امر ہے۔ امام احمد رضا

قادری قدس سرہ العزیز نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، اس میں کافی اضطراب ہے، اقوال فقہاء دونوں طرف ہیں، جواز کا قول بھی مل جاتا ہے اور عدمِ جواز کا بھی۔ الاشباہ والنظائر میں ایک قول اس کے جواز اور مؤثر ہونے کا ہے، اسے علامہ جلال الدین امجدی نے اپنے فتاویٰ ''فیض الرسول'' میں اختیار کیا ہے اور اسے اعلیٰ حضرت کا بھی مختار قرار دیا ہے، چنانچہ اُن کا جواب مع سوال درجِ ذیل ہے:

مسئلہ: ''باپ نے اپنی زندگی میں اپنے ایک بیٹے کو کچھ جائیداد دے کر الگ کر دیا اور بیٹے نے یہ منظور کر لیا کہ باپ کے انتقال پر اب ہم کو اس کے ترکے میں کچھ حق نہ رہے گا، تو اس صورت میں باپ کے فوت ہونے پر اس کی جائیداد میں اس کے بیٹے کا حق ہے یا نہیں؟۔

جواب: ''صورتِ مسئولہ میں باپ کے انتقال کے بعد اس کا ترکے میں کچھ حق نہیں، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان تحریر فرماتے ہیں بزرگ موصوف نے اپنی حیات میں صاحبزادی صاحبہ کو کچھ عطا فرما کر میراث سے علیحدہ کر دیا اور وہ بھی راضی ہوگئیں کہ میں نے اپنا حصہ پالیا اور بعد انتقال مورث کے ترکہ میں میرا حق نہیں، اشباہ میں طبقات علامہ شیخ عبدالقادر سے اس صورت کا جواز نقل کیا اور اسے علامہ ابوالعباس ناطفی پھر جرجانی صاحب خزانہ پھر شیخ عبدالقادر پھر فاضل زین الدین ''صاحب اَشباہ'' پھر علامہ سید احمد حموی نے مُقرّر و مُسلّم (یعنی برقرار) رکھا اور فقیہ ابوجعفر محمد بن یمانی نے اس پر فتویٰ دیا اور ایسا ہی فقیہ محدّث ابوعمرو طبری اور اصحاب احمد بن ابی الحارث نے روایت کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد یازدہم، ص:95)، (فتاویٰ فیض الرسول، حصہ سوم، ص:492)

علامہ زین الدین بن ابراہیم بن نجیم کی جس عبارت کا حوالہ مفتی جلال الدین امجدی نے دیا ہے، وہ یہ ہے:

قَالَ الشَّیْخُ عَبْدُالْقَادِرِ فِی الطَّبَقَاتِ فِیْ بَابِ الهمزِفِی أَحْمَدَ: قَالَ الجُرجَانِی فِی الْخِزَانَة قَالَ العَبَّاسُ النَاطِفِی: رَأیتُ بِخَطِّ بَعضِ مَشَایِخِنَا رَحِمَهُمُ اللهُ فِی رَجُلٍ جَعَلَ لِأَحَدِ بَنِیْه دَارًا بِنَصِیبِهٖ عَلیٰ أَن لَّایَکُوْنَ لَهٗ بَعدَ مَوتِ الأَبِ مِیرَاثٌ، جَازَ وَأفتیٰ بِهِ الفَقِیْه

أَبُوجَعفَر مُحَمَّد بن اليَمَانِي أحدُ أصحَابِ مُحَمَّدِ بْنِ شُجَاعِ البَلْخِي، وَحَكَى ذٰلِكَ أصحَابُ أحمَدَ بنِ أبِي الحَارِثِ وَأبُوعُمَرَوَ الطَّبَرِي۔

ترجمہ:''شیخ عبدالقادر نے طبقات کے''باب الھمز فی احمد''میں فرمایا، جرجانی نے خزانہ میں کہا کہ ابوالعباس ناطفی نے فرمایا: میں نے ایسے شخص کے بارے میں جس نے دو بیٹوں میں سے ایک کو اُس کے حصے کا مکان اس شرط پر دیا کہ باپ کی موت کے بعد اس کے لیے ترکے سے حصہ نہیں ہوگا، اپنے بعض مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کی وہ تحریر دیکھی، تو یہ جائز ہے، اسی پر فقیہ ابوجعفر محمد بن الیمانی نے فتویٰ دیا جو کہ محمد بن شجاع بلخی کے تلامذہ میں سے ہیں۔ احمد بن ابوحارث اور ابوعمر طبری کے شاگردوں نے اس کو نقل کیا ہے''۔

(الاشباہ والنظائر، ص:294، قدیمی کتب خانہ، کراچی)

لیکن امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے طویل بحث سے قبل اپنا مختار موقف یوں بیان کیا ہے: وارث سے اس کے حصہ میراث کی بابت جو صلح حیاتِ مورث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والے شخص کی زندگی) میں کی جائے تحقیق یہ ہے کہ باطل و بے اثر ہے اس سے وارث کا حقِ ارث اصلاً زائل نہیں ہوتا، ہاں! اگر بعد موتِ مُورِث اس صلح پر رضامندی رہے تو اب صحیح ہوجائے گی۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص:232، رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔ وراثت چھوڑ کر وفات پانے والے شخص نے اپنی زندگی میں کسی وارث کو کچھ دے کر اپنی وفات کے بعد وراثت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرلیا تھا، تو اس کے نتیجے میں وہ حقِ وراثت سے محروم نہیں رہے گا، البتہ اگر وہ مُورِث کی وفات کے بعد اس پر رضامندی ظاہر کرے، تو درست ہے۔آپ کے بیان کے مطابق بہنوں نے والدہ کی وفات کے بعد رضامندی ظاہر نہیں کی، تو پھر وہ وراثت میں اپنے حصے کا مطالبہ کرسکتی ہیں۔

یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی بابت قرآن کا ترغیب وترحُّم پر مبنی ارشاد

سوال:

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلام حسن ولد فتح محمد موضع بٹن

والا اوچ شریف کے رہائشی ہیں اوران کا انتقال ہوگیا ہے،ان کی بیوی کا انتقال ان سے پہلے ہوگیا تھا۔اب ان کے موجودہ ورثاء میں چار بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ایک بیٹا محمد بلال اورایک بیٹی نورخاتون کا انتقال غلام حسن ولد فتح محمد کی زندگی میں ہوگیا تھا،لیکن ان کی اولاد موجود ہے۔شرعی طور پر رہنمائی فرمائیں کہ محمد بلال اورنورخاتون کی اولاد غلام حسن ولد فتح محمد کی جائیداد کے وارث بن سکتے ہیں یانہیں؟اگر بن سکتے ہیں توان کوکتنا حصہ دیا جائے گا؟،(محمود احمد،چنی گوٹھ تحصیل احمد پورشرقیہ،ضلع بہاولپور)۔

جواب:

شریعت کی رو سے کسی بھی شخص کی وفات کے بعداُس کے ترکے میں سے پہلے اُس کے کفن دفن کے اخراجات وضع کیے جاتے ہیں،اس کے بعد اگراُس کے ذمے کسی کا قرض واجب الادا ہو،تواس کی ادائیگی عمل میں آئے گی۔بیوی کا مہر مؤجل اگراپنی زندگی میں ادا نہیں کرسکا تواس کوبھی قرض کےطور پر ترکے سے منہا کیا جائے گا۔اس کے بعد اگراس نے کوئی وصیت کی ہوگی تو قابلِ انقسام (Divisible) ترکے کی زیادہ سے زیادہ تہائی حد تک وہ مؤثر اورنافذ العمل ہوگی، یہ تینوں امور تقسیمِ ترکہ سے مقدّم ہوتے ہیں۔ان سے عہدہ براہونے کے بعد بقیہ ترکہ اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں اگرسائل کا بیان درست ہےتوترکے کی تقسیم حسبِ ذیل ہوگی۔کل ترکہ بارہ حصوں میں منقسم ہوگااور بوقتِ وفاتِ مُورِث (Inherited) چارزندہ بیٹوں کو کل آٹھ حصے (فی کس دودو حصے) اور چار بیٹیوں کو چار حصے (فی کس ایک ایک حصہ) ملیں گے۔چونکہ وفات یافتہ شخص غلام حسن ولد فتح محمد کا ایک بیٹا محمد بلال اورایک بیٹی نورخاتون اُن کی حیات ہی میں وفات پاچکے تھے،اس لیے وہ وراثت کے حق دار نہیں ہوں گے، کیونکہ ترکہ یا ورثہ (Inheritance) مُورِث کی وفات کے بعد تقسیم ہوتا ہے،اس کی حیات میں تقسیم نہیں ہوتا، بلکہ ترکہ یاوراثت کہتے ہی اُس مال کو ہیں جوکوئی شخص وفات کے وقت اپنے پیچھے چھوڑ جائے اور وراثت میں حصے کا حق دار وہی وارث (Inheritor)

قرار پاتا ہے جو مُورِث کی وفات کے وقت زندہ ہو۔ چونکہ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ترتیبِ وُرَثاء میں بیٹے بیٹیوں سے ایک درجہ نیچے ہوتے ہیں، اس لیے انہیں حصہ نہیں ملتا، کیونکہ اسلامی قانونِ وراثت کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ: ''قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے''۔

تاہم اللہ عزّ وجلّ نے قرآنِ مجید میں اہلِ ایمان کو نہایت حکیمانہ انداز میں اس کی ترغیب ضرور دی ہے کہ وہ وُرَثاء جو حصہٗ وراثت سے محروم رہ جاتے ہیں، دیگر ورثاء کو چاہیے کہ تقسیمِ وراثت کے وقت صلۂ رحمی کرتے ہوئے انہیں کچھ نہ کچھ دے دیا کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۝

''اور جب (ترکے) کی تقسیم کے وقت (وراثت سے محروم رہ جانے والے) قرابت دار، یتیم اور مسکین (بھی) موجود ہوں، تو (ترکے سے) اُن کو بھی کچھ دیدو اور اُن سے خیر خواہی کی بات کرو اور وہ (وُرَثاء) یہ سوچ کر (اللہ سے) ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے بے سہارا اولاد چھوڑ جاتے، تو انہیں (اپنی وفات کے وقت) اُن کے بارے میں کس طرح کے خدشات لاحق ہوتے، سوانہیں (یتیموں کی بابت) اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور درست بات کہنی چاہیے''۔(النساء:9-8)

اس سے بھی زیادہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ اگر کوئی مُورِث اپنی وفات کے وقت یتیم پوتے پوتیاں چھوڑ کر جارہا ہے، تو اسے اپنی وفات سے پہلے ان یتامیٰ کو کچھ نہ کچھ ہبہ کرنا چاہیے یا اُن کے حق میں کوئی وصیت چھوڑ کر جانا چاہیے اور اس میں بھی احسن صورت یہ ہے کہ اتنی مقدار مال کا ہبہ یا وصیت کریں جو ان کے وفات یافتہ بیٹے یا بیٹی کو ان کی وفات کے بعد بصورتِ حیات ملتا۔ علماءِ کرام کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً معاشرتی معاملات میں ترغیب

(Motivation)اور ترحُّم (Mercy) کے مسائل لوگوں کو بتایا کریں۔

وراثت سے محض دست برداری معتبر نہیں ہے

سوال:

ہمارے صوبہ خیبر پختونخوا میں ''عزیز ولی'' (جس کو وہاں کا عرف یا غیرت سمجھا جاتا ہے) کی وجہ سے بہنیں بھائیوں سے اپنا حصۂ وراثت طلب نہیں کرسکتیں، بلکہ شرم کے مارے کہہ دیتی ہیں کہ ہم اپنے بھائیوں کے حق میں دست بردار ہوتی ہیں، اگر مطالبہ کریں گی تو لوگ بے غیرت سمجھیں گے۔ کچھ لوگ اپنی بہن، بیٹیوں سے گورنمنٹ پیپر پر انگوٹھا لگوا کر حقِ وراثت سے محروم کردیتے ہیں، جبکہ خواتین کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔

مفتی محمد نوراللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''فتاویٰ نوریہ'' جلد 4 میں ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ لڑکی اگر عدالت کے روبرو کہہ دے کہ ہم نے اپنا حصہ معاف کیا، تو بھائی شرعاً وارث بن جائیں گے۔کسی بھی وارث کا تقسیم وراثت سے پہلے اپنے حصے کو دیگر ورثاء کے حق میں معاف کردینا جائز ہے یا نہیں؟۔کیا ازروئے شرع اس طرح کہہ دینے سے حقِ وراثت ساقط ہوجاتا ہے؟، (آثاراللہ، ضلع مانسہرہ تحصیل اوگی)۔

جواب:

مِلک کے سبب دو ہیں: ایک ضروری (یعنی جس کا نفاذ اختیار اور مرضی پر موقوف نہ ہو) اور دوسرا اختیاری یعنی کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی چیز کو اپنی مِلک میں لیتا ہے، اس کے کئی ذرائع ہیں: (۱) کسی چیز کو قیمت طے کرکے خریدلینا (۲) جیسے کوئی اسے ہبہ کرے یا عطیہ دے، یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ ہبہ یا عطیہ وہ چاہے تو قبول کرلے، چاہے تو رَد کردے۔ مِلک ضروری کے تحت علماء نے لکھا ہے: ''وہ وراثت ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ اگر وارث اپنے حصے کو رَد بھی کردے (یعنی یہ کہے کہ میں نہیں لیتا) تو قاضی کو اختیار ہے کہ اسے اپنا حصہ لینے پر مجبور کرے اور اُس کا حصہ اس کی گود یا اس کے گھر میں ڈال دے (یعنی اس کی تحویل میں دیدے)''۔ (شریفیہ مع سراجیہ، ص:2)

فقہی اصول یہ ہے کہ وراثت کی ملکیت اختیاری نہیں ہوتی بلکہ جبری ہوتی ہے، لہٰذا محض دست برداری سے حقِ وراثت باطل نہیں ہوتا۔ علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں: لَایَدْخُلُ فِی مِلْكِ الْاِنْسَانِ شَیْءٌ بِغَیْرِ اِخْتِیَارِہٖ اِلَّا الْاِرْثُ اِتِّفَاقًا، ترجمہ: ''انسان کی ملکیت میں اس کے اختیار کے بغیر کوئی شے داخل نہیں ہوتی، مگر میراث بالاتفاق داخل ہوتی ہے''۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: لَوْقَالَ الْوَارِثُ تَرَکْتُ حَقِّیْ لَمْ یَبْطُلْ حَقُّہٗ اِذَالْمِلْكُ لَا یَبْطُلُ بِالتَّرْكِ، ترجمہ: ''اگر وارث نے کہا: میں نے اپنا حق چھوڑ دیا ہے، تو اس کا حق باطل نہیں ہوگا کیونکہ مِلک چھوڑ دینے (یعنی محض دستبردار ہونے) سے باطل نہیں ہوتا''۔

(الاشباہ والنظائر، ص:340-309)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''اِرث (وراثت) جبری ہے کہ مورِث کی موت پر ہر وارث خواہ مخواہ اپنے حصہ شرعی کا مالک ہوتا ہے، خواہ مانگے یا نہ مانگے، لے یا نہ لے، دینے کا عرف ہو یا نہ ہو، اگرچہ کتنی ہی مدت ترک کو گزر جائے، کتنے ہی اشتراک دراشتراک کی نوبت آئے، میراث کو کوئی بات بالکل ساقط نہ کرے گی، نہ کوئی عرف اللہ کے فرائض میں تغیر کرسکتا ہے، نہ مانگنا تو درکنار، اگر کوئی وارث صراحۃً کہہ دے کہ میں نے اپنا حصہ چھوڑ دیا، جب بھی اس کی مِلک زائل نہ ہوگی''۔ ۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: ''حقِ میراث حکمِ شرع ہے کہ رَبُّ العالمین تبارک وتعالیٰ نے مقرر فرمایا، لہٰذا کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوسکتا، قَالَ عُلَمَاؤُنَا: کَمَا فِی ''الْاَشْبَاہِ'' وَغَیْرِہٖ اَلْاِرْثُ جَبْرِیٌّ لَایَسْقُطُ بِالْاِسْقَاطِ۔ ترجمہ: ''ہمارے علماء نے فرمایا جیسا کہ ''الاشباہ'' وغیرہ میں ہے کہ حقِ میراث جبری ہے، کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوتا''۔ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ بیٹا اپنے باپ کا اس لیے وارث ہوتا ہے کہ یہ اس کا بیٹا ہے، تو جس طرح یہ اپنے بیٹے ہونے کو نہیں مٹا سکتا، اسی طرح اپنے حق میراث کو نہیں ساقط کرسکتا، پس امداد حسین خان کا متوفی کے ترکے سے دستبردار ہونا ہرگز معتبر نہیں اور وہ اس وجہ سے اب بھی کالعدم نہیں ہوسکتا، اگر لاکھ بار دست برداری کرلے، شرع تسلیم نہ

فرمائے گی اور اُسے اس کے حصہ کا مالک ٹھہرائے گی۔ ہاں! اگر اسے لینا منظور نہیں تو یوں کرے کہ لے کر اپنی بہن خواہ بھاوج جسے چاہے ہبہ کامل کردے اور جو مال قابلِ تقسیم ہوا سے تقسیم کے ذریعے الگ کر کے قبضہ دلا دے، اُس وقت بہرصورت اس کا حق منتقل ہو جائے گا ورنہ مجرّد دست برداری بالکل مؤثر نہیں ہوتی''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 26، ص:133-113)

ہاں! اگر عورت اپنے حصۂ وراثت سے دست بردار ہونا چاہتی ہے تو اس کی دو شرطیں ہیں: اول یہ کہ دست برداری رضا کارانہ اور قلبی رضامندی سے ہو۔ اگر عورت پر کسی قسم کا معاشرتی دباؤ ہو کہ کسی علاقے یا برادری میں عورتوں کے وراثت سے حصہ لینے کو معیوب خیال کیا جاتا ہے یا خاندان میں عورتوں کے حصہ لینے کا رواج نہیں ہے یا اس وجہ سے کہ بھائی ناراض ہوں گے یا اُسے حصہ دیں گے ہی نہیں کہ مطالبہ کرنا خود کو بے توقیر کرنا اور تعلقات کو کشیدہ کرنا ہے۔ اگر ان وجوہات میں سے کسی بھی وجہ سے عورت اپنا حصہ معاف کرتی ہے، تب بھی حصہ برقرار رہتا ہے کہ معافی جب تک دلی رضامندی اور شرعی طریقے سے نہ ہو اس کا اعتبار نہیں۔

جو بہنیں اپنا حصہ بھائی کو دینا چاہتی ہیں، تو اس کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ شرعی تقسیم کے مطابق اپنے اپنے حصے کی حقِ ملکیت حاصل کرلیں اور پھر وہ اپنے اپنے حصے کو جس کے نام چاہیں قانونی طریقے سے منتقل کردیں۔

دست برداری کی دوسری شرط یہ ہے کہ دست برداری بلا معاوضہ نہ ہو، کیونکہ شرعی اصول یہ ہے کہ عین (یعنی ایسی چیز جو خارج میں اپنے وجود کے ساتھ قائم ہے) سے محض بری الذمہ کرنا یا دست بردار ہونا درست نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرضے اور مالی واجبات معاف کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں، لیکن مکان، دکان، زمین اور اشیاء معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتیں، بلکہ بدستوران پر معاف کرنے والے کا حقِ ملکیت قائم رہتا ہے۔ پس اگر عورت اپنی رضا ورغبت سے اور کسی جبر واکراہ کے بغیر اپنے حصۂ وراثت

کے عوض کوئی چیز قبول کر لے، خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ، تو وہ ایسا کرسکتی ہے۔ ایسی ''عزیز ولی'' یا غیرت یا قبائلی وعلاقائی رسم جس سے شریعت کا کوئی حکم پامال ہوتا ہے، وہ جہالت ہے، حق کا انکار ہے اور دین سے دوری ہے۔ اسلام ایسی جاہلانہ رسوم کو مٹانے کے لیے آیا ہے اور ہمیں اسلامی شعار کو اپنانا چاہیے۔

مفتی نور اللہ نعیمی نور اللہ مرقدہٗ کا فتویٰ حسبِ ذیل ہے، ان سے سوال کیا گیا: ''ولیا ولد ہدایت کو فوت ہوئے تین چار سال گزر چکے ہیں، ولیا مذکور نے اپنی وفات کے بعد چار لڑکیاں اور ایک لڑکا محمود باقی چھوڑا اور جب ولیا مذکور کی وراثت کا انتقال ہونے لگا، لڑکیوں کو حقوقِ وراثت دینے کے لیے بلایا گیا تو اُنہوں نے عدالت کے سامنے بیان حلفی دیا کہ ہم اپنے حصہ کی وراثت اپنے بھائی محمود کو دینا چاہتی ہیں۔ اس کے بعد عدالت نے فیصلہ کیا اور محمود کے نام تمام وراثت منتقل کردی۔ اب محمود بھی فوت ہوگیا ہے اور اس کا کوئی لڑکا یا لڑکی باقی نہیں ہے، لاولد فوت ہوا ہے باقی اسکے ایک بیوی اور چار ہمشیرہ ہیں اور ایک حقیقی چچا اور چچا زاد بھائی بھی ہیں''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''ولیا کی چار لڑکیاں اپنے حقِ وراثت سے اپنے بھائی محمود کے حق میں دستبردار ہوگئیں تو محمود ہی مالک ہوگیا۔ اب جب محمود لاولد فوت ہوگیا ہے تو وہ بہنیں بھی اس کی وراثت کی حق دار ہیں اور اس کی بیوی اور حقیقی چچا بھی اور چچا زاد بھائی محروم ہیں، چاروں بہنیں دو تہائی ترکہ کی حقدار ہیں (قرآن کریم اور حدیثِ متفق علیہ) یہ مسئلہ بارہ سے آئے گا۔ نوٹ: یہ فتویٰ اس صورت میں ہے کہ چاروں بہنیں محمود ہی کی حقیقی بہنیں یا سب سوتیلی باپ سے ہوں اور اگر بعض حقیقی اور بعض سوتیلی یا کل سوتیلی صرف ماں سے ہوں تو حکم بدل جائے گا، دوبارہ سوال کر کے دریافت کریں''۔ (فتاویٰ نوریہ، جلد 4، ص: 334-332)

مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے مایہ ناز فقیہ تھے، وہ دین کے مسائل اور اُن کی حکمتوں سے واقف تھے۔ لہٰذا ہم حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے یہ قرار دے سکتے ہیں کہ اُنہوں نے معلوم کرلیا ہوگا کہ محکمۂ مال کے عملے نے اپنے کھاتوں اور ریکارڈ میں بہنوں کا

حصۂ وراثت ملکیت کے خانے میں اُن کے نام درج کردیا ہوگا اور اُس کے بعد بہنوں نے اپنا حصہ اپنے بھائی کو ہبہ کردیا ہوگا۔ دیہاتی لوگ بعض اوقات صورتِ مسئلہ پوری طرح سے بیان نہیں کرپاتے یا خود اَن پڑھ ہوتے ہیں اور کسی دوسرے سے سوال لکھواتے ہیں۔لیکن مفتی صاحب نے بہرحال پوری صورتِ حال معلوم کرکے فتویٰ دیا ہوگا اگرچہ انسان سے سہو بھی ہوسکتا ہے اور ہم سے بھی ہوتا رہتا ہے اور مطلع ہونے پر اس کی اصلاح ہماری شرعی ذمہ داری ہوتی ہے۔

ترکے کا مسئلہ

سوال:

میرے شوہر کو 29 ستمبر 2012ء میں شہید کردیا گیا تھا۔میرے مرحوم شوہر کے ترکے میں کچھ پلاٹ ہیں، پلاٹ خریدتے وقت میرے شوہر کو کچھ رقم کی ضرورت تھی، انہوں نے مجھ سے میرا زیور (جس کا وزن 91 گرام تھا) مانگا اور کہا کہ بعد میں بنوا کر دے دوں گا۔ ورثاء میں شوہر کے والد (مخدوم عبداللطیف)، والدہ (خیرالنسا)، ایک بیوہ (ملکہ) میری ایک بیٹی (ملیحہ)، تین بھائی (محمد یعقوب، عبدالفتاح، عبدالکریم) اور پانچ بہنیں (قدرالنسا، شائستہ، ذکیہ، ماجدہ، قرۃ العین) ہیں۔ والد مخدوم عبداللطیف کا انتقال میرے شوہر کے انتقال کے ڈیڑھ سال بعد 2013ء میں ہوا۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟۔

(ملکہ عبدالرزاق، جمشید روڈ کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو مُتوَفّی کے ترکے سے تکفین وتدفین کے اخراجات، مرحوم کے ذمے جو قرض واجب الادا ہے، اس قرض کی ادائیگی اور اگر کوئی وصیت کی ہو تو تہائی ترکے کی حد تک وصیت کو پورا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 24 حصوں میں تقسیم ہوگا:

بیوہ ملکہ عبدالرزاق کو 3 حصے، ایک بیٹی ملیحہ کو کل ترکے کا نصف یعنی 12 حصے، والد مخدوم

عبداللطیف کو 5 حصے اور والدہ خیر النساء کو 4 حصے ملیں گے۔ مخدوم عبداللطیف کو ملنے والا حصہ اُن کی وفات کے وقت جو ورثاء موجود تھے، اُن کے درمیان اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوگا۔

آپ کے بیان کے مطابق آپ کے مرحوم شوہر نے آپ سے آپ کا 91 گرام زیور پلاٹ کی خریداری کے وقت آپ سے قرض کے طور پر لیا تھا اور بعد میں زیور بنوا کر دینے کا وعدہ کیا تھا، لہٰذا ترکے کی تقسیم سے پہلے مرحوم کے ترکے میں سے آپ کا زیور بنوا کر دینا ہوگا۔ بعد ازاں بقیہ ترکہ مندرجہ بالا تناسب کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

ترکے کی تقسیم

سوال:

میرا ایک غیر شادی شدہ بیٹا فاران الدین احمد 26 سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ جہاں ملازمت کرتا تھا، اس ادارے کی جانب سے بقایا جات اور کسی کو کچھ رقم قرض دی تھی، وصول ہوچکی ہے، یہ سب ملا کر یہ رقم 4,86742/= روپے بنتی ہے۔ ورثاء میں والد، والدہ، چار بھائی اور ایک بہن ہیں۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ کیا اس رقم سے ہم بیٹے کا حج بدل کر سکتے ہیں؟، (انعام الدین، گلستانِ جوہر کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو مُتوَفّی کے ترکے سے تکفین وتدفین کے اخراجات، مرحوم کے ذمے اگر قرض واجب الادا ہے، اس کی ادائیگی اور اگر کوئی وصیت کی ہو تو تہائی ترکے کی حد تک وصیت کو نافذ کرنے کے بعد والد کی موجودگی کی وجہ سے بہن بھائی محروم ہوں گے۔ کل رقم چار لاکھ چھیاسی ہزار سات سو بیالیس میں سے والدہ کو 81123.7 روپے ملیں گے جب کہ والد کو بقیہ کل رقم مل جائے گی۔

مذکورہ رقم ورثاء کا حق ہے، جس میں تصرُّف کا اختیار کسی ایک کو حاصل نہیں ہے، آپ

کے بیان کردہ حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بیٹے پر حج فرض نہیں تھا۔ تاہم اگر آپ اپنی مرضی سے چاہیں، تو اُن کی طرف سے حجِ بدل کر سکتے ہیں۔

گمشدہ فرد کی موت کا حکم

سوال:

میرے والد سندھ میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر 1999ء تک فائز تھے، 9 مئی 1999ء کو انہیں اغوا کرلیا گیا، ایک ماہ بعد ایک خط آیا کہ ہم نے انہیں قتل کر دیا ہے، فلاں جگہ سے لاش اٹھالیں، لیکن وہاں کوئی لاش نہیں ملی۔ سات سال بعد حکومت نے انہیں ریٹائر کر دیا اور پنشن لینے کی اجازت دیدی۔ حکومت کی جانب سے انشورنس کے کلیم کے لیے کورٹ سے تاریخِ وفات کا سرٹیفکیٹ درکار ہے، شرعی اعتبار سے تاریخِ وفات کب سے شمار ہوگی؟، (محمد شاہ رخ علی پنہور، کراچی)۔

جواب:

شرعی گواہوں سے جب آپ کے والد کی وفات ثابت ہو، تو جس وقت کے بارے میں ثابت ہوا کہ اُنہوں نے وفات پائی، ان کی موت کا اعتبار کیا جائے گا اور وقت وفات سے ورثاء ترکے سے اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔ اور اگر قاضی یعنی حاکم اس کی موت کا حکم لگادے، تو اُس حکمِ وفات کے اجرا کے دن سے وہ وفات یافتہ متصور ہوگا اور اس کے ورثاء اس فیصلہ کی تاریخ سے اس کے ترکے میں سے اپنا اپنا حصہ پانے کے حق دار ہوں گے۔

اسلامی قانونِ میراث کا اصول ہے کہ اگر کوئی شخص لاپتا ہو جائے اور اُس کی زندگی یا موت کے بارے میں کسی کو حتمی علم نہ ہو تو وہ شخص اپنے مال کے اعتبار سے زندہ تصور کیا جائے گا، یعنی اُس کا مال اُس وقت تک تقسیم نہیں کیا جاسکتا جب تک اُس کی موت کے بارے میں کوئی شہادت یا ثبوت حاصل نہ ہو جائے۔ لیکن یہی گم شدہ شخص اگر کسی کا وارث ہے تو اِس کو وراثت سے حصہ نہیں ملے گا۔ امام سراج الدین محمد بن عبدالرشید (مُصنفِ

سراجی) لکھتے ہیں:

اَلْمَفْقُوْدُ حَیٌّ فِی مَالِہٖ حَتّٰی لَایَرِثَ مِنْہُ اَحَدٌ وَمَیِّتٌ فِیْ مَالِ غَیْرِہٖ حَتّٰی لَایَرِثَ مِنْ اَحَدٍ وَیُوْقَفُ مَالُہٗ حَتّٰی یَصِحَّ مَوْتُہٗ اَوْتَمْضِیَ عَلَیْہِ مُدَّۃٌ واخْتَلَفَ الرِّوَایَاتُ فِیْ تِلْکَ الْمُدَّۃِ فَفِی ظَاھِرِالرِّوَایَۃِ اِذَالَمْ یَبْقَ اَحَدٌ مِنْ اَقْرَانِہٖ حُکِمَ بِمَوْتِہٖ وَرَوَی الْحَسَنُ بْنُ زِیَادٍ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللّٰہ تَعالٰی اِنَّ تِلْکَ الْمُدَّۃَ مِائَۃٌ وَعِشْرُوْنَ سَنَۃً مِنْ یَوْمِ وُلِدَ فِیْہِ الْمَفْقُوْدُ. وَقَالَ مُحَمَّدٌ رَحِمَہُ اللّٰہ تعالٰی مِائَۃٌ وَعَشْرَ سِنِیْنَ وَقَالَ اَبُوْیُوْسُفَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی مِائَۃٌ وَخَمْسُ سِنِیْنَ وَقَالَ بَعْضُھُمْ تِسْعُوْنَ سَنَۃً وَعَلَیْہِ الْفَتْوٰی۔

ترجمہ: ''مفقود شخص اپنے مال کے اعتبار سے زندہ ہے یہاں تک کہ اُس کا کوئی وارث نہیں ہوگا (یعنی اس کا مال بطور وراثت تقسیم نہیں ہوگا) اور دوسرے شخص کی میراث کے بارے میں وہ مردہ شمار کیا جائے گا اور وہ کسی کا وارث نہیں بنے گا، اُس کا مال موقوف رکھا جائے گا یہاں تک کہ اُس کی موت ثابت ہوجائے یا اس پر (طویل) مدت گزر جائے۔ اور اس مدت کے بارے میں مختلف روایات ہیں، (فقہ حنفی) ظاہر روایت یہ ہے کہ جب اُس کے ہم عصروں میں کوئی زندہ نہ رہے تو اس کی موت کا حکم دے دیا جائے گا۔ حسن بن زیاد نے امام اعظم رحمہ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ جس دن مفقود پیدا ہوا، اُس دن سے یہ مدت ایک سو بیس سال ہے، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ ایک سو دس سال ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ نے ایک سو پانچ سال مدت بیان فرمائی ہے اور بعض (دیگر) علماء نے یہ مدت 90 سال بیان کی ہے اور اِسی پر فتویٰ ہے''۔ (سراجی ص:125، مکتبۃ البشریٰ، کراچی)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''مفقود (Missing Person یا Non Existent) اُس شخص کو کہتے ہیں جو لا پتا ہو، اس کی موت یا زندگی کا کسی کو کوئی علم نہ ہو''۔ ایسے شخص کے ساتھ اُس مدت کے حوالے سے کہ جس کے گزرنے کے بعد اس کی موت کا حکم دے دیا جائے، تین قسم کے احکام متعلق ہوتے ہیں: (الف) اس کی بیوی کے حوالے سے (ب) اس کے مال کے

حوالے سے (ج) دوسرے سے اُس کے وراثت پانے کے حوالے سے۔۔۔آگے چل کر اس کے مال کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ائمۂ مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ مفقود الخبر اپنے زیرِ ملکیت مال اور دیگر حقوق کے حوالے سے زندہ تصور کیا جائے گا، یہاں تک کہ اس کی وفات پر گواہ قائم ہوجائیں یا قاضی اس کی وفات کا حکم دے دے، یہ مفقود کے حوالے سے سلبی جانب (Negative Aspect) ہے اور اس پر حسبِ ذیل احکام مرتب ہوں گے: اس کا مال وارثوں میں تقسیم نہیں ہوگا، قاضی یعنی حاکم اپنی نگرانی میں اُس کی بیوی اور اُن اصول وفروع، جن کی کفالت اس کے ذمے ہے، پر اُس کے مال میں سے خرچ کرے گا، کیونکہ اِن سب کا نفقہ اس پر اُس کی موجودگی یا غیاب (Absence) دونوں صورتوں میں اُس پر واجب ہے۔ اور اس کے عُقود جیسے اجارہ وغیرہ جو عاقدین میں سے کسی ایک کی وفات سے ختم ہوجاتے ہیں، جاری رہیں گے اور قاضی اس کے مال کی حفاظت اور واجب الادا قرضوں کی وصولی کے لیے کوئی وکیل مقرر کرے گا۔

(فقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد 10، ص:7892)

صورتِ مسئولہ میں آپ اپنے پاس دستیاب شواہد کے ساتھ مسئول کورٹ سے رجوع کریں، جس میں متعلقہ محکمے کی ریٹائرمنٹ کی دستاویزات بھی ہیں۔ عدالت کا اختیار اور صوابدید ہے کہ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر اُس کی باتصویر تشہیر کرائے اور ایک مناسب وقفے کے بعد جب اس کی حیات کے کوئی شواہد نہ ملیں، تو موجودہ دور میں عدالت فقۂ مالکی پر عمل کرتے ہوئے چار سال کی مدت اس کی تلاش کے لیے دے گی اور اگر اس عرصے میں اس مفقود الخبر کا پتا نہ چلا تو عدالت اس کی موت کا حکم لگائے گی اور اس کے بعد اس کی بیوی چار ماہ دس دن عدتِ وفات گزارے گی اور حکمِ موت ہی پر ترکے کی تقسیم کا عمل شروع ہوگا۔

بہنوں کو حصے سے محروم کرنا ظلم ہے

سوال:

میرے دادا نے وراثت میں زمین چھوڑی اور میرے والد کو دلچسپی نہ تھی۔ میرے

والد کے انتقال کے بعد میرے بھائیوں کو معلوم ہوا کہ میرے دادا نے وراثت میں زمین چھوڑی تھی۔ میرے بھائی اس زمین کو آباد کرتے ہیں، زمین کو آباد کرنے کے دوران کوئی دوسرا فریق میرے بھائیوں کے ساتھ عدالت میں کیس کر دیتا ہے کہ یہ زمین ہماری قوم نے آپ کے دادا کو نہیں دی تھی، لیکن وہ کیس میرے بھائی جیت جاتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے کہ اس زمین میں میرا بھی حصہ بنتا ہے کہ نہیں؟۔

وہ مجھے میرا حصہ نہیں دیتے اور میں نے بار بار ان کو کہا ہے، وہ یہی کہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں بہنوں کو کسی نے بھی زمین نہیں دی ہے۔ اگر وہ اپنے بچوں کی خاطر نہیں دیتے کہ ہمارے بچوں کی زمین کم ہو جائے گی تو قرآن اور حدیث میں کیا حکم ہے، (ایک مظلوم خاتون)۔

جواب:

مذکورہ جائیداد میں آپ کے والد کے توسط سے آپ کا حصہ بنتا ہے، جس کی ادائیگی آپ کے بھائیوں پر لازم ہے۔ بیٹی کو باپ یا ماں کے ترکے سے محروم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بیٹیوں کا حق قرآن کی نصِ قطعی سے ثابت ہے، جسے قطعاً رد نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۗ

ترجمہ: ''اللہ تمہاری اولاد (کی وراثت میں حصے) کے متعلق تمہیں حکم دیتا ہے کہ (میت کے) ایک بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے حصے برابر ہے، سو اگر (میت کی اولاد میں) صرف بیٹیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ان کا حصہ (کل ترکے کا) دو تہائی ہے اور اگر صرف ایک بیٹی ہو تو اس کا حصہ (کل ترکہ کا) نصف ہے، (النسا:11)''۔ اگر بیٹا یا کوئی وارث بیٹی کو محروم کرتا ہے تو یہ ظلم ہے اور اس طرح کا کوئی بھی عمل شرعاً نا قابلِ قبول ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''جو لوگ بیٹیوں اور بہنوں کو ترکہ نہیں دیتے، (اُن کا یہ عمل) قرآن مجید کے خلاف ہیں، اور

جن کا یہ قول ہو کہ ان کو میت کے مال سے کچھ نہیں پہنچتا، جس کے ظاہر معنیٰ یہ ہیں کہ اُن کا ترکہ میں کوئی حق نہیں ہوتا، یہ صریح کلمۂ کفر ہے، ایسوں پر توبہ فرض ہے، نئے سرے سے کلمۂ اسلام پڑھیں، اس کے بعد اپنی عورتوں سے نکاح دوبارہ کریں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 26،ص:353)

لزومِ کفر کا یہ حکم اُس صورت میں ہے کہ کوئی شخص بیٹی / بہن کے حقِ وراثت کا منکر ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ان کا باپ کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے، کیونکہ یہ قرآن کی نصِ قطعی کا انکار ہے، لیکن اگر وہ بیٹی کے حقِ وراثت کا عقیدۃً تو منکر نہیں ہے، لیکن ظلم کرتے ہوئے اپنی علاقائی یا قبائلی رسوم یا رواج کو بہانہ بنا کر بیٹی یا بہن کو وراثت میں حق دینے سے انکاری ہے، یہ صریح ضلالت اور فسق ہے، کیونکہ اس طرح وہ قرآن میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کے صریح اور قطعی حکم کو رسم ورواج کی بنیاد پر رَد کرتا ہے اور گویا قرآن پر علاقائی یا قبائلی رسم ورواج کو فوقیت دیتے ہوئے بیٹی یا بہن کو اُس کے حقِ وراثت سے محروم رکھتا ہے، تو یہ گناہِ کبیرہ ہے اور ظلماً مال غصب کرنا ہے اور اس پر حدیث پاک میں بڑی وعید آئی ہے:

''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَه اللّٰهُ اِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ''۔

ترجمہ:''جو شخص کسی کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا بھی ظلماً (یعنی ناحق) لے گا، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سزا کے طور پر) سات زمینوں کا طوق پہنائے گا''۔(صحیح مسلم:4108)

حلال وحرام
کے مسائل
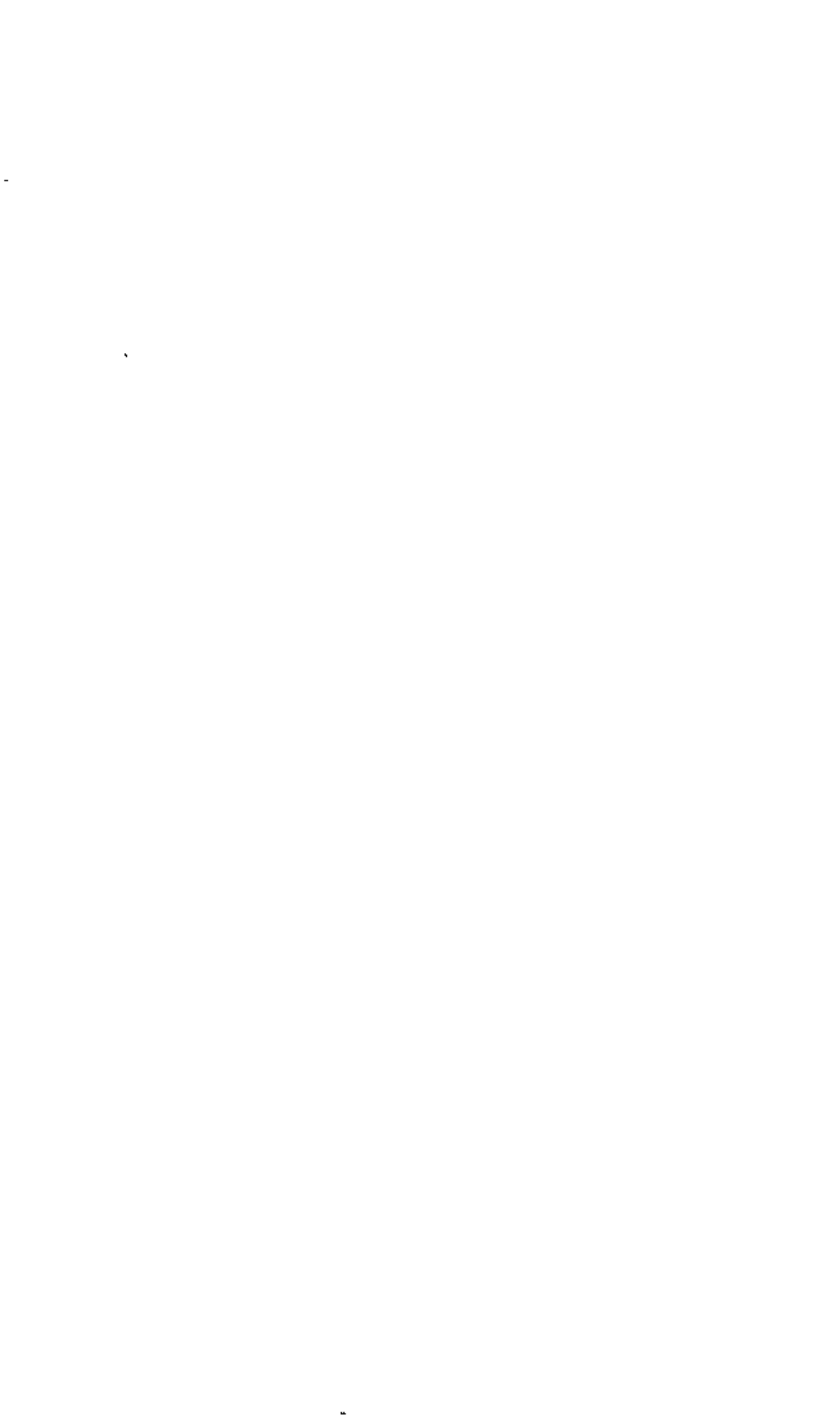
غیر مسلم معلمہ کے ذریعے اسلامیات کی تعلیم

سوال: مسلمانوں کے اسکول میں ایک عیسائی عورت مسلمان بچوں کو اسلامیات پڑھاتی ہے، شرعاً اس کا پڑھانا درست ہے یا نہیں؟، (محمد بلال، ڈرگ روڈ کراچی)۔

جواب: اسکول انتظامیہ کے لیے بہتر صورت تو یہ ہے کہ وہ اسلامیات پڑھانے کے لیے کسی دیندار مسلمان معلّم یا معلّمہ کا انتظام کریں۔ اسلامی تعلیمات عقائد، معاملات اور عمل کے باہمی ربط سے منسلک ہیں۔ ایک استاذ کے لیے لازم ہے کہ جس مضمون کو وہ پڑھا رہا ہے، اُس پر اُسے پورا عبور حاصل ہو۔ اسلاف کا بیان کردہ یہ ضابطہ منارۂ نور ہے:

''عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِیرِینَ قَالَ اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِینٌ فَانْظُرُوا عَمَّنْ تَاْخُذُونَ دِینَکُمْ''۔

ترجمہ: ''محمد بن سیرین فرماتے ہیں: حدیث کا علم دین ہے، پس تمہیں سوچنا چاہیے کہ تم کس سے اپنا دین حاصل کررہے ہو''۔

(صحیح مسلم، باب بیان اَن الاسناد من الدین، جلد 1، ص:78، بیروت)

معلم، داعی اور مُبلغ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ پڑھا رہا ہے، اس کی حقانیت پر اس کا یقین وایمان بھی ہو اور وہ خود بھی اس پر عامل ہو، جبکہ واضح بات یہ ہے کہ مسیحی عورت کا اسلامی عقائد اور تعلیمات کی حقانیت پر ایمان نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس پر عامل ہے، امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں: ''غیر مسلم کو واعظ بنا کر مسلمانوں کو اُس کا بیان سننا، اَشدّ سے اَشدّ کبیرہ گناہ اور اسلام کی بدخواہی ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:15، ص:101، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

امام احمد رضا قادری مزید فرماتے ہیں: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے شاگرد سیدنا سعید بن جبیر کو راستے میں ایک بدمذہب ملا اور کہا: کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، فرمایا: ''نہیں سننا چاہتا''۔ عرض کی: ''ایک کلمہ ہی سہی''، انہوں نے اپنا انگوٹھا چھنگلیا کے سرے پر رکھ کر فرمایا: ''وَلَا نِصْفُ کَلِمَۃٍ'' یعنی ''آدھا لفظ بھی نہیں''۔ لوگوں نے عرض کی: آپ کی اتنی شدت کا سبب کیا ہے؟ فرمایا: اِن سے دینِ اسلام کی بات سننا منع ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد امام محمد بن سیرین کے پاس دو بد مذہب آئے، عرض کی: ''کلام اللہ کی کچھ آیات آپ کو سنائیں؟''، فرمایا: ''میں نہیں سننا چاہتا''، عرض کی: ''نبی ﷺ کی کچھ احادیث سنائیں؟''، فرمایا: ''میں نہیں سننا چاہتا''، انہوں نے اصرار کیا، فرمایا: ''تم دونوں اٹھ جاؤ یا میں ہی اٹھ جاتا ہوں''۔ آخر وہ خائب وخاسر ہوکر چلے گئے۔ لوگوں نے عرض کی: ''اے امام! اگر وہ کچھ آیتیں یا حدیثیں سنا دیتے، تو سننے میں کیا حرج تھا؟''، فرمایا: ''مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ آیات واحادیث کے ساتھ اپنی کچھ تاویل لگالیں اور وہ میرے دل میں اتر جائیں تو ہلاک ہوجاؤں گا''۔

غور کا مقام ہے کہ ائمہ کو غیر مسلم سے دین اسلام کی بات سننے میں اس قدر خوف تھا اور اب عوام کو یہ جرأت ہے کہ پرواہی نہیں، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہِ۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:15 ،ص:106 ،رضا فاؤنڈیشن لاہور)

امام احمد رضا قادری مزید فرماتے ہیں: ''دیکھو امان کی راہ وہی ہے جو تمہیں تمہارے پیارے نبی ﷺ نے بتائی: ''اِيَّاكُمْ وَاِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يُفْتِنُوْنَكُمْ''، (ترجمہ: ''ان سے دور رہو اور انہیں اپنے سے دور کرو کہ کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور تمہیں فتنہ میں نہ ڈال دیں'')۔ دیکھو نجات کی راہ وہی ہے جو تمہارے رب عزوجل نے بتائی: وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ، (ترجمہ: ''اور اگر تمہیں شیطان بھلا دے، تو یاد آنے پر ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو، (الانعام:68)''۔ بھولے سے بھی اگر ان میں سے کسی کے پاس بیٹھ گئے ہو تو یاد آنے پر فوراً کھڑے ہوجاؤ، (فتاویٰ رضویہ، ج:15 ،ص:107)''۔ نوٹ: اعلیٰ حضرت کی عبارت کو ہم نے مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے سمجھنے کے لیے آسان بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ

ترجمہ: ''اور بے شک اللہ نے تم پر کتاب میں یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی

آیتوں کا انکار کیا جارہا ہے اور اُن کا مذاق اڑایا جارہا ہے، تو تم اُن کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بحث میں مشغول ہوجائیں، (ورنہ) بلاشبہ تم بھی انہی جیسے ہوجاؤ گے''۔(النساء:140)

ایک قابلِ توجہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر اسلامیات کے اسباق میں قرآن کی آیات ہیں، تو انہیں ناپاکی کی حالت میں پڑھنا اور چھونا شرعاً منع ہے اور غیر مسلم سے یہ توقع رکھنا بے جا ہے کہ وہ ان شرعی احکام کی پابندی کرے گا۔

الحمدللہ! پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور یہاں اسلامیات کے لیے معلم یا معلمہ مسلمان ہونے چاہئیں، یہاں اسلامی معلّمین اور معلمات کی قلت نہیں ہے۔البتہ یہ ضروری ہے کہ پُرامن طریقے سے جاکر اسکول کی انتظامیہ کو سمجھائیں، فساد سے اجتناب کریں۔آج کل بہت سی این جی اوز کو بیرونِ ملک سے مالی وسائل صرف اس لیے دیے جاتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کریں اور وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں، لہٰذا قرآن کے اسلوبِ دعوت وحکمت اور موعِظۂ حَسَنہ سے مُثبت اور پُرامن انداز میں اپنا مقصد حاصل کرنا چاہیے۔ان تمام مواقع پر ہر ایسے ردِّعمل سے گریز مناسب ہے کہ جس کا نقصان نفع سے زیادہ ہو۔امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس موقف کو اُس کے سیاق وسباق میں سمجھنا ضروری ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لینا چاہیے کہ اگر کسی مخالف یا لامذہب پر دین کی حجت قائم کرنا اور دلیل سے حق بات کا ابلاغ وقت کی ضرورت ہو، تو اُس سے گریز کیا جائے، یہ نتیجہ اخذ کرنا امام احمد رضا کے کلام کا منشا نہیں ہے، بلکہ احقاقِ حق، ابطالِ باطِل اور ابلاغِ دین ہر صاحبِ علم کی شرعی اور دینی ذمے داری ہے، البتہ بےعلم یا کم علم لوگوں کو اپنے مقابلے میں زیادہ علمی استعداد کے حامل لامذہب سے بحث نہیں کرنی چاہیے، اِس کا نقصان نفع سے زیادہ ہوگا اور اُن کا مقصد تلبیس ہوتا ہے، یعنی مسلمان کو اپنے دین، ایمان اور عقائد کے بارے میں تشکیک میں مبتلا کردینا۔

غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کپڑوں کا حکم

سوال: عموماً مارکیٹ میں غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کپڑے فروخت کے لیے دکانوں پر رکھے ہوتے ہیں، جنہیں نوجوانوں کی اکثریت خرید کر استعمال کرتی ہے، کیا یہ کپڑے پاک شمار کیے جائیں گے؟۔(ریاض احمد، لیاقت آباد کراچی)۔

جواب: غیر مسلم ملک سے درآمد کیے ہوئے استعمال شدہ سُویٹرز، جُرابیں، قالین، پردے اور دیگر پرانے کپڑے کہ جب تک ان پر نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو، پاک ہیں۔ بغیر دھوئے استعمال کرنے میں حرج نہیں، البتہ پینٹ، پاجامہ، انڈر ویر یا اس طرح کے کپڑوں کو دھوکر اور پاک کر کے استعمال کرنا بہتر ہے، شرعی احتیاط کا تقاضا یہی ہے، کیونکہ وہ لوگ قضاءِ حاجت کے بعد احتیاط نہیں کرتے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

''وَقَالَ بَعْضُ الْمَشَايِخِ: تُكْرَهُ الصَّلَاةُ فِي ثِيَابِ الْفَسَقَةِ لِأَنَّهُمْ لَا يَتَّقُونَ الْخُمُورَ قَالَ الْمُصَنِّفُ: الْأَصَحُّ أَنَّهُ لَا يُكْرَهُ لِأَنَّهُ لَمْ يُكْرَهْ مِنْ ثِيَابِ أَهْلِ الذِّمَّةِ إِلَّا السَّرَاوِيلُ مَعَ اسْتِحْلَالِهِمُ الْخَمْرَ فَهَذَا أَوْلَى انْتَهَى۔ بِخِلَافِ مَا إِذَا ثَبَتَ بِخَبَرٍ مُوجِبٍ فِي التَّنْجِيسِ''۔

ترجمہ: ''اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ فساق کے استعمال شدہ کپڑوں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ لوگ شراب سے نہیں بچتے۔ مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مکروہ نہیں ہے، کیونکہ غیر مسلموں کے کپڑوں میں سے شلواروں کے علاوہ باقی کپڑوں کا استعمال مکروہ نہیں ہے، اس کے باوجود کہ وہ شراب کو حلال جانتے ہیں تو فساق کے کپڑے بطریق اولیٰ مکروہ نہیں ہیں، برخلاف اس کے کہ جب اس کی وجہ نجاست کسی یقینی خبر سے ثابت ہو جائے''۔

(فتح القدیر، ج:1، ص:212-213)

صدرُ الشّریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''فاسقوں کے استعمالی کپڑے جن کا نجس ہونا معلوم نہ ہو، پاک سمجھے جائیں گے، مگر بے نمازی کے پاجامے وغیرہ میں

اِحتِیاط یہی ہے کہ رُومالی پاک کرلی جائے کہ اکثر بے نَمازی پیشاب کرکے وَیسے ہی پاجامہ باندھ لیتے ہیں اور کفّار کے ان کپڑوں کے پاک کرلینے میں تو بہت خیال کرنا چاہیے''۔

(بہارِ شریعت حصہ: 2، صفحہ: 405)

احتیاط اسی میں ہے کہ غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کپڑوں اور دیگر سامان کو دھوکر استعمال کیا جائے اور دھونے کی مشین میں جراثیم کش کیمیکل کا استعمال احتیاط کی بنا پر ضروری ہے تاکہ کوئی وائرس نہ پھیلے۔

چھپکلی مارنے کا حکم

سوال: چھپکلی کو مارنے پر نیکیاں ملتی ہیں، ایسا کیوں ہے جبکہ آقا دوعالم ﷺ تو جانوروں پر بھی شفقت فرمایا کرتے تھے، (محمد عبدالقدیر احمد، ملتان)۔

جواب: رسول اللہ ﷺ تمام عالم کے لیے رحمت ہیں اور آپ ﷺ ہر جاندار پر شفقت فرماتے تھے، احادیث مبارکہ میں جن جانوروں کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے، اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کا بیان ہے اور جن جانوروں کو شارع علیہ السلام نے قتل کرنے کا حکم دیا ہے، اُن کو قتل کرکے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کرنا چاہیے۔ ایک حدیث پاک میں پانچ جانوروں کے متعلق فرمایا:

خَمْسٌ فَوَاسِقُ يُقْتَلْنَ فِي الْحَرَمِ الْفَأْرَةُ، وَالْعَقْرَبُ، وَالْحُدَيَّا، وَالْغُرَابُ، وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ

ترجمہ: ''پانچ جانور فاسق ہیں، اُن کو حرم میں (بھی) مار دیا جائے گا، چوہا، بچھو، چیل، کوا اور کاٹنے والا کتا''۔ (صحیح بخاری: 3314)

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات انسانیت کے وسیع تر مفاد میں حکمت وفوائد سے بھرے ہوئے ہیں، مثلاً ارشاد فرمایا:

وَأَطْفِئُوا الْمَصَابِيحَ عِنْدَ الرُّقَادِ، فَإِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ رُبَّمَا اجْتَرَّتِ الْفَتِيلَةَ فَأَحْرَقَتْ أَهْلَ الْبَيْتِ

ترجمہ: ''سوتے وقت چراغوں کو بجھا دو کیونکہ فُوَیْسِقَة (چوہا) بعض اوقات چراغ کی بتی کھینچ کر لے جاتا ہے، پس گھر والوں کو جلا دیتا ہے''۔ (صحیح بخاری: 3316)

حدیث پاک میں ہے: عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلی الله علیه وسلم قَالَ لِلْوَزَغِ: الْفُوَيْسِقَةُ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چھپکلی کے بارے میں فرمایا کہ وہ فُوَیْسِقَه ہے''۔ (سنن ابن ماجہ: 3230)

''الْوَزَغ'' کا معنی گرگٹ ہے یا چھپکلی؟

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی لکھتے ہیں: ''الْوَزَغُ''، ''وَزَغَةٌ'' کی جمع ہے، علامہ کرمانی نے کہا ہے: ''الْوَزَغُ'' ایک چوپایا ہے جو گھاس کی جڑوں میں دوڑتا ہے، ایک قول یہ ہے کہ وہ اونٹنی کے تھن سے دودھ نکال کر اس کو پی جاتا ہے، ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جو آگ جلائی گئی تھی، یہ اُس میں پھونک مار رہا تھا۔ الجوہری نے کہا ہے: ''الْوَزَغَةُ'' ایک چھوٹا سا چوپایا ہے۔

میں کہتا ہوں: ''الْوَزَغَةُ'' کی یہ تفسیر گرگٹ پر صادق آتی ہے، دوسری تفسیر درج ذیل ہے، اس کے اعتبار سے اس کا معنی چھپکلی ہے۔ علامہ ابن الاثیر نے کہا ہے: ''الْوَزَغَةُ'' کو ہی ''سَامٌ اَبْرَصُ'' کہا جاتا ہے۔ (علامہ عینی فرماتے ہیں:) یہی تعریف صحیح ہے، یہ وہی ہے جو دیواروں اور چھتوں پر چلتی رہتی ہے، علامہ ابن الاثیر نے کہا ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: جب بیت المقدس کو آگ لگائی گئی تو چھپکلیاں اس میں پھونکیں مار رہی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے نہیں سنا کہ نبی ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا ہو''۔ (عمدۃ القاری، ج: 10، ص: 264، دارالکتب العلمیہ بیروت)

علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''نعمۃ الباری'' میں لکھا: ''میں کہتا ہوں کہ متعدد احادیث میں چھپکلی کو قتل کرنے کے حکم کی تصریح ہے، (نعمۃ الباری، ج: 4، ص: 267)''۔ ہوسکتا ہے کہ اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو۔

نوٹ: فُوَیسِقه، فاسقةٌ کی تصغیر ہے۔''فِسق'' کے معنی ہیں: ''حق وصلاح کے راستے سے ہٹ جانا''، اسی لیے عاصِیْ کو فاسق کہتے ہیں، کیونکہ وہ راہِ اعتدال سے انحراف کرتا ہے۔ ان جانوروں کو ''فَوَاسِق'' استعارے کے طور پر کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ فطرتاً خبیث ہوتے ہیں اور ایک قول کی رُو سے ان جانوروں کو فُوَیسِق اس لیے کہتے ہیں کہ حِل وحرم دونوں میں ان کے لیے کوئی حرمت نہیں ہے، یعنی انہیں حرم میں بھی مارا جاسکتا ہے''۔

(لسان العرب، ج:10،ص:308)

(۲)عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ ،عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ قَتَلَ وَزَغًا فِي أَوَّلِ ضَرْبَةٍ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا حَسَنَةً وَمَنْ قَتَلَهَا فِي الثَّانِيَةِ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا، أَدْنَى مِنَ الأُولَى، وَمَنْ قَتَلَهَا فِي الضَّرْبَةِ الثَّالِثَةِ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا حَسَنَةً، أَدْنَى مِنَ الَّذِي ذَكَرَهُ فِي الْمَرَّةِ الثَّانِيَةِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے پہلی ضرب میں چھپکلی کو ماردیا، اس کو اتنی اور اتنی نیکیوں کا اجر ملے گا اور جس نے دوسری ضرب میں مارا، اس کو اتنی اور اتنی نیکیوں کا اجر ملے گا اور یہ اجر پہلی ضرب سے کم ہوگا اور جس نے اس کو تیسری ضرب میں مارا اس کو اتنا اور اتنا اجر ملے گا اور یہ دوسری بار کے اجر سے کم ہوگا''۔ (صحیح مسلم:2440،سنن ابن ماجہ:3229)

(۳)عَنْ سَائِبَةَ مَوْلَاةِ الْفَاكِهِ بْنِ الْمُغِيرَةِ أَنَّهَا دَخَلَتْ عَلَى عَائِشَةَ فَرَأَتْ فِي بَيْتِهَا رُمْحًا مَوْضُوعًا فَقَالَتْ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ مَا تَصْنَعِينَ بِهَذَا قَالَتْ نَقْتُلُ بِهِ هَذِهِ الأَوْزَاغَ فَإِنَّ نَبِيَّ اللهِ صلى الله عليه وسلم أَخْبَرَنَا أَنَّ إِبْرَاهِيمَ لَمَّا أُلْقِيَ فِي النَّارِ لَمْ تَكُنْ فِي الأَرْضِ دَابَّةٌ إِلاَّ أَطْفَأَتِ النَّارَ غَيْرَ الْوَزَغِ فَإِنَّهَا كَانَتْ تَنْفُخُ عَلَيْهِ فَأَمَرَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم بِقَتْلِهِ۔

ترجمہ: ''فاکہ بن مغیرہ کی باندی سائبہ بیان کرتی ہیں کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں، تو دیکھا کہ گھر میں ایک جگہ نیزہ رکھا ہوا ہے، انہوں نے کہا: اے اُمّ المومنین

آپ اس نیزہ سے کیا کرتی ہیں؟، اُنہوں نے فرمایا: ہم اس نیزہ سے چھپکلیوں کو مارتے ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو روئے زمین کا ہر جانور اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہا تھا، ماسوا چھپکلی کے، وہ آگ میں پھونک مار رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو مارنے کا حکم دیا''۔

(سُنن ابن ماجہ:3231)

جس طرح رسول اللہ ﷺ کا کسی کے لیے نفع کی دعا کرنا آپ ﷺ کی صفتِ رحمت کا مظہر ہے، اسی طرح مستحقِ عذاب کے لیے ضرر اور نقصان کی دعا کرنا بھی آپ کی رحمت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ وہ اسی کا حق دار ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن، رؤف اور رحیم بھی ہے اور جبار، قہار اور مُنتقم بھی ہے اور کفّار وفساق کو عذاب دینا اس کی صفتِ رحمت کے منافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکابر کفار کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی دعا کے لیے ''بددعا'' کا کلمہ استعمال نہیں کرتے بلکہ علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے مقامات پر ''دعاءِ ضرر'' لکھتے ہیں اور امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز نے قنوتِ نازلہ کی بحث میں لکھا ہے: ''اور نماز صبح میں قنوت نہ پڑھتے، مگر جب کسی قوم کے لیے ان کے فائدے کی دعا فرماتے یا کسی قوم پر ان کے نقصان کی دعا فرماتے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص:520)

ضرورت کے تحت جانوروں کا مارنا

سوال:

ہمارے فلیٹس میں بلیوں کی بہتات ہے، یہ اکثر دروازوں پر پیشاب پوٹی کردیتی ہیں۔ پنجرے میں بند کر کے کسی دور علاقے میں چھوڑنے کی کوشش بھی ناکام ہو چکی ہے، ہم انہیں کس حد تک سزا دے سکتے ہیں، کیا کھانے پینے کی اشیاء میں کچھ ملا کر دے سکتے ہیں، جس سے وہ ختم ہو جائیں، اس عمل سے ہم گنہگار تو نہیں ہوں گے؟۔

(محمد حامد انصر، ماریہ لگژری اپارٹمنٹ، کراچی)

جواب:

جو جانور موذی نہیں ہیں، شریعت میں اُن کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، بلی اگر اذیت دیتی ہو تو علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْھِرَّةُ اِذَا کَانَتْ مُؤْذِیَة لَا تُضْرَبُ وَلَا تُعْرَکُ اُذُنُھَا بَلْ تُذْبَحُ بِسِکِّیْنٍ حَادٍّ کَذَا فِی الْوَجِیْز لِلْکَرْدَرِی

ترجمہ: ''بلی جب ایذا دیتی ہو تو اُسے نہ ماریں اور نہ اُس کے کان کھینچیں بلکہ تیز چھری سے ذبح کردیں، جیسا کہ ''وجیز کردری'' میں ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد خامس، ص: 361)

بلا سبب بلی یا کسی جانور کو اذیت نہیں دینا چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِیْ ھِرَّةٍ سَجَنَتْھَا حَتّٰی مَاتَتْ فَدَخَلَتْ فِیْھَا النَّارَ لَا ھِیَ اَطْعَمَتْھَا وَسَقَتْھَا اِذْ حَبَسَتْھَا وَلَا ھِیَ تَرَکَتْھَا تَاْکُلُ مِنْ خِشَاشِ الْاَرْضِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک عورت کو بلی کے سبب عذاب دیا گیا، اُس نے بلی کو باندھ کر رکھا حتیٰ کہ وہ مرگئی، وہ عورت اس سبب سے جہنم میں داخل کی گئی، جب اس عورت نے بلی کو باندھا تو اس کو کھلایا نہ پلایا اور نہ اس کو کیڑے مکوڑے کھانے کے لیے آزاد کیا''۔ (صحیح مسلم: 2242)

اگر بلیوں سے آلودگی ہو رہی ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے، تو جو صورت آپ نے بتائی ہے، وہ اختیار کی جاسکتی ہے۔ جس طرح شہر میں کتے بہت زیادہ ہوجائیں اور ان سے لوگوں کو نقصان کا اندیشہ ہو تو بلدیاتی ادارے بھی یہ تدبیر اختیار کرتے ہیں، البتہ بلاسبب یعنی گھر کی تلویث اور ان جانوروں کی ایذارسانی کے خطرات کے بغیر ان جانوروں کا مارنا درست نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں کتوں کی بہتات کے سبب اُن کے قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابنِ عُمَرَ قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ فَأَرْسَلَ فِي أَقْطَارِ الْمَدِينَةِ أَنْ تُقْتَلَ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور مدینہ کے اطراف میں کتوں کو قتل کرنے کے لیے لوگ روانہ کیے''۔

(صحیح مسلم:1570)

ڈی این اے ٹیسٹ کا حکم

سوال:

اسلام میں DNA ٹیسٹ کرانے کی اجازت ہے یا نہیں؟، نیز مغربی ممالک میں خواتین کا بھی Male ڈاکٹرز ہی ٹیسٹ کرتے ہیں، (مسعود کمال صدیقی، ناظم آباد کراچی)

جواب:

DNA دراصل Deoxyribonucleic acid کا مخفف ہے۔ جدید طبی اور سائنسی تحقیقات کے مطابق ڈی این اے ایک وراثتی اکائی کا نام ہے، جس کو عربی میں ''بصمة وراثية'' کہتے ہیں۔ دو افراد کے جسم سے کوئی خلیہ (Cell) لے کر تحقیق کی جاتی ہے کہ آیا ان دونوں میں اپنی اصل کے اعتبار سے وراثتی خصوصیات مشترک ہیں کہ ایک کو دوسرے کی نسبی اولاد قرار دیا جائے، گویا یہ ایک موروثی اشتراک کا مادّہ ہے۔ آج کل ڈی این اے ٹیسٹ کو نسب کی تحقیق اور جرائم کی تفتیش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، الغرض یہ تفتیش اور تحقیق کا ایک سائنٹیفک طریقہ ہے۔ اسے قانون کی عدالت میں ایک قرینے کے طور پر تو معتبر مانا جاسکتا ہے، لیکن حدود وقصاص کے معاملات میں اِسے بنیادی شہادت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی تا حال پاکستان کے نظامِ قانون میں ایسی گنجائش ہے کہ محض ڈی این اے ٹیسٹ کی بنیاد پر کسی کو مجرم قرار دیا گیا ہو۔ گویا قانون کی زبان میں یہ ایک ظنّی چیز ہے، کسی چیز کا حتمی اور قطعی ثبوت نہیں ہے۔ ہاں! دوسرے متعدد قرائن کے ساتھ مل کر اسے ظنِ غالب کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ ابھی تک ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ آیا

مغرب میں، جو سائنسی وفنی علم اور تحقیقات کے اعتبار سے ہم سے بہت آگے ہے، اِسے حتمی اور قطعی قانونی شہادت کا درجہ حاصل ہے کہ جسے چیلنج نہ کیا جاسکتا ہو؟ ۔شاید ایسا نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ڈی این اے یعنی اس وراثتی اکائی میں اولاد اور والدین کے درمیان مشابہت کا تعین ہوسکتا ہے۔ ڈی۔ این۔ اے ٹیسٹ میں مذکورہ مادہ کو لے کر مشین کے ذریعہ جانچا جاتا ہے، مذکورہ ٹیسٹ کا تعلق چونکہ کسی مخصوص شے کی رؤیت ومشاہدہ پر نہیں، بلکہ تمام کارروائی مشین کے ذریعہ ہوتی ہے، اس لیے اس میں غلطی کے امکان کو کلی طور پر رد نہیں کیا جاسکتا۔ مغرب میں بھی ایسے شواہد ملے ہیں کہ ڈی این اے کو حتمی اور قطعی شہادت کا درجہ دینا بے حد دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی آبروریزی کیس میں خود محققین کے بقول ڈی این اے ٹیسٹ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس ٹیسٹ میں ملے جلے متفرق مادہ مل کر کسی تیسرے شخص کی غلط نشاندہی بھی کرسکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے جدید فقہاء نے بھی اس کو حتمی اور قطعی شہادت کا درجہ نہیں دیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے نامور فقیہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

وَتَقَدَّمَ عَنِ الْبِصْمَةِ الْوِرَاثِيَةِ الطُّرُقُ الْمُقَرَّرَةِ فِي شَرِيعَتِنَا لِإِثْبَاتِ النَّسَبِ كَالْبَيِّنَةِ وَالِاسْتِلْحَاقِ وَالْفِرَاشِ أَيْ عَلَاقَةِ الزَّوجِيَّةِ، لِأَنَّ هٰذِهِ الطُّرُقَ أَقْوٰى فِي تَقْدِيْرِ الشَّرْعِ فَلَا يُلْجَأُ إِلٰى غَيْرِهَا مِنَ الطُّرُقِ كَالْبِصْمَةِ الْوِرَاثِيَةِ وَالْقِيَافَةِ إِلَّا عِنْدَ التَّنَازُعِ فِي الْإِثْبَاتِ وَعَدَمِ الدَّلِيلِ الْأَقْوٰى، (ص:151)۔

ترجمہ: ''اور یہ بات گزر چکی ہے کہ ہماری شریعت میں ثبوتِ نسب کے لیے شہادت، کسی کا خود اپنے نسب کو کسی کی طرف منسوب کرنے اور نکاح یعنی تعلقِ زوجیت کے طریقے مقرر ہیں، کیونکہ یہ طریقے شرعی اصولوں کے مطابق قوی ترین ہیں، سو ہمیں ڈی این اے اور قیافہ پر انحصار کی ضرورت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ تنازع کی صورت میں ثبوتِ نسب کے لیے قوی ترین دلیل موجود نہ ہو (تو اِسے قرینے کے طور پر لیا جاسکتا ہے)''۔

مذکورہ بالا تفصیل کے پیش نظر ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعہ کسی کے نسب کے اثبات یا

نفی کی حیثیت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ ثبوت نسب کے اول الذکر متفقہ تین طریقوں (فراش، شہادت اور اِدّعاءِ نسب) میں سے کسی طریقے پر فوقیت نہیں رکھتا، زیادہ سے زیادہ اس کی حیثیت قیافہ کی ہے، علماء احناف رحمہم اللہ کے ہاں قیافہ کے ذریعہ کسی کے نسب کا ثبوت یا نفی نہیں ہوتی۔ فراش کا حکم حدیث پاک سے ماخوذ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ

ترجمہ: ''بچے کا نسب فراش کی طرف منسوب ہوگا (یعنی بچہ اس شخص کا قرار پائے گا جس کے نکاح میں عورت ہے) اور زانی کے لیے پتھر ہے، (صحیح بخاری:6818)''۔ زانی کے لیے پتھر کے مُحدّثین نے دو معنی بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ وہ نسب کی نسبت سے محروم رہے گا اور دوسرا یہ کہ شادی شدہ زانی کو (ثبوتِ شرعی کے بعد) سنگسار کیا جائے گا۔

اگر ڈی این اے ٹیسٹ کرانا ہے تو خاتون کے خون کا نمونہ یا جسم کا کوئی خلیہ لیڈی ڈاکٹر یا نرس لے سکتی ہے، اس کے بعد ڈی این اے لیبارٹری میں ہوتا ہے، وہ ماہرین کرتے ہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ آج کل ڈی این اے ٹیسٹ کسی نامعلوم قاتل یا مقتول یا خودکش دہشت گرد کی شناخت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے بھی قرار دیا ہے کہ جبری آبروریزی کی صورت میں اگر عورت کے رحم سے مادّۂ منویہ کے اجزا لے کر یہ معلوم کیا جائے کہ زانی یا جبری آبروریزی (Rape) کرنے والا کون ہے؟ تو اسے زنا کی حد جاری کرنے کے لیے یا قتل کی صورت میں قصاص جاری کرنے کے لیے قطعی شہادت کے طور پر عدالت تسلیم نہیں کرسکتی ہے۔ البتہ اسے قرائن کی شہادت (Circumstancial Evidence) کے طور پر لیا جاسکتا ہے اور اس کی بنا پر اگر قاضی (Judge) کو اطمینان ہوجائے، تو تعزیر دے سکتا ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ جو NGOs ڈی این اے کو جبری آبروریزی (Rape) کے لیے حتمی اور قطعی ثبوت قرار دینے کے لیے واویلا مچارہے ہیں، وہ زنا بالرضا کے لیے اسے

حتمی اور قطعی ثبوت قرار دینے کے حوالے سے مہر بلب ہیں۔

قتلِ عمد میں باہمی رضامندی سے مال پر صلح جائز ہے

سوال:

اگر ورثاء مقتول قتلِ عمد میں دیت لینا چاہیں، تو شریعتِ محمدی میں قتلِ عمد کی دیت کتنی ہے؟، نیز مقتول کے ورثاء قاتل سے مُقدمہ کے خرچہ کا مطالبہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟،

(مولانا لعل مرجان، گلستانِ جوہر بلاک 19، کراچی)

جواب:

قتلِ عمد کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔کفر کے بعد تمام گناہوں میں سخت ترین گناہ قتل ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ:''اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اللہ اس پر لعنت کرے گا اور اللہ نے اس کے لیے عذاب عظیم تیار کررکھا ہے، (النسا:93)''۔قتلِ عمد میں قصاص لازم آتا ہے، اگر ورثاء راضی ہوں تو قاتل کو دیت لے کر معاف کرسکتے ہیں جب کہ قاتل بھی راضی ہو۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْكَبَائِرُ اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ۔

ترجمہ:''اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، (ناحق) انسانی جان کو قتل کرنا اور (ماضی کے بارے میں قصداً) جھوٹی قسم کھانا (سب کے سب) کبیرہ گناہ ہیں''۔

(صحیح بخاری:6870)

حدیث پاک میں ہے:

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا دُفِعَ اِلٰى اَوْلِيَاءِ الْمَقْتُوْلِ فَاِنْ شَاؤُوْا قَتَلُوْا، وَاِنْ شَاؤُوْ

أَخَذُوا الدِّيَةَ وَهِيَ ثَلَاثُونَ حِقَّةً، وَثَلَاثُونَ جَذَعَةً وَأَرْبَعُونَ خَلِفَةً وَمَا صَالَحُوا عَلَيْهِ فَهُوَ لَهُمْ۔

ترجمہ: '' جس شخص نے کسی مومن کو عمداً قتل کیا، اس کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کردیا جائے گا، اگر وہ چاہیں تو اس کو قتل کردیں اور اگر وہ چاہیں تو اس سے دیت وصول کرلیں۔ قتلِ عمد کی دیت یہ ہے: تیس تین سال کی اونٹنیاں، تیس چار سال کی اونٹنیاں اور چالیس پانچ سال کی اونٹنیاں، اس کے علاوہ جس مقدار پر وہ صلح کرلیں''۔ (سُنن ترمذی: 1387)

علامہ علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَقِيلَ اِنَّ قَوْلَهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ: فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ نَزَلَ فِي الصُّلْحِ عَنْ دَمِ الْعَمَدِ فَيَدُلُّ عَلَىٰ جَوَازِ الصُّلْحِ وَسَوَاءٌ كَانَ بَدَلُ الصُّلْحِ قَلِيلًا أَوْ كَثِيرًا مِنْ جِنْسِ الدِّيَةِ أَوْ مِنْ خِلَافِ جِنْسِهَا

ترجمہ: '' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' سو جس (قاتل) کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کردیا گیا ہو تو (اس کا) دستور کے مطابق مطالبہ کیا جائے اور نیکی کے ساتھ اس کی ادائیگی کی جائے، یہ (حکم) تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے، پھر اس کے بعد جو حد سے تجاوز کرے، اس کے لیے دردناک عذاب ہے، (البقرہ: 178)''۔ یہ آیت قتلِ عمد میں صلح کے جواز پر دلالت کرتی ہے، خواہ خون کا (مالی) بدل کم ہو یا زیادہ، وہ (بدلِ صلح) جنسِ دیت سے ہو یا اُس کے مخالف جنس سے ہو''۔ (بدائع الصنائع، جلد 7، ص: 370)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

(وَ) مُوْجِبُهُ (اَلْقَوَدُ عَيْنًا) فَلَا يَصِيرُ مَالًا إِلَّا بِالتَّرَاضِي فَيَصِحُّ صُلْحًا وَلَوْ بِمِثْلِ الدِّيَةِ أَوْ أَكْثَرَ

ترجمہ: '' قتلِ عمد پر (اصل کے اعتبار سے) قصاص واجب ہے، لہٰذا قصاص سے مال پر (صلح کی طرف) عدول نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ فریقین باہم راضی ہوجائیں تو (مال

پر) صلح درست ہے،خواہ (قتلِ خطا کی) دیت کے برابر ہو یا زیادہ''۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

إِذَا كَانَ الْقَوَدُ عِنْدَنَا هُوَالْوَاجِبُ فِي الْعَمَدِ فَلَا يَنْقَلِبُ مَالاً اِلَّا مِنْ جِهَةِ الصُّلْحِ. وَلَوْ بِمِثْلِ الدِّيَةِ أَوْ أَكْثَرَ أَطْلَقَهُ فَشَمَلَ مَالَوْكَانَ مِنْ جِنْسِهَا أَوْ مِنْ غَيْرِهِ حَالاً أَوْ مُؤَجَّلاً

ترجمہ:''چونکہ اصل حکمِ شرعی کے اعتبار سے قتلِ عمد میں قصاص واجب ہے، پس فریقین کی باہمی رضامندی کے بغیر یہ مال میں تبدیل نہیں ہوگا۔باہمی رضامندی سے مال پر صلح جائز ہے،خواہ (یہ بدلِ صلح) قتلِ خطا کی دیت کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو، اُسے مُطلق رکھا ہے تاکہ یہ عام رہے،جنسِ دیت سے ہو یا اس کے غیر سے ہو،فوری ادائیگی کی بنیاد پر ہو یا تاخیر سے ادائیگی (Deffered Payment) کی بنیاد پر ہو۔

(جلد 10،ص:126، بیروت)

مقتول کے ورثاءمقدمے کے اخراجات کے نام پر تو قاتل یا اس کے ورثاء سے مطالبہ نہیں کرسکتے۔لیکن جب شریعت نے قتلِ عمد کی مال پر صلح کی صورت میں فریقین کے لیے کم یا زیادہ کی گنجائش رکھی اور کسی مقدار مال کا تعین نہیں کیا،تو وہ اپنے حسبِ حال کسی بھی مقدار مال پر صلح کرسکتے ہیں،بس دونوں کی رضامندی شرط ہے۔مقتول کے ورثاء مقدمے کے اخراجات کو شامل کرکے دیت کی مقدار کا تعین کرسکتے ہیں۔

خنزیر کے بالوں کا ضرورت کے تحت استعمال

سوال:1

خنزیر کے بالوں کا استعمال اور اُن بالوں سے بنی مصنوعات کا شرعی حکم کیا ہے؟۔خواہ استعمال خارجی ہو مثلاً شیونگ برش وغیرہ۔

سوال:2

جو چیزیں مصنوع ہوکر مارکیٹ میں آرہی ہیں،وہ درج ذیل ہیں:

پانی کی فائبر ٹنکی،عام رنگ کے برش،شیونگ،میک اپ برش،میز،کرسیاں،گاڑیوں کی

باڈی، جہاز کی سیٹ، مساجد کے گنبد، پارکنگ شیڈ، لنچ باکس وغیرہ۔ان اشیاء کی فروخت اتنی کثیر تعداد میں ہورہی ہے کہ اس کے استعمال سے بچنا ناممکن ہے،کیا عمومِ بلویٰ کے تحت اجازت دی جاسکتی ہے؟۔اوران مصنوعہ اشیاء کا متبادل نہ ہونے کی صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟۔بعض اشیاء میں اجازت اور بعض میں ممانعت والا معاملہ ہوسکتا ہے؟۔

سوال:3

بعض فقہاء نے امام محمد سے اس بارے میں رخصت کی ایک روایت نقل فرمائی، جیسا کہ البحرالرائق میں ہے:

(وَلٰکِنَّهٗ مُقَیَّدٌ بِالْخَرْزِ لِلضَّرُورَةِ،هٰذَا بِنَاءً عَلٰی قَوْلِ أَبِی یُوسُفَ بِنَجَاسَتِهٖ أَمَّا عَلٰی قَوْلِ مُحَمَّدٍ الْآتِیْ مِنْ أَنَّهٗ طَاهِرٌ فَلَا یَتَقَیَّدُ الْاِنْتِفَاعُ بِهٖ بِالْخَرْزِ، وَلَا بِالضَّرُوْرَةِ،قَالَ الزَّیْلَعِیُّ فِیْ تَعْلِیْلِ عَدَمِ اِفْسَادِهِ الْمَآءَ : اِذَا وَقَعَ فِیْهِ لِاَنَّ اِطْلَاقَ الْاِنْتِفَاعِ بِهٖ دَلِیْلُ طَهَارَتِهٖ وَهٰذَا یَقْتَضِیْ جَوَازَ بَیْعِهٖ عِنْدَ مُحَمَّدٍ أَیْضًا، وَلِذَا قَالَ فِی النَّهْرِ وَیَنْبَغِیْ أَنْ یَطِیْبَ لِلْبَائِعِ الثَّمَنُ عَلٰی قَوْلِ مُحَمَّدٍ۔(البحرالرائق، جز۱۶،ص:۷۷)

سوال:4

کیااس مسئلے کودرختوں پر بور آنے سے پہلے پھل فروخت کرنے والے مسئلے پر قیاس کر کے اجازت دی جاسکتی ہے؟۔

سوال:5

اگر دو پرتوں کے درمیان مذکورہ برش سے رنگ کیا گیا اور برش کے کچھ بال اس میں لگ گئے تو یہ بال اس مصنوعہ چیز کے تابع ہوکر فروخت ہوسکتی ہیں؟ مشکل یہ ہے کہ کوئی دوسرا برش اس معاملے میں ناکام ہے کہ کیمیکل کی حدت کی وجہ سے پھول جاتے ہیں یامنتشر یا پگھل جاتے ہیں۔ ہزاروں خاندان براہ راست اس کاروبار سے منسلک ہیں، وہ کیا کریں؟،(محمد عمر فاروق،PIA افسر،ملیر کراچی)۔

جواب:

خنزیر کی کھال یا بالوں کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ خنزیر نجس العین ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اِس کی حُرمت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: فَاِنَّهٗ رِجْسٌ ترجمہ: ''کیونکہ وہ ناپاک ہے''۔(الانعام:145)

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں:

قَالَ وَکُلُّ اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ، وَجَازَتِ الصَّلٰوةُ فِيْهِ، وَالْوُضُوْءُ مِنْهُ اِلَّا جِلْدَ الْخِنْزِيْرِ وَالْاٰدَمِيِّ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَيُّمَا اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ،

ترجمہ: ''(صاحبِ قدوری نے) فرمایا: ہر وہ کھال جو دِباغت (کے ذریعے پاک) کرلی گئی ہو، وہ پاک ہے اور اُس پر نماز پڑھنا جائز ہے اور اُس سے (بصورت مشکیزہ) وضو کرنا جائز ہے، سوائے خنزیر اور آدمی کی کھال کے (یعنی انسان کی جلد کا استعمال اکرامِ انسانیت کی وجہ سے حرام ہے اور خنزیر کی کھال نجس العین ہونے کی وجہ سے حرام ہے) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو چمڑا رنگ لیا جائے، وہ پاک ہے''۔مزید لکھتے ہیں:

وَحُجَّةٌ عَلَى الشَّافِعِيِّ فِيْ جِلْدِ الْكَلْبِ، وَلَيْسَ نَجَسَ الْعَيْنِ، أَلَا تَرٰى أَنَّهٗ يُنْتَفَعُ بِهٖ حِرَاسَةً وَاصْطِيَادًا، بِخِلَافِ الْخِنْزِيْرِ لِأَنَّهٗ نَجَسُ الْعَيْنِ، اِذِ الْهَاءُ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى ''فَاِنَّهٗ رِجْسٌ'' مُنْصَرِفٌ اِلَيْهِ لِقُرْبِهٖ۔

ترجمہ: ''(یہ حدیث اپنے عموم کی وجہ سے) کتے کی کھال کے حق میں امام شافعی کے خلاف حُجّت ہے کیونکہ کتا نجس العین نہیں ہے، کیا آپ کا مشاہدہ نہیں ہے کہ کتے سے نگہبانی اور شکار پکڑنے کے طور پر نفع لیا جاتا ہے، برخلاف سور کے، کیونکہ وہ نجس العین ہے، اللہ تعالیٰ کے قول (فَاِنَّهٗ رِجْسٌ) میں ضمیر خنزیر کی طرف راجع ہے کیونکہ یہی قریب ہے، (ہدایہ، جلد1، ص:62,63,64)''۔نجس العین سے مراد وہ چیز ہے جو شرعاً اپنی ذات اور ماہیت میں ناپاک ہو۔

خنزیر کے بال بھی ناپاک ہیں، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

(وَشَعْرُ الْمَيْتَةِ) غَيْرَ الْخِنْزِيرِ عَلَى الْمَذْهَبِ (وَعَظْمُهَا وَعَصَبُهَا) عَلَى الْمَشْهُورِ (وَحَافِرُهَا وَقَرْنُهَا) الْخَالِيَةُ عَنِ الدُّسُومَةِ۔۔۔۔۔۔۔ طَاهِرٌ۔

ترجمہ:''ظاہر الروایت کے مطابق خنزیر کے علاوہ ہر مُردار کے بال، ہڈی، پٹھے، کُھر اور سینگ جو چربی سے خالی ہوں، پاک ہیں۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1، ص:320)''۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز لکھتے ہیں: ''خنزیر نجس العین ہے اور اس کا ہر جزوِ بدن ایسا ناپاک کہ اصلاً صلاحیتِ طہارت نہیں رکھتا''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 4، ص:475)

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْخِنْزِيرُ فَشَعْرُهُ وَعَظْمُهُ وَجَمِيعُ أَجْزَائِهِ نَجِسَةٌ وَرَخَّصَ فِي شَعْرِهِ لِلْخَرَّازِينَ لِلضَّرُورَةِ لِأَنَّ غَيْرَهُ لَا يَقُومُ مَقَامَهُ عِنْدَهُمْ، وَعَنْ أَبِي يُوسُفَ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى: أَنَّهُ كَرِهَ لَهُمْ ذٰلِكَ أَيْضًا وَلَا يَجُوزُ بَيْعُهُ فِي الرِّوَايَاتِ كُلِّهَا، وَإِنْ وَقَعَ شَعْرُهُ فِي الْمَاءِ الْقَلِيلِ نَجَّسَهُ عِنْدَ أَبِي يُوسُفَ، وَعِنْدَ مُحَمَّدٍ لَا يُنَجِّسُ، وَإِنْ صَلَّى مَعَهُ جَازَ عِنْدَ مُحَمَّدٍ، وَعِنْدَ أَبِي يُوسُفَ لَا يَجُوزُ إِذَا كَانَ أَكْثَرَ مِنْ قَدْرِ الدِّرْهَمِ، وَاخْتَلَفُوا فِي قَدْرِ الدِّرْهَمِ قِيلَ وَزْنًا وَقِيلَ بَسْطًا كَذَا فِي ''السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ''۔ وَذَكَرَ السِّرَاجُ الْهِنْدِيُّ أَنَّ قَوْلَ أَبِي يُوسُفَ بِنَجَاسَتِهِ هُوَ ظَاهِرُ الرِّوَايَةِ وَصَحَّحَهُ فِي ''الْبَدَائِعِ'' وَرَجَّحَهُ فِي ''الْاِخْتِيَارِ''۔

ترجمہ:''رہا خنزیر، تو اُس کے بال اور اُس کی ہڈی اور اُس کے تمام اجزاء نجس ہیں، البتہ ضرورت کی بنا پر اُس کے بالوں سے جُفت سازوں (Shoe Maker) کو جوتی گانٹھنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز اس کے قائم مقام نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس کو بھی مکروہ کہا ہے اور فقہاءِ احناف کے تمام اقوال کے مطابق خنزیر کے بالوں کی بیع جائز نہیں ہے اور خنزیر کا بال کم (غیر جاری) پانی میں گر جائے، تو امام ابو یوسف کے نزدیک وہ پانی کو ناپاک کردے گا اور امام محمد کے نزدیک نجس نہیں ہوگا۔ (اگر کپڑوں میں اس کا بال ہو تو) امام محمد کے نزدیک اُس پر نماز جائز ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک نماز ناجائز ہوگی، جبکہ درہم کی مقدار سے زائد ہو۔ اور درہم کی مقدار میں

(ائمہ کا) اختلاف ہے، بعض نے وزن کا اعتبار کیا ہے اور بعض نے اُس کے پھیلاؤ (Size) کا، ''السراج الوہاج'' میں اسی طرح ہے، ''سراج الہندی'' نے ذکر کیا کہ امام ابو یوسف نے جو خنزیر کے بال کو ناجائز کہا ہے، یہی (فقہِ حنفی کی) ظاہر الروایہ ہے، ''بدائع الصنائع'' میں اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے، ''الاختیار'' میں بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے''۔

(البحر الرائق، جلد 1، ص:191)

آپ کا یہ مفروضہ درست نہیں ہے کہ ان مصنوعہ اشیاء کا مُتبادل موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پینٹ، شیونگ، منہ کی صفائی اور دیگر استعمال کے لیے عام برش بازار میں دستیاب ہوتے ہیں، پینٹ کرنے کے لیے بہت اچھے اور عمدہ پلاسٹک برش ملتے ہیں، جن سے ضرورت پوری ہوجاتی ہے، اس لیے ضرورت کے تحت بھی خنزیر کے بالوں سے بنے ہوئے برش کے استعمال کی گنجائش نہیں ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں خنزیر مالِ مُتقوّم نہیں ہے، اس لیے بھی اس کی بنی مصنوعات کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ فلرز، سلیٹ فائبر، گلاس فائبر، کاٹن وول جیسے ٹھوس مادے جو طبعی خواص بہتر بنانے یا سینتھیٹک مرکبات کی پیداواری لاگت کم کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، سینتھیٹک مرکبات میں ربڑ، پلاسٹک وغیرہ شامل ہیں۔

عرف میں عمومِ بلویٰ پر اُس وقت عمل کیا جاتا ہے، جب قرآن وسنّت کے عام حکم کے خلاف نہ ہو، نصِ شرعی اور فقہاء کے فتاویٰ کے خلاف عرف معتبر نہیں ہوگا، یہ بنیادی اصول ہے۔

سوال نمبر 3 میں آپ نے جو عبارت نقل کی ہے، وہ عبارت ''البحر الرائق'' کی نہیں بلکہ اُس پر علامہ محمد امین بن عمر عابدین المعروف ابن عابدین دمشقی حنفی مُتوفی 1252ھ کے حاشیہ ''منحۃ الخالق علی البحر الرائق'' کی ہے۔ لیکن وہاں بھی صراحت ہے کہ امام محمد نے جفت ساز کے لیے ضرورت کی بنا پر خنزیر کے بالوں کے استعمال کی اجازت دی تھی، لیکن یہ قول مُفتیٰ بہ نہیں ہے، یعنی اس پر فتویٰ نہیں دیا جائے گا، ''ظاہر الروایہ'' امام ابو یوسف رحمہ

اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اِس پر حرفِ آخر کے طور پر لکھا ہے کہ:

''قدیم فُقہاء نے جو ضرورت کی بنا پر خنزیر کے بالوں سے جوتی گانٹھنے کی اجازت دی تھی، وہ اُس زمانہ کے اعتبار سے تھی، کیونکہ اُس وقت جوتی گانٹھنے کے لیے شاید اِس سے زیادہ اور کوئی مضبوط چیز میسر نہیں تھی، لیکن اب چونکہ زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے اور جوتی گانٹھنے کے لیے مختلف نوع کے مضبوط دھاگے اور مٹیریل ایجاد ہو چکا ہے، اِس لیے اب خنزیر کے بالوں کا کسی بھی حال میں استعمال جائز نہیں ہے''۔ (تبیان القرآن، جلد 6،ص:534)

سوال نمبر 4 میں آپ نے درختوں پر بور آنے سے پہلے فروخت کرنے والے مسئلے پر قیاس کرنے کی بابت سوال کیا، خنزیر کے بالوں کو درختوں پر بور آنے سے پہلے فروخت کرنے پر قیاس کرنا ''قیاس مع الفارق'' ہے، یعنی ان دونوں (''مقیس'' (جسے قیاس کیا جارہا ہے اور ''مقیس علیہ'' جس پر قیاس کیا جارہا ہے) میں کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے۔

عاقدین کی باہمی رضامندی سے بیع منعقد ہونے کے بعد کسی ایک فریق کو یکطرفہ طور پر فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے

سوال:

سید نجم الحسن 2010 سے ڈاکٹر فرید کے کرایہ دار تھے، مارچ 2012ء میں ڈاکٹر فرید نے فلیٹ فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور سید نجم الحسن سے تین گواہوں کی موجودگی میں 58 لاکھ روپے میں چھ ماہ کی مدت میں ادائیگی کا معاہدہ ہوگیا۔ پانچ لاکھ روپے ایڈوانس اور وقتاً فوقتاً 30 لاکھ روپے ادا کردیے گئے۔ ہر مرتبہ ڈاکٹر فرید سے نجم الحسن نے سیل ایگریمنٹ اور بقیہ کارروائی مکمل کرنے کا کہا، مگر ڈاکٹر فرید نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ ہم چھ ماہ میں کئی بار تمام چیک لے کر ان کے پاس گئے کہ بقایا رقم لے کر فلیٹ ہمارے نام کر دیں، لیکن انہوں نے پیسے لینے سے انکار کردیا۔ اب نہ وہ ہماری رقم واپس کررہے ہیں اور

نہ فلیٹ ہمارے نام کررہے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ چھ ماہ میں فلیٹ کی قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ شرعی حکم کیا ہے؟، (سید نجم الحسن، کراچی)۔

جواب:

نفسِ مسئلہ سے قبل یہ بات مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق تجارت ومعاملات میں دیانت، امانت، صداقت اور عہدو پیمان کی پابندی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور یہ خوبیاں اسلامی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ سوا اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو، (النساء:29)''۔ آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ بیع عاقدین کی باہمی رضامندی سے منعقد ہوتی ہے۔

ایجاب وقبول سے بیع منعقد ہوجاتی ہے اور چیز بائع کی مِلک سے نکل کر مشتری کی مِلک میں داخل ہوجاتی ہے۔ بیع منعقد ہونے کے بعد اُسے کوئی ایک فریق یک طرفہ طور پر فسخ نہیں کرسکتا، علامہ ابوبکر فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں: وَاِذَا حَصَلَ الْاِيْجَابُ وَالْقُبُولُ لَزِمَ الْبَيْعُ وَلَاخِيَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا اِلَّا مِنْ عَيْبٍ أَوْ عَدَمِ رُؤْيَةٍ۔ ترجمہ: ''اور جب ایجاب وقبول دونوں ہوجائیں تو بیع لازم اور تمام ہوجاتی ہے اور بائع ومشتری میں سے کسی کو فسخ کا اختیار حاصل نہیں رہتا، سوائے اس کے کہ مبیع (فروخت شدہ چیز) میں کوئی عیب ظاہر ہوجائے یا مشتری نے بیع کے وقت مبیع کو نہ دیکھا ہو (تو خیارِ عیب اور خیارِ رویت حاصل ہوتا ہے)''۔ (ہدایہ، ج:5، کتاب البیوع، ص: 60، مکتبۃ البشریٰ، کراچی)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''بیع ایجاب وقبول سے تمام ہوجاتی ہے اور جب بیع شریعت کے مطابق صحیح طور پر منعقد ہوجائے تو اس کے بعد بائع یا مشتری کسی کو بے رضامندی دوسرے کے اس سے یوں

پھر جانا رَوا نہیں، نہ اس کے پھرنے سے وہ معاہدہ جو مکمل ہو چکا ہے، ٹوٹ سکتا ہے۔ زید پر لازم ہے کہ مال فروخت شدہ تمام وکمال خریدار کو دے، ہدایہ میں ہے: اِذَاحَصَلَ الْاِیْجَابُ وَالْقَبُوْلُ لَزِمَ الْبَیْعُ وَلَاخِیَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا اِلَّا مِنْ عَیْبٍ اَوْ عَدَمِ رُؤْیَةٍ۔ ترجمہ: ''اور جب ایجاب وقبول حاصل ہو جائے تو بیع لازم ہو جاتی ہے اور بائع ومشتری میں سے کسی کو فسخ کا خیار حاصل نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ مبیع میں کوئی عیب ظاہر ہو جائے یا مشتری نے بیع کے وقت اس کو دیکھا نہ ہو''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 17، ص:87، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ایجاب وقبول کے بعد مبیع کی قیمت اگر بڑھ جائے تو بائع کو زائد رقم لینے کا اختیار نہیں بلکہ طے شدہ قیمت پر ہی مُشتری کو دے گا۔ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''ایک نے امر کا صیغہ استعمال کیا، جو حال پر دلالت کرتا ہے، دوسرے نے ماضی کا مثلاً اس نے کہا: اس چیز کو اتنے میں لے، دوسرے نے کہا: میں نے لیا، اقتضاءً بیع صحیح ہوگئی کہ اب نہ بائع دینے سے انکار کرسکتا ہے نہ مشتری لینے سے''۔ (بہارشریعت، جلد دوم، ص:618)

صورتِ مسئولہ میں چونکہ گواہوں کی موجودگی میں بیع منعقد ہوئی ہے، قیمت طے ہوچکی ہے، بائع نے قیمت کی کچھ اقساط وصول بھی کر لی ہیں، اس لیے ان کے پاس یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ سیل ایگریمنٹ اور خریدار کے نام فلیٹ کی منتقلی قانونی تقاضے ہیں، ان میں التوا سے بیع فسخ نہیں ہوتی اور بائع کو قانونی تقاضے پورے کرنے چاہییں۔

جادو حرام ہے

سوال:

میرا ایک دوست نماز روزے کا پابند ہے، مگر اُس کے ساتھ کچھ روحانی مسائل ہیں۔ کئی عاملوں سے علاج کرایا، مگر وقتی فائدہ ہوتا ہے اور پھر مسئلہ برقرار رہتا ہے، کیا وہ کسی جادوگر سے علاج کرا سکتا ہے، جبکہ اُسے صرف جادوگر کو پیسے دینا ہیں، کام جادوگر خود ہی کرے گا؟، (محسن، حیدرآباد)۔

جواب:

جادو کرنا فی نفسہٖ حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔حدیث پاک میں ہے:

اِجتَنِبُوا الْمُوبِقَاتِ اَلشِّرکُ بِاللّٰہِ، وَالسِّحْرُ۔

ترجمہ:''ہلاک کرنے والے کاموں سے بچو: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا''۔

(صحیح بخاری:5764)

کسی کو ضرر پہنچانے کے لیے جادو کرنا یا کروانا بالاتفاق ناجائز وحرام اور کبیرہ گناہ ہے، لیکن جادو کے اُتار وغیرہ کے لیے بھی کسی جادوگر کی خدمات نہ لی جائیں کہ یہ ایسے افراد کی حوصلہ افزائی ہے۔بحیثیت مسلمان بھی ان اُمور سے اجتناب اور اللہ تعالیٰ سے شفا طلب کرنی چاہیے۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خَیْرُ الدَّوَاءِ الْقُرآنُ۔

ترجمہ:''بہترین دوا قرآن ہے''۔(سنن ابن ماجہ:3501)

(۲) اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

اَنَّ رَسُولَ اللّٰہ ﷺ اِذَا اِشْتَکٰی نَفَثَ عَلٰی نَفسِہٖ بِالْمُعَوِّذَاتِ، وَمَسَحَ عَنْہُ بِیَدِہٖ، فَلَمَّا اَشْتَکٰی وَجَعَہُ الَّذِیْ تُوُفِّیَ فِیْہِ، طَفِقْتُ أَنْفُثُ عَلٰی نَفسِہٖ بِالْمُعَوِّذَاتِ الَّتِی کَانَ یَنفُثُ، وَأَمسَحُ بِیَدِ النَّبِیِّ ﷺ عَنْہُ۔

ترجمہ:''جب رسول اللہ ﷺ بیمار ہوتے تو اپنے اوپر مُعوِّذتین ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' پڑھ کر دَم فرماتے اور اپنا ہاتھ اپنے جسم پر پھیرتے، پھر جب آپ اپنے مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے، تو میں ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' پڑھ کر آپ پر دَم کرتی، جن کو پڑھ کر آپ دم فرماتے تھے اور نبی ﷺ کا ہاتھ آپ کے جسم پر پھیرتی تھی''۔(صحیح بخاری:4439)

(۳) اسی طرح رسول اللہ ﷺ حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے یہ دعا پڑھ کر دَم فرماتے:

أَعُوْذُ کُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّۃِ، مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَھَامَّۃٍ، وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّۃٍ ۔

ترجمہ: ''میں تم دونوں کو ہر شیطان اور موذی جانور (اور زہریلے حشرات الارض) اور ہر نگاہِ بد سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں''۔ (صحیح بخاری:3371)

(۳) آپ ﷺ جب کسی مریض کی عیادت فرماتے تو یہ کلمات ارشاد فرماتے:

لَا بَأْسَ طَھُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ

کوئی حرج نہیں، ان شاء اللہ یہ آپ کے لیے (گناہوں سے) پاکیزگی کا سبب ہوگا''۔ (صحیح بخاری:5662)

(۴) جب کسی شخص کو کوئی تکلیف ہوتی، آپ اپنا دایاں دست مبارک اس پر پھیرتے اور یہ کلمات ارشاد فرماتے:

أَذْھِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ

ترجمہ: ''اے میرے پروردگار! (اس مریض کی) تکلیف کو دور فرمادے''۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے جدِّ اعلیٰ (ابراہیم علیہ السلام) یہ کلمات پڑھ کر حضرات اسماعیل واسحاق علیہما السلام کو دَم فرماتے تھے''۔ (صحیح بخاری:5675)

(۵) عثمان بن ابوالعاص ثقفیؓ بیان کرتے ہیں: اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درد کی شکایت کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنا سیدھا ہاتھ درد کی جگہ پر رکھو، پھر تین مرتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھو اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھو:

''أَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ''۔

ترجمہ: ''میں اس شر سے جو مجھے لاحق ہے اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خدشہ ہے، اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ میں آتا ہوں، حضرت عثمان بن العاص بیان کرتے ہیں: میں نے یہ دعا پڑھی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اُس درد سے نجات عطا فرمادی''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2202)

(۶) حضرت ابوسعید خدری بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جبریل امین

میرے پاس آئے اور کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ کو تکلیف ہے، میں نے جواب دیا: ہاں، اُنہوں نے یہ کلمات پڑھ کر مجھے دَم کیا:

بِسْمِ اللهِ أَرْقِيكَ، مِنْ كُلِّ شَيْئٍ يُؤْذِيكَ، مِن شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ، اَللهُ يَشْفِيكَ، بِسمِ اللهِ أَرقِيكَ۔

ترجمہ: ''ہر وہ چیز جو آپ کو تکلیف دے رہی ہے اور ہر حاسد کی نظر سے پناہ دینے کے لیے اللہ کا نام لے کر آپ کو دَم کرتا ہوں، اللہ آپ کو شفا عطا فرمائے، میں اللہ تعالیٰ کے (مبارک) نام سے آپ کو دَم کرتا ہوں''۔ (صحیح مسلم:2186)

استخارہ

سوال:

میں ایک فلیٹ خریدنا چاہتی ہوں، استخارہ کے ذریعے بہتر صورت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ مہربانی فرما کر استخارہ فرمادیں کہ یہ فلیٹ خریدنا میرے حق میں بہتر ہوگا یا نہیں؟

(عصمت ندیم)

جواب:

''استخارہ'' کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، شکستگیِ دل، حضوریِ قلب، تضرُّع وعاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہوسکتی ہے، دوسرے شخص کو نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں ہے: رب ذوالجلال فرماتا ہے: ترجمہ: میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت ومحبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں''۔ (الاسرار المرفوعہ، رقم الحدیث:249، کشف الخفاء ج1ص:232، الشفاء قاضی عیاض مالکی ج1ص:78)

استخارے کی دعا حدیث میں موجود ہے اور اپنی زبان میں بھی مُدعا بیان کرسکتے ہیں۔ اور سُنن ترمذی میں استخارے کی مختصر دعا یہ ہے: ترجمہ: ''اے اللہ! میرے لیے (جو خیر ہے) وہ صورت مقدر فرما''۔

سوال:

میں استخارہ کرتا ہوں لیکن کوئی رہنمائی نہیں ملتی، تو اس صورت میں کوئی بھی فیصلہ کرلوں وہ ٹھیک ہوگا، کسی دوسرے شخص سے اپنا استخارہ کرواسکتے ہیں؟۔(فرحان انجم)۔

جواب:

استخارہ کا مقصد اللہ تعالیٰ سے مشاورت کرنا ہے، جس کے نتیجے میں کوئی واضح اشارہ یا خواب نظر آنا ضروری نہیں بلکہ اُس معاملے پر انسان کی رائے پختہ ہوجانا یا کسی حتمی فیصلہ پر پہنچ جانا ہی استخارہ کا حاصل ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَفِي الْحِلْيَةِ: وَيُسْتَحَبُّ افْتِتَاحُ هٰذَا الدُّعَاءِ وَخَتْمُهُ بِالْحَمْدَلَةِ وَالصَّلَاةِ، وَفِي الْأَذْكَارِ أَنَّهُ يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَةِ الْأُولَى الْكَافِرُونَ. وَفِي الثَّانِيَةِ الْإِخْلَاصَ، وَعَنْ بَعْضِ السَّلَفِ أَنَّهُ يَزِيدُ فِي الْأُولَى ''وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝'' وَفِي الثَّانِيَةِ ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ'' (الاحزاب: 36) اَلْآيَةَ۔ وَيَنْبَغِي أَنْ يُكَرِّرَهَا سَبْعًا، لِمَا رَوَى ابْنُ السُّنِّيِّ يَا أَنَسُ إِذَا هَمَمْتَ بِأَمْرٍ فَاسْتَخِرْ رَبَّكَ فِيهِ سَبْعَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ انْظُرْ إِلَى الَّذِي سَبَقَ إِلَى قَلْبِكَ فَإِنَّ الْخَيْرَ فِيهِ وَلَوْ تَعَذَّرَتْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ اسْتَخَارَ بِالدُّعَاءِ اهـ مُلَخَّصًا۔ وَفِي شَرْحِ الشِّرْعَةِ: الْمَسْمُوعُ مِنَ الْمَشَائِخِ أَنَّهُ يَنْبَغِي أَنْ يَنَامَ عَلَى طَهَارَةٍ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ بَعْدَ قِرَاءَةِ الدُّعَاءِ الْمَذْكُورِ، فَإِنْ رَأَى مَنَامَهُ بَيَاضًا أَوْ خُضْرَةً فَذٰلِكَ الْأَمْرُ خَيْرٌ، وَإِنْ رَأَى فِيهِ سَوَادًا أَوْ حُمْرَةً فَهُوَ شَرٌّ يَنْبَغِي أَنْ يُجْتَنَبَ

ترجمہ: ''اور'' حلیہ'' میں ہے: اس دعاءِ استخارہ کی ابتدا اور آخر میں حمد وصلوٰۃ پڑھنا مستحب ہے، اور'' الاذکار'' میں ہے: پہلی رکعت میں سورۂ'' الکافرون'' پڑھے اور دوسری میں سورۂ ''اخلاص'' اور بعض بزرگوں سے روایت ہے کہ پہلی رکعت میں ''وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ (القصص:69-68) تک ان کلمات کا اضافہ کرے اور

دوسری رکعت میں سورۂ احزاب، آیت: 36 کا اضافہ کرے۔ (اور اگر درپیش مسئلہ کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں قلبی اطمینان حاصل نہ ہوتو) سات دن تک مسلسل یہ نماز پڑھے، جیسا کہ ابن السّنی نے روایت کیا ہے:

(ترجمہ:) ''اے انس! جب تو کسی کام کا ارادہ کرے، تو اپنے رب سے اس میں سات بار رہنمائی کی دعا کرتا رہے، پھر غور وفکر کر کہ تیرے دل میں جو بات قرار پا گئی ہے (یعنی اس کام کا کرنا یا نہ کرنا)، بس خیر اسی میں ہے''، اور اگر اس کے لیے نماز پڑھنا دشوار ہوتو صرف دعا کر کے استخارہ کرلے، (یہ ''اذکار'' کی عبارت کا) خلاصہ ہے، اور ''شَرْحُ الشِّرْعَة'' میں ہے کہ (ہم نے اپنے) مشائخ سے سنا ہے کہ مذکورہ دعا پڑھنے کے بعد باوضو ہوکر قبلہ رو سوجائے، اگر اپنے خواب میں سفید یا ہرا رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں خیر ہے، (اور اس کام کو کرلے) اور اگر کالا یا سرخ رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں شر ہے، پھر اس کام سے اجتناب کرے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلدنمبر 2 صفحات 410-409 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

حدیث پاک میں خواب میں کسی چیز کے نظر آنے یا نہ آنے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی خواب کا آنا ضروری ہے، یہ بزرگوں اور اہلِ خیر کے اپنے اپنے تجربات ہیں، لیکن اگر خواب نظر آجائے، تو اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مگر اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنے کے بعد جب دل کو کسی ایک جانب سکون وقرار نصیب ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے اس کام کو کرلے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کسی ناکامی کا سامان ہو، تو یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو سمجھنے میں مجھ سے خطا ہوگئی ہے، اور یا یہ سمجھے کہ اگر اس کے برعکس کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ (خدانخواستہ) اس سے بڑی ناکامی یا نقصان کا سامنا کرنا پڑتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ ۔

ترجمہ:''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے حق میں ناپسندیدہ سمجھو، (مگر) وہ (درحقیقت) تمہارے حق میں بہتر ہو اور (یہ بھی) ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لیے پسندیدہ سمجھو (مگر درحقیقت) وہ تمہارے لیے بری ہو''۔(البقرۃ:216)

جنازے کے مسائل

میت کے گھر کا کھانا

سوال:

وفات کے تیسرے دن میت کے گھر والوں کی طرف سے کھانے کا اہتمام اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ اگر نہیں کیا تو خاندان میں ناک کٹ جائے گی، اور لوگ اس کھانے کو ثواب سمجھ کر کھاتے ہیں، جو نہیں کھاتا، اُسے برا/ بدعقیدہ سمجھا جاتا ہے۔اس کی شرعی حیثیت بیان فرمادیں، (حافظ محمد حسین، کراچی)۔

جواب:

یہ رسم خلافِ شرع ہے۔شریعت کا حکم یہ ہے کہ دو وقت یا (ایامِ تعزیت پر محمول کرتے ہوئے) زیادہ سے زیادہ تین دن تک اہلِ میت کو ان کے رشتے دار یا احباب کھانا فراہم کریں، کیونکہ وہ سوگ کی وجہ سے کھانے کا اہتمام نہیں کر سکتے۔حدیث پاک میں ہے:

عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِصْنَعُوا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَاِنَّهٗ قَدْ اَتَاهُمْ اَمْرٌ شَغَلَهُمْ۔

ترجمہ: ''آلِ جعفر کے لیے کھانا تیار کرو، کیونکہ وہ ایسے غم میں مبتلا ہیں کہ اُنہیں (کھانا تیار کرنے کی) فرصت نہیں ہے''۔(سنن ابوداؤد:3132)

اس کی شرح میں علامہ علی القاری لکھتے ہیں: ''اہلِ میت کے لیے جو کھانا بھیجا جاتا ہے، اسے آج کل (یعنی اُن کے دور میں) مکہ میں ''رُفعہ'' کہتے ہیں اور یہ کھانا دفنِ میت کے بعد بھیجا جاتا ہے (پاک وہند کے بعض علاقوں میں اسے کڑوی روٹی کہتے ہیں)''۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: ''طیبی نے کہا: رشتے داروں اور پڑوسیوں کے لیے مستحب ہے کہ میت کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کریں اور یہ میت والوں کی مشغولیت کا دورانیہ ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور بعض نے کہا: اس کو ہم میت کی تعزیت یعنی تین دن پر بھی محمول کر سکتے ہیں''۔(مرقاۃ المفاتیح، جلد 4،ص:194)

(۲)عَن اَسمَاءَ بِنتِ عُمَیسٍ قَالَت: لَمَّا اُصِیبَ جَعفَرٌ رَجَعَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ اِلَی أَھلِہٖ فَقَالَ: اِنَّ آلَ جَعفَرٍ قَد شُغِلُوا بِشَأنِ مَیِّتِھِم،فَاصنَعُوا لَھُم طَعَامًا۔ قَالَ عَبدُاللّٰہِ:فَمَازَالَت سُنَّۃً،حَتّٰی کَانَ حَدِیثًا فَتُرِکَ۔

ترجمہ: اسماء بنت عُمیس بیان کرتی ہیں: جب جعفر بن ابی طالب کی شہادت واقع ہوگئی،تو رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کے پاس آئے اور فرمایا: ''جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو، کیونکہ وہ میت کے غم میں مبتلا ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں نے ان کے لیے کھانا تیار کیا،عبداللہ بیان کرتے ہیں: یہ شعار بطور سنت جاری رہا، یہاں تک کہ اس میں بدعات رائج ہوگئیں تو یہ سنت ترک ہوگئی''۔ (سنن ابن ماجہ:1611)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں میت کے اہلِ خانہ کے لیے تین دن تک کھانا فراہم کرنے کا شعارِ سنت کے طور پر رائج تھا، پھر اس نے اس معنی میں بدعت کی صورت اختیار کرلی کہ اسے فخر ومباہات اور نام ونمود کا ذریعہ بنالیا گیا کہ لوگ میت کے گھر جمع ہوتے ہیں اور وہ ان کے لیے پُرتکلّف کھانے کا اہتمام کرتے ہیں،پس جس عمل سے سنت ساقط ہوجائے یا اس کی روح پامال ہوجائے،تو وہ یقیناً بدعت ہے۔ البتہ اگر ایصالِ ثواب کی نیت سے فقراء کے لیے کھانا تیار کیا جائے اور انہیں کھلایا جائے، تو یہ شرعاً مستحسن اور پسندیدہ ہے۔ چنانچہ جریر بن عبداللہ البجلی بیان کرتے ہیں:

کُنَّا نَرَی الاجتِمَاعَ اِلَی أَھلِ المَیِّتِ،وَصَنعَۃَ الطَّعَامِ،مِنَ النِّیَاحَۃِ۔

ترجمہ: ''ہم اہلِ میت کے گھر جمع ہوکر کھانا تیار کرنے کو نوحہ خوانی میں شمار کرتے تھے (جوکہ ممنوع ہے)''۔ (سنن ابن ماجہ:1612)

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

وَیُکرَہُ اِتِّخَاذُ الضِیافَۃِ مِنَ الطَّعَامِ من أَھلِ المَیِّتِ لأنہ شُرِعَ فِی السُّرُورِ لَافِی الشُّرُورِ، وَھِیَ بِدعَۃٌ مُستَقبِحَۃٌ،وَرَوَی الاِمَامُ أَحمَدُ وابنُ مَاجَۃَ بِاِسنَادٍصَحِیحٍ عَن جَرِیرِبنِ عَبدِاللّٰہِ قَالَ: کُنَّا نَعُدُّ الاِجتِمَاعَ اِلَی أَھلِ المَیِّتِ،وَصَنعَھُمُ الطَّعَامَ مِنَ النِّیَاحَۃِ۔

ترجمہ:''اہلِ میت کی طرف سے کھانے کی ضیافت تیار کرنی منع ہے کہ شرع نے ضیافت خوشی کے موقع پر رکھی ہے نہ کہ غم کے موقع پر اور یہ قبیح بدعت ہے۔امام احمد اور امام ابن ماجہ نے اپنی سند کے ساتھ جریر بن عبداللہ سے روایت کی ہے،وہ فرماتے ہیں:''ہم اہلِ میت کے گھر جمع ہوکر کھانا تیار کرنے کو نوحہ خوانی میں شمار کرتے تھے (جوکہ ممنوع ہے)''۔

(فتح القدیر،جلد2،ص:151)

ترجمہ:''حضرت کُلَیب ایک انصاری صحابی سے بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنازے میں نکلے،تو میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ قبر پر قبر کھودنے والے کو ہدایت فرمارہے تھے کہ قبر کو قدموں اور سر کی جانب سے کشادہ کردو، جب آپ واپس ہوئے تو متوفّی کی بیوی کا بلاوا آیا،آپ ﷺ اُن کے ہاں تشریف لے گئے اور ہم بھی آپ کے ہمراہ تھے،پس کھانا لایا گیا تو آپ ﷺ نے اُس میں ہاتھ ڈالا اور پھر سب لوگوں نے کھانا کھایا''۔(مشکوٰۃ المصابیح:5942)

اس کی شرح میں علامہ علی القاری لکھتے ہیں:یہ حدیث بظاہر اس کے خلاف ہے جو ہمارے اصحابِ مذہب نے بیان کیا ہے کہ میت کے پہلے یا تیسرے دن یا ایک ہفتے کے بعد(اس کے گھر) کھانا تیار کرنا مکروہ ہے،جیسا کہ''بزازیہ''میں ہے۔''خلاصہ''میں ذکر کیا کہ تین دن تک میت کے گھر ضیافت کے طور پر کھانا تیار کرنا جائز نہیں ہے۔ اور''زیلعی'' نے کہا:تین دن تک میت کے گھر بیٹھنے میں حرج نہیں ہے،بشرطیکہ کسی ممنوع کا ارتکاب نہ ہو جیسے دریاں بچھانا اور میت کے گھر والوں سے کھانا تیار کرانا۔امام ابن ہُمام نے کہا:میت کے گھر ضیافت کا اہتمام مکروہ ہے اور سب نے علّت یہ بیان کی کہ ضیافت مسرت کے موقع پر مشروع ہے نہ کہ مصیبت کے موقع پر،اُنہوں نے کہا:یہ بدعتِ قبیحہ ہے۔امام احمد اور امام ابن حِبان نے سندِ صحیح کے ساتھ جریر بن عبداللہ سے روایت کیا،وہ کہتے ہیں:ہم میت کے گھر جمع ہونے اور کھانا تیار کرنے کو نوحہ خوانی میں شمار کرتے تھے(جوکہ بدعت ہے)۔

اس تفصیل کو بیان کرنے کے بعد علامہ علی القاری لکھتے ہیں:میت کے گھر کھانے کے

اہتمام کی ممانعت اور کراہت کو ان صورتوں پر محمول کیا جائے:

(۱) میت والے شرماحضوری اور ناگواری کے ساتھ کھانے کا اہتمام کریں، اسی کو سوال میں کھانے کا اہتمام نہ ہونے کی صورت میں ناک کٹنے سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) میت کے بعض ورثاء نابالغ ہوں یا موجود نہ ہوں یا اُن کی رضامندی نہ ہو اور میت کے ترکے سے ضیافت کا اہتمام کیا جائے۔ ہاں! اگر کوئی ایک وارث میت کے ترکے سے نہ کرے بلکہ اپنے مال سے کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور امام قاضی خان کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ ایامِ مصیبت میں میت کے گھر ضیافت کا اہتمام مکروہ ہے کیونکہ یہ افسوس کے دن ہیں تو ان دنوں میں وہ کام نہیں کرنے چاہییں جو مسرت کے موقع پر کیے جاتے ہیں۔ اور اگر فقراء کے لیے کھانا تیار کیا جائے تو یہ اچھی بات ہے اور کسی شخص کا اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کرنا کہ میری موت کے بعد تین دن تک لوگوں کی دعوت کرنا، تو صحیح قول کی رو سے یہ باطل ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ترکے کی ایک تہائی تک اس وصیت پر عمل کرنا جائز ہے اور بظاہر یہی بات اصولِ شرع کے مطابق ہے''۔

(مرقاۃ المفاتیح، جلد 11، ص:85-84)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں: ''اکثر لوگوں کو اس رسم شنیع کے باعث اپنی طاقت سے زیادہ ضیافت کرنی پڑتی ہے، یہاں تک کہ میّت والے بیچارے اپنے غم کو بھول کر اس آفت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اس میلے کے لیے کھانا، پان چھالیا کہاں سے لائیں اور بارہا ضرورت قرض لینے کی پڑتی ہے۔ ایسا تکلف شرع کو کسی امر مباح کے لیے بھی ہرگز پسند نہیں، نہ کہ ایک رسم ممنوع کے لیے، پھر اس کے باعث جو دقتیں پڑتی ہیں، خود ظاہر ہیں، پھر اگر قرض سودی ملا تو حرام خالص ہو گیا اور معاذ اللہ لعنت الٰہی سے پورا حصہ ملے کہ بے ضرورت شرعیہ سود دینا بھی سود لینے کے باعث لعنت ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں فرمایا۔ غرض اس رسم کی شناعت وممانعت میں شک نہیں، اللہ عزوجل مسلمانوں کو توفیق بخشے کہ قطعاً ایسی رسوم شنیعہ جن سے ان کے دین و دنیا کا ضرر ہے ترک کردیں، اور بیہودہ طعن کا

لحاظ نہ کریں، واللہ الھادی۔

تنبیہ: اگر چہ صرف ایک دن یعنی پہلے ہی روز عزیزوں کو ہمسایوں کو مسنون ہے کہ اہل میّت کے لیے اتنا کھانا پکوا کر بھیجیں، جسے وہ دو وقت کھا سکیں اور باصرار انہیں کھلائیں، مگر یہ کھانا صرف اہل میّت ہی کے قابل ہونا سنت ہے۔ اس میلے کے لیے بھیجنے کا ہرگز حکم نہیں اور ان کے لیے بھی فقط روز اول کا حکم ہے آگے نہیں، کشف الغطاء میں ہے: مستحب است خویشاں و ہمسایہ ہائے میّت را کہ اطعام کنند طعام را برائے اہل وے کہ سیر کند ایشاں را یک شبانہ روز والحاح کنند تا بخورند و در خوردن غیر اہل میّت ایں طعام را مشہور آنست کہ مکروہ است اھ ملخصاً۔

ترجمہ: ''میّت کے عزیزوں، ہمسایوں کے لیے مستحب ہے کہ اہل میّت کے لیے اتنا کھانا پکوائیں جسے ایک دن رات وہ سیر ہوکر کھا سکیں اور اصرار کر کے کھلائیں، غیر اہل میّت کے لیے یہ کھانا قول مشہور کی بنیاد پر مکروہ ہے اھ ملخصا۔

عالمگیری میں ہے: حَمۡلُ الطَّعَامِ اِلٰی صَاحِبِ الۡمُصِیۡبَۃِ وَالۡاَکۡلُ مَعَھُمۡ فِی الۡیَوۡمِ جَائِزٌ لِشُغۡلِھِمۡ بِالۡجِھَازِ وَبَعۡدَہٗ یُکۡرَہُ، کَذَا فِی ''التَّتَارخَانِیَۃ''، وَاللہُ تَعَالٰی اَعۡلَمُ وَعِلۡمُہٗ جَلَّ مَجۡدُہٗ اَتَمُّ وَاَحۡکَمُ۔

ترجمہ: ''اہل میّت کے یہاں پہلے دن کھانا لے جانا اور ان کے ساتھ کھانا جائز ہے کیونکہ وہ جنازے میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے بعد مکروہ ہے۔ ایسا ہی تتارخانیہ میں ہے: واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ جل مجدہ اتم واحکم''۔

(فتاویٰ ہندیہ، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات، نورانی کتب خانہ پشاور)

مزید لکھتے ہیں: ''یوں ہی چہلم یا برسی یا ششماہی پر کھانا بے نیت ایصال ثواب محض ایک رسمی طور پر پکاتے اور شادیوں کی بھاجی کی طرح برادری میں بانٹتے ہیں، وہ بھی بے اصل ہے، جس سے احتراز چاہیے، ایسے ہی کھانے کو شیخ محقق مولانا عبدالحق صاحب محدّث دہلوی ''مجمع البرکات'' میں فرماتے ہیں: آنچہ بعد از سالے یا ششماہی یا چہل روز درین دیار

پزند درمیان برادران بخشش کنند چیزے داخل اعتبار نیست بہتر آنست کہ نخورند ھٰکَذَا نَقَلَ عَنْہُ شَیْخُ الاِسلَامِ فِی ''کشف الغطاء''۔

ترجمہ: ''وہ جو اس دیار میں ایک سال یا چھ ماہ پر پکاتے اور برادری میں بانٹتے ہیں کوئی معتبر چیز نہیں، بہتر یہ ہے کہ نہ کھائیں اھ، اسی طرح ان سے شیخ الاسلام نے کشف الغطاء میں نقل کیا ہے۔ خصوصاً جب اس کے ساتھ ریاء و تفاخر مقصود ہو کہ جب تو اس فعل کی حرمت میں اصلاً کلام نہیں۔

اور حدیث صحیح میں ہے: نَھٰی رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِیَیْنِ اَنْ یُؤکَلَ، اَخرَجَہٗ اَبُودَاوٗد وَالْحَاکِمُ عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنھُمَا بِاسنَادٍ صَحِیحٍ، قَالَ الْمُنَاوِی: أَی الْمُتَعَارِضِینِ بِالضِّیَافَۃِ فَخرًا وَ رِیَاءً لِاَنَّہٗ لِلرِّیَاءِ لَا لِلّٰہِ۔ ترجمہ: یعنی جو کھانے تفاخر وریاء کے لیے پکائے جاتے ہیں ان کے کھانے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا۔ (اسے ابوداؤد اور حاکم نے سندِ صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے۔ امام مناوی نے کہا: یعنی ضیافت کے ذریعہ ناموری اور دکھاوا مقصود ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں دکھاوے کے لیے ہے۔ (المستدرک علی الصحیحین)، (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر زیر حدیث مذکور دارالمعرفۃ بیروت)، (التیسیر شرح الجامع الصغیر، زیر حدیث مذکور، مکتبۃ الامام الشافعی الریاض السعودیہ)۔ مگر واضح قرینے کے بغیر کسی مسلمان کا یہ سمجھ لینا کہ یہ کام اس نے تفاخر وناموری کے لیے کیا ہے جائز نہیں کہ قلب کا حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور مسلمان پر بدگمانی حرام، ھٰذا ھُوَ بِحَمدِ اللّٰہِ الْقَوْلُ الْوَسَطُ لَاوَکْسَ فِیْہِ وَلَا شَطَطَ وَاِنْ خَالَفَ مَنْ فَرَّطَ فِی الْبَابِ وَ اَفْرَطَ، وَاللّٰہ سُبحانَہٗ، وَتَعَالٰی أَعْلَمُ۔ (یہ بحمد اللہ درمیانی قول ہے جس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی، اگرچہ اس باب میں افراط وتفریط کرنے والوں نے اختلاف کیا اور خدائے پاک وبرتر خوب جاننے والا ہے)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9،ص:666-671، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

الغرض جو صورت آپ نے بیان کی ہے، وہ شریعت کی رُو سے ناپسندیدہ ہے اور جس

چیز میں ریا اور نمود شامل ہو جائے، اُس پر اللہ کی بارگاہ سے اجر کی توقع عبث ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ برادری کے طعن سے بچنے کے لیے میت کے گھر والے اپنی عزت بچانے کی خاطر اپنے گھر آنے والوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرتے ہیں، تو یہ رسم ناپسندیدہ ہے، قبیح بدعت ہے اور ساری برادری والوں کو مل کر اُسے ختم کرنا چاہیے۔

اگر برادری کا کوئی فرد میت کے گھر کھانا نہیں کھاتا، تو اُس پر طعن کرنا یا اُسے بدعقیدہ سمجھنا درست نہیں ہے، تاوقتیکہ اُس کے بدعقیدہ ہونے کے بارے میں کوئی اور قطعی شواہد آپ کے پاس نہ ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لینا چاہیے، قرآن وسنّت کی تعلیمات بھی یہی ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اِس رسم کو ناپسندیدہ سمجھ کر نہ کھاتا ہو تاکہ اِس کی حوصلہ شکنی ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ اگر یہ کھانا ایصالِ ثواب کے لیے ہے تو اس کے بہتر حقدار فقراء مساکین ہیں۔

سوئم، چہلم، برسی پر ایصالِ ثواب کا کھانا فقراء کو کھلانا چاہیے وہی اس کے اصل مستحقین ہیں۔ اگر اُمَرا ء کھالیں تو شرعاً منع بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ نفلی صدقہ ہے اور اس کا فقراء ومساکین پر تصدق افضل ہے واجب نہیں ہے۔ اپنے خوش حال رشتے داروں اور دوست احباب کے لیے دعوت کا اہتمام کرنا بھی باعث اجر ہے، ان کے لیے ہدیہ اور ہبہ کی نیت سے کھلانا بہتر ہے، ایصالِ ثواب اس کا بھی ہوسکتا ہے۔

(۱) امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز سے پوچھا گیا: ''سوم کے چنوں، بتاشوں کا لینا کیسا ہے؟'' آپ نے جواب دیا: ''اور سوم کے چنے بتاشے بغرض مہمانی نہیں منگائے جاتے بلکہ ثواب پہنچانے کے قصد سے ہوتے ہیں، یہ اس حکم میں داخل نہیں، نہ میرے اس فتوے میں ان کی نسبت کچھ ذکر ہے، یہ اگر مالک نے (الگ سے) محتاجوں کے دینے کے لیے منگائے اور یہی اس کی نیت ہے تو غنی کو ان کا لینا بھی ناجائز، اور اگر اس نے حاضرین کے لیے منگائے تو اگر غنی بھی لے لے گا تو گنہگار نہ ہوگا، اور یہاں بحکم عرف ورواج عام حکم یہی ہے کہ وہ خاص مساکین کے لیے نہیں ہوتے تو غنی کا بھی لینا ناجائز نہیں، اگرچہ احتراز

زیادہ پسندیدہ ہے، اور اسی پر ہمیشہ سے اس فقیر کا عمل ہے"۔

(۲) اسی طرح ان سے پوچھا گیا: "جو کھانا بہ نیتِ خاص برائے ایصالِ ثواب خواہ بزرگانِ دین سے ہوں یا عام مسلمان، پکوایا جائے تو اس کھانے کو اغنیا کھا سکتے ہیں؟"۔ آپ نے جواب دیا: "اَغنیا بھی کھا سکتے ہیں، سوائے اُس کھانے کے، جو موت میں بھی بطورِ دعوت کیا جائے، وہ ممنوع و بدعت ہے"۔

(۳) اسی طرح امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا: "جو طعام بہ نیتِ ایصالِ ثواب بروحِ بزرگان تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو اَغنیا بھی کھا سکتے ہیں یا نہیں؟، عام اَمواتِ مومنین کے لیے جو کھانا وغیرہ دیا جاتا ہے، اُس میں اور اس طعام میں جو اَنبیاء عظام اور اولیاءِ کرام کی ارواح کے لیے ہدیہ کیا جاتا ہے، کچھ ذاتی فرق ہے یا نہیں؟، برکت و عدمِ برکت کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں مصرف ایک ہوگا، یعنی صرف فقراء کو دینا یا اغنیاء کے لیے بھی کھانا جائز ہوگا"۔ آپ نے جواب میں لکھا: "طعام تین قسم ہے: ایک وہ کہ وہ عوام ایامِ موت میں بطورِ دعوت کرتے ہیں، یہ ناجائز و ممنوع ہے، اَغنیا کو اس کا کھانا جائز نہیں۔ دوسرے وہ طعام کہ اپنے اَموات کو ایصالِ ثواب کے لیے بہ نیت تصدُّق کیا جاتا ہے، فقراء اس کے لیے اَحق (زیادہ حق دار) ہیں، اغنیا کو نہ کھانا چاہیے۔ تیسرے وہ طعام کہ نذورِ اَرواحِ طیبہ (یہاں نذر شرعی نہیں بلکہ نذرِ عُرفی مراد ہے) حضرات انبیاء و اولیاء علیہم الصلوٰۃ والثناء کیا جاتا ہے اور فقراء و اغنیاء سب کو بطورِ تبرُّک دیا جاتا ہے، یہ سب کو بلا تکلف روا ہے اور وہ ضرور باعث برکت ہے، برکت والوں کی طرف جو چیز نسبت کی جاتی ہے، اس میں برکت آجاتی ہے، مسلمان اس کھانے کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ اس میں مُصیب ہیں (یعنی یہ شِعار درست ہے)"۔

(۴) اسی طرح آپ نے سوم کے چنوں کے بارے میں فرمایا: "یہ چنے فقراء ہی کھائیں، غنی کو نہ چاہیے، بچہ یا بڑا، غنی بچوں کو ان کے والدین منع کریں"۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:9، صفحات:605، 609، 610، 612، 614، 615، 672، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

بزرگانِ دین کے ایصالِ ثواب کے لیے اَعراس کے مواقع پر جو کھانا تیار ہوتا ہے، اسے اُن بزرگوں کی نسبت کی وجہ سے "تبرُّک" کہا جاتا ہے، یہ بھی نفلی صدقہ ہے اور امراء اور فقراء دونوں اسے کھا سکتے ہیں۔ قرض لے کر ایصالِ ثواب کرلیا تو ثواب یقیناً ملے گا، لیکن شریعت نے جس امر کا مکلف نہیں کیا، اپنے آپ کو اُس کا مکلف بنانا اور قرض لے کر خود کو زیر بار کرنا شرعاً پسندیدہ امر نہیں ہے۔ اگر کسی علاقے میں ایصالِ ثواب تہذیب وثقافت کے طور پر کیا جائے یا محض رسم سمجھ کر کیا جائے یا نہ کرنے والے کو ملامت کیا جائے، خواہ وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اور اسے مجبوراً قرض لے کر کرنا پڑے ورنہ طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے گا، تو یہ طرزِ عمل غیر شرعی ہے اور کسی مستحب امر کے نہ کرنے پر ملامت کرنا اسے واجب کا درجہ دینا ہے اور یہ بدعت ہے، کسی امر کو واجب قرار دینا صرف شارع کا اختیار ہے۔ وہ صدقہ یا کھانا جو ناک اونچی کرنے کے لیے یا اَنا (جو شریعت کی منشا کے خلاف ہو) اور تفاخرِ نفس کی خاطر دیا جائے، اُس پر اَجر کی اُمید رکھنا عبث ہے۔

جن کا کام تھا کھلانا، وہ خود کھا رہے ہیں
فعلِ قبیح سے اپنے، سنت مٹا رہے ہیں
معاشرتی دباؤ کیسا، ناک کٹنے کا اندیشہ
روزِ سوگ میں، شرفِ ضیافت اڑا رہے ہیں

قبر کی بے حرمتی کی رسم

سوال:

اندرونِ سندھ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے ورثاء قبر پر مٹی ڈال کر اس پر چڑھ جاتے ہیں اور قبر کو پیروں سے خوب لتاڑتے ہیں۔ وہاں یہ مشہور ہے کہ "پاؤں سے مٹی کو دبانا ورثاء کا حق ہے"، شرعی حکم بیان فرمائیں۔

(عبدالرؤف، ٹھٹھہ)

جواب:

شریعتِ مُطہرہ میں مسلمانوں کی قبروں کی تکریم وادب کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ''لَأَنْ يَجْلِسَ أَحَدُكُمْ عَلَى جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِيَابَهُ حَتَّى تَخْلُصَ إِلَى جِلْدِهِ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَجْلِسَ عَلَى قَبْرٍ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ آگ کپڑے جلا کر اس کی کھال تک پہنچ جائے، یہ اذیت اس سے بہتر ہے کہ وہ اس کی قبر پر بیٹھے''(ابوداؤد:3226)

(۲)عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَأَنْ يَجْلِسَ أَحَدُكُمْ عَلَى جَمْرَةٍ تُحْرِقُهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَجْلِسَ عَلَى قَبْرٍ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی آگ کی چنگاری پر بیٹھے اور وہ اُسے جلا ڈالے، یہ (اذیت) اُس سے بہتر ہے کہ وہ کسی (مسلمان) کی قبر پر بیٹھے''۔(ابن ماجہ:1566)۔

یعنی قبر پر بیٹھنے کا عذاب اِس سے زیادہ ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قبر پر بیٹھنے کی سنگینی کو بیان کرنے کے لیے وعید ہے۔

قبروں پر چلنا اور راستہ بنانا بھی حرام ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِأَنَّهُمْ نَصُّوا عَلَى أَنَّ الْمُرُورَ فِي سِكَّةٍ حَادِثَةٍ فِيهَا حَرَامٌ۔

ترجمہ:''علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ قبرستان کے اندر نئے بنائے ہوئے راستے پر چلنا حرام ہے''۔(ردالمحتار جلد 1 صفحہ :482،داراحیاء التراث العربی بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:''علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ حیات وموت دونوں صورتوں میں مسلمان کی عزت برابر ہے۔ محقق علی الاطلاق علامہ کمال الدین بن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: وَتَوْضِيحُهُ الِاتِّفَاقُ عَلَى أَنَّ حُرْمَةَ

اَلْمُسْلِمِ مَیِّتًا کَحُرْمَتِہٖ حَیًّا، ترجمہ: اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت وحرمت زندہ مسلمان کی طرح ہے، (ترجمہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کَسْرُ عَظْمِ الْمَیِّتِ وَاَذَاہُ کَکَسْرِہٖ حَیًّا، رَوَاہُ اِمَامُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَۃَ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِیْنَ عَائِشَۃَ الصِّدِّیْقَۃِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا۔ ترجمہ: ''مردے کی ہڈی کوتوڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کوتوڑنا، اسے ائمہ حدیث احمد وابوداؤد وابن ماجہ نے بسندِ حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا''۔ یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، اَلْمَیِّتُ یُؤْذِیْہِ فِیْ قَبْرِہٖ مَا یُؤْذِیْہِ فِیْ بَیْتِہٖ۔ ترجمہ: ''سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے اپنے گھر میں اُسے اذیت ہوتی۔ علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں: اَفَادَاَنَّ حُرْمَۃَ الْمُؤْمِنِ بَعْدَ مَوْتِہٖ بَاقِیَۃٌ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت موت کے بعد بھی ویسے ہی باقی ہے۔ سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اَذَی الْمُؤْمِنِ فِیْ مَوْتِہٖ کَاَذَاہُ فِیْ حَیَاتِہٖ رَوَاہُ اَبُوْبَکْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے، جیسے اسے زندگی میں تکلیف پہنچانا، اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ علماء فرماتے ہیں: اَلْمَیِّتُ یَتَاَذّٰی بِمَا یَتَاَذّٰی بِہِ الْحَیُّ، کَذَا فِیْ رَدِّالْمُحْتَارِ وَغَیْرِہٖ مِنْ مُعْتَمَدَاتِ الْاَسْفَارِ۔ (یعنی جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں، جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے، (ت)۔ علامہ شیخ عبدالحق مُحدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اَشِعَّۃُ اللّمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں: ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت مُتالم میگردد بجمیع آنچہ مُتالم میگردد بدان حی ولازم اینست کہ مُتلذذ گردد بتمام آنچہ مُتلذذ می شود بدان زندہ، انتہی، (یعنی اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی اَلَم پہنچتا ہے، اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (مترجم)''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 442-441)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قبرِ مسلم کا اکرام لازم ہے، مذکورہ علاقے کے لوگوں کا یہ عقیدہ کہ میت کی قبر پر چڑھ کر پاؤں سے مٹی کو دبانا، ورثاء کا حق ہے، خلافِ شرع اور باطل مفروضہ ہے، اُنہیں گناہ پر مبنی نظریے سے توبہ کرنی چاہیے، اہلِ علم حضرات کو چاہیے کہ وہ اس رسم کی حوصلہ شکنی کریں اور لوگوں کو شریعت کے اَحکام سے آگاہ کریں۔

وقف قبرستان کی حیثیت تبدیل نہیں کی جاسکتی

سوال:

میں آپ کا سلسلہ اپنی دینی رہنمائی کی غرض سے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتی چلی آرہی ہوں، مفتی صاحب اس مرتبہ میں آپ سے اپنے ذاتی مسئلہ پر رہنمائی چاہتی ہوں، میرے والد کا انتقال 1988 میں ہوا، اس وقت ہم دونوں بھائی بہن نابالغ تھے۔ انہوں نے انتقال سے کچھ عرصہ قبل گاؤں کی ایک جگہ وراثتی سات کنال اور دوسری جگہ تقریباً بیس کنال زمین قبرستان کے لیے وقف کردی تھی وقت گذرتا رہا، اس دوران دونوں جگہوں نے کمرشل حیثیت اختیار کرلی اور برلب سڑک آگئی۔ سات کنال والی زمین پر ایک طرف اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود صرف تین قبریں ہیں، اور کچھ ایسی ہی صورتحال دوسری جگہ پر ہے، میں اور میرے بھائی چاہتے ہیں کہ اس زمین کو بیچ کر کچھ مدد حاصل کرسکیں۔ آیا ہم اتنا ہی رقبہ اس کے قریب جگہ بطور متبادل رقبہ قبرستان کے لیے وقف کردیں یا پھر جہاں قبریں ہیں وہاں آس پاس تھوڑی زمین چھوڑ کر چار دیواری دیتے ہوئے اس کو قبرستان کے لیے رکھ دیں اور باقی استعمال میں لے آسکتے ہیں، براہ مہربانی رہنمائی کریں، (حنا محمود۔ اسلام آباد)۔

جواب:

کسی چیز کو ایک مرتبہ وقف کیے جانے کے بعد وقف سے رجوع درست نہیں۔ وقف کے معنی ہیں: ''کسی شے کو اپنی مِلک سے خارج کر کے خالص اللہ تعالیٰ کی مِلک کر دینا'' کہ اُس کا نفع بندگانِ خدا کو ملتا رہے، وقف کو نہ تو باطل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُسے فروخت کیا جاسکتا ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فیلزَم ولایُباعُ ولایُوھبُ ولایُورَثُ

كذا في الهداية

ترجمہ: ''پس جب (وقف) لازم ہوجاتا ہے تو اُسے نہ تو بیچا جاسکتا ہے، نہ ہبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُس میں وراثت جاری ہوتی ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:350، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔ وقف کرتے وقت وہ شے واقف کی مِلک ہے، تو وقف صحیح ہوگیا اور وقف مکمل ہونے کے بعد یہ پلاٹ واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت سے خارج ہوگیا اور واقف کو بھی اُس میں تبدیلی کی اجازت نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَا يَجُوزُ تَغْيِيرُ الْوَقْفِ عَنْ هَيْئَتِهِ، ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں''۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490)

وقف مکمل ہونے کے بعد اُسے تبدیل کرنا یا ختم کرنا جائز نہیں ہے اور شرعاً وقف میں تبدیلی کرنا حرام ہے اور تبدیلی کرنے والا سخت گناہ گار ہے۔

البتہ وقف کرنے والے کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ مصارفِ وقف کا تعیّن کرے اور اس سلسلے میں اسلامی فقہ کا مسلّمہ اصول ہے: شَرْطُ الْوَاقِفِ كَنَصِّ الشَّارِعِ، ''یعنی واقف کی مقررہ شرائط قرآن وسنت کی نَص کی طرح شرعاً مؤثر ہوتی ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص:508)

جوتے پہن کر نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال:

نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لیے صفیں بنتے وقت بعض اوقات جوتے/چپل اتارنے کی صدائیں آتی ہیں، کچھ لوگ عمل کرتے ہیں کچھ نہیں، شرعی حکم کیا ہے؟

(ارشاد صدیقی، جامع مسجد غفران، فیڈرل بی ایریا کراچی)

جواب:

نمازِ جنازہ اگر جوتا پہن کر پڑھے، تو جوتا اور اس کے نیچے کی زمین دونوں کا پاک ہونا ضروری ہے، بقدرِ مانع نجاست ہوگی تو اس کی نماز نہیں ہوگی اور جوتے پر کھڑے ہوکر نماز

پڑھی تو صرف جوتے کا پاک ہونا ضروری ہے۔اس کی علت یہ ہے کہ اصولاً جائے نماز ،یعنی جس جگہ کھڑے ہوکر نماز پڑھی جارہی ہے،اُس جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے۔لہٰذا اگر جوتا پہن کر نماز پڑھی جائے گی،تو جوتے کی حیثیت لباس جیسی ہوجائے گی اور نماز میں لباس کا پاک ہونا ضروری ہے،اس لیے جوتے کا پاک ہونا بھی ضروری ہے اور جس جگہ کھڑا ہے، اس کا پاک ہونا بھی ضروری ہے۔اگر جوتا اتار کر اُس کے اوپر کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہا ہے، تو جوتے کی حیثیت جائے نماز یعنی جائے قیام کی ہوجائے گی اور اگر وہ پاک ہے،خواہ نیچے کی زمین ناپاک بھی ہو،تو نماز ہوجائے گی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''وَلَو خَلَعَ نَعْلَيْهِ وَقَامَ عَلَيْهِمَا ، جَازَ ، سَوَاءٌ كَانَ مَايَلِي الْاَرْضَ مِنْهُ نَجِسًا اَوْ طَاهِرًا ، اِذَا كَانَ مَايَلِي الْقَدَمَ طَاهِرًا ، وَالْاٰجُرُّ اِذَا كَانَ اَحَدُ وَجْهَيْهَا نَجِسًا فَقَامَ عَلَى الْوَجْهِ الطَّاهِرِ وَصَلّٰى ، جَازَ ، مَفْرُوْشَةً كَانَتْ اَوْ مَوْضُوْعَةً ، هٰكَذَا فِيْ فَتَاوٰى ''قَاضِيْ خَان''۔

ترجمہ:''اور اگر (نمازی نے) اپنے دونوں جوتے اتارے اور اُن پر کھڑے ہوکر نماز پڑھی تو نماز جائز ہے،خواہ جوتے کا جو حصہ زمین سے ملا ہوا ہے،وہ جگہ پاک ہو یا ناپاک (ہر صورت میں نماز جائز ہے)،بشرطیکہ پاؤں سے ملی ہوئی جگہ پاک ہو(اور وہ جوتا ہے، جس پر وہ کھڑا ہے)،اور اگر اینٹ کا ایک رخ پاک ہو،لیکن نمازی اس کے دوسری جانب پاک رخ پر کھڑے ہوکر نماز پڑھے تو جائز ہے،اینٹ خواہ بچھی ہوئی ہو یا کھڑی ہو،فتاویٰ ''قاضی خان''میں اسی طرح ہے''۔(عالمگیری،ج:1،ص:62)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:''ایک جنازے کی نماز میں زید نے لوگوں کو،جنہوں نے جوتوں میں سے پیروں کو نکال کر اور جُوتے کے اوپر پَیر رکھ کر نماز پڑھنا چاہا،روکا کہ پَیر جوتوں سے مت نکالو جُوتے پہنے ہوئے نماز درست ہے۔عمرو نے ایک شخصیت کے الفاظ میں کہا کہ کوئی کہتا ہے جوتے پہنے ہوئے نماز پڑھو،جوتے سب اتار ڈالیں،چنانچہ بعض نے زید کے کہنے پر عمل کیا بعض نے عمرو کے کہنے پر۔بعد نماز بحث پیش

آئی۔ زید نے تحریری جواب میں کہ رسول خدا نے نماز میں جوتا اتارا، مقتدیوں نے بھی اتارا، پیغمبر صاحب نے دریافت کیا تم نے جوتے کیوں اتارے؟، جواب دیا کہ اتباع کیا۔ آپ نے فرمایا مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ جوتے میں ناپاکی ہے۔ پس معلوم کرلینا چاہیے، عمرو کو ایسا کہنا خلاف تھا، اس لیے کہ وہ کیسے برجستہ الفاظ صدر کہہ سکتا تھا اس لیے ناپاکی کا ثبوت نہیں رکھتا تھا، مقامی حالت، میں جہاں جوتے اتار کر نماز پڑھنے کے واسطے عمرو نے کہا تھا، یہ تھی کہ وہاں گھوڑے وغیرہ پیشاب کرتے ہیں، جوتے پہنے ہوئے جس قدر لوگ تھے اُن کے جوتے خشک تھے، پس اس حالت میں شرعاً عمرو کا کہنا صحیح سمجھا جائے گا یا زید کا؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر وہ جگہ پیشاب وغیرہ سے ناپاک تھی یا جن کے جوتوں کے تلے ناپاک تھے اور اس حالت میں جوتا پہنے ہوئے نماز پڑھی اُن کی نماز نہ ہوئی، احتیاط یہی ہے کہ جوتا اتار کر اس پر پاؤں رکھ کر نماز پڑھ لی جائے کہ زمین یا تلا ناپاک ہو تو نماز میں خلل نہ آئے۔ ردالمحتار میں ہے: قَد تُوضَعُ فِی بَعْضِ الْمَوَاضِعِ خَارِجَ الْمَسجِدِ فِی الشَّارِعِ فَیُصَلّٰی عَلَیهَا وَیَلْزَمُ مِنْهُ فَسَادُهَا مِنْ کَثِیرٍ مِنَ الْمُصَلِّینَ لِعُمُومِ النَّجَاسَةِ وَعَدمِ خَلْعِهِمْ نِعَالَهُمُ الْمُتَنَجِّسَةَ۔ ترجمہ: کبھی بعض مقامات میں بیرونِ مسجد سڑک پر جنازہ رکھ کر اس پر نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اس سے بہت سے لوگوں کی نماز کا فساد لازم آتا ہے کیونکہ وہ جگہیں نجس ہوتی ہیں اور لوگ اپنے نجاست آلودہ جوتے اتارتے نہیں''۔ (ردالمحتار، باب صلوٰۃ الجنائز)

اُسی میں ہے: فِی الْبَدَائِعِ لَوْصَلّٰی عَلٰی مُکَعَّبٍ اَعلَاهُ طَاهِرٌ وَبَاطِنُهٗ نَجَسٌ عِندَ مُحَمَّدٍ یَجُوزُ لِاَنَّهٗ صَلّٰی فِی مَوضِعٍ طَاهِرٍ کَثَوبٍ طَاهِرٍ تَحتَهٗ ثَوبٌ نَجسٌ، وَ ظَاهِرُهٗ تَرجِیحُ قَولِ مُحَمَّدٍ وَهُوَالاَشْبَهُ (ملخصاً)

ترجمہ: ''بدائع میں ہے: اگر کسی ایسے مکعب پر نماز پڑھی جس کا بالائی حصہ پاک ہے اور اندرونی حصہ ناپاک ہے تو امام محمد کے نزدیک جائز ہے، اس لیے کہ نماز پاک جگہ ادا ہوئی جیسے کوئی پاک کپڑا ہو جس کے نیچے دوسرا ناپاک کپڑا ہوا ھ۔ ظاہراً امام محمد کا قول راجح ہے اور

وہی اشبہ ہے،(ملخصاً)، (ردالمحتار،باب مفسد الصلوٰۃ ومایکرہ فیہا)''۔ زید نے بیانِ حدیث میں غلطی کی، حدیث میں تو لفظ نجاست نہیں لفظ قذر ہے یعنی گھن کی چیز، جیسے ناک کی آمیزش وغیرہ نجاست ہوتی ہے تو نماز سرے سے پڑھی جاتی کہ نماز کا ایک جز باطل ہونا ساری نماز کو باطل کردیتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد9،ص:189-188)

علامہ ابن عابدین شامی ''بدائع الصنائع'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وَعَلٰی ھٰذَا لَوصَلّٰی عَلٰی حَجَرِ الرَّحی،أَو بَابٍ، أَو بِساطٍ غَلِیظٍ،أَومکعَّبٍ أَعلَاہ طَاھِرٌ وَبَاطِنہٗ نَجَسٌ عِندَ أَبِی یُوسُفَ لَایَجُوزُ نَظراً اِلٰی اِتَّحَادِ الْمَحَلِّ،فَاستَوٰی ظَاھِرُہٗ وبَاطِنہ کَالثَّوبِ الصَّفِیق،وَعِندَ مُحَمَّدٍ یَجُوزُ،لِاَنَّہٗ صَلّٰی فِی مَوضِعٍ طاھِرٍ کَثَوبٍ طَاھِرٍ تَحتَہ ثَوبٌ نَجَسٌ بِخلَافِ الثَّوبِ الصَّفِیقِ،لأنَّ الظَّاھِرنفاذُ الرُّطُوبۃِ اِلَی الْوَجہِ الآخرِ۔

ترجمہ:''اور اسی بنیاد پر اگر اس نے چکی کے پتھر پر یا دروازے پر یا موٹی چٹائی پر یا ایسے کپڑے پر نماز پڑھی جو تہہ در تہہ مختلف کپڑوں کو جوڑ کر تیار کیا گیا (یعنی رلی) اور اس کا اوپر کا حصہ تو پاک ہے لیکن اندر کا حصہ ناپاک ہے، تو امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر نماز جائز نہیں ہے کیونکہ محل ایک ہے اور باریک کپڑے کی طرح اُس کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ اور امام محمد کے نزدیک اُس پر نماز جائز ہے کیونکہ اس نے پاک جگہ پر نماز پڑھی ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کپڑے کا ظاہری حصہ پاک ہو اور نیچے کا حصہ ناپاک ہو، البتہ باریک کپڑے کی بات الگ ہے، کیونکہ یہ بات عیاں ہے کہ اُس میں رطوبت دوسرے رُخ تک پہنچ جاتی ہے''۔ (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد رابع،ص:92، دمشق)

مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال ہوا: مسجد کے ساتھ ایک گراؤنڈ ہے، اس گراؤنڈ میں گھاس لگانے کے لیے کھاد پھیلادی گئی ہے، آیا اس گراؤنڈ میں نماز جنازہ پڑھنا جب کہ وہ گھاس سوکھی ہوئی ہو، جائز ہے یا نہیں؟۔ بعض لوگ نماز جنازہ کی ادائیگی کے وقت جوتا نہیں اتارتے اور کچھ جوتوں پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ آیا اس طرح نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔

انہوں نے اس کے جواب میں لکھا: ''نماز جنازہ کے لیے بھی طہارت اسی طرح شرط ہے، جس طرح دوسری نمازوں کے لیے۔ لہٰذا کھاد پر نماز نہیں ہوگی، ہاں اگر گھاس اتنی بڑی ہوجائے کہ اس پر پاؤں رکھنے سے پاؤں کا کوئی حصہ کھاد سے نہ ملے تو اس صورت میں نماز جائز ہوگی۔ جوتے کا تلا اگر پاک ہے، تو اسے پہن کر یا اس پر کھڑے ہوکر نماز جائز ہے اور اگر تلا ناپاک ہے، تو دونوں صورتوں میں یعنی پہن کر یا اس پر کھڑے ہوکر نماز ناجائز ہوگی''۔ (وقار الفتاویٰ، ج:2،ص:354)

ہماری ناقص رائے کے مطابق حضرت مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہاں تسامح ہوا ہے۔ جوتے کا تلا اُس صورت میں پاک ہونا ضروری ہے، جب جوتا پہن کر نماز پڑھے اور اگر جوتا اتار کر اُس پر کھڑے ہوکر نماز پڑھتا ہے اور اگر جوتا پاک ہے تو اس صورت میں نیچے کی زمین یا جوتے کا تلا ناپاک ہونے کی صورت میں بھی نماز جائز ہوجائے گی۔ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''بعض لوگ جوتا پہنے اور بہت لوگ جوتے پر کھڑے ہوکر نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں، اگر جوتا پہنے پڑھی تو جوتا اور اس کے نیچے کی زمین دونوں کا پاک ہونا ضروری ہے، بقدرِ مانع نجاست ہوگی تو اُس کی نماز نہ ہوگی اور اگر جوتے پر کھڑے ہوکر پڑھی تو جوتے کا پاک ہونا ضروری ہے''۔ اس کے نیچے محشّی لکھتے ہیں: ''امام احمد رضا علیہ رحمۃ الرحمٰن فرماتے ہیں: ''احتیاط یہی ہے کہ جوتا اتار کر اُس پر پاؤں رکھ کر نماز پڑھی جائے کہ زمین یا تلا اگر ناپاک ہو تو نماز میں خلل نہ آئے،

(فتاویٰ رضویہ، ج:9،ص:188، بہارِ شریعت، ج:1،ص:826، مطبوعہ: المدینۃ العلمیہ)

تنگ علاقوں میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:

ہماری مسجد محمد فردوس کالونی کے سامنے شارع عام ہے اور مسجد کے دوسرے دروازے کے باہر گلی نہیں ہے جس میں نمازِ جنازہ ہوسکے۔ فرض نماز کے بعد کچھ فاصلہ طے کرکے چورنگی کے دائیں یا بائیں جانب نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔ اس دوران کچھ لوگ

فرض نماز چھوڑ کر میت کے ساتھ چورنگی پر انتظار کرتے ہیں۔ اگر ہم محراب کے سامنے ایک دروازہ نکال کر اس طرح کہ میت محراب کے باہر ہو اور امام محراب میں، نمازی مسجد میں تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟، (انتظامیہ جامع مسجد محمدی، فردوس کالونی کراچی)۔

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک مسجد میں جنازہ رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا بالاتفاق مکروہ ہے، اس کی اصل یہ حدیث ہے:

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فِى الْمَسْجِدِ فَلَا شَيْئَ لَهٗ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مسجد میں (رکھی ہوئی) میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، اس کے لیے کوئی (اجر) نہیں ہے، (سنن ابوداؤد: 3187)''۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ، امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَصَلَاةُ الْجَنَازَةِ فِى الْمَسْجِدِ الَّذِى تُقَامُ فِيهِ الْجَمَاعَةُ مَكْرُوهَةٌ سواءٌ كَانَ الْمَيِّتُ وَالْقَوْمُ فِى الْمَسْجِدِ أَوْكَانَ الْمَيِّتُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ وَالْقَوْمُ فِى الْمَسْجِدِ اَوكَانَ الْاِمَامُ مَعَ بَعض القَومِ خَارِجَ الْمَسْجِدِ وَالقَوْمُ البَاقِى فِى الْمَسْجِدِ اَوِالْمَيِّتُ فِى الْمَسْجِدِ وَالْاِمَامُ وَالقَوْمُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ، هُوَالْمُخْتَارُ كَذَا فِى ''الْخُلَاصَة''۔

ترجمہ: ''ایسی مسجد، جس میں باقاعدہ باجماعت نماز ہوتی ہے، میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، خواہ میت، لوگ سب مسجد میں ہوں یا میت مسجد سے باہر ہو اور لوگ مسجد میں ہوں یا امام اور کچھ لوگ مسجد سے باہر ہوں اور دوسرے لوگ مسجد میں ہوں یا میت مسجد میں اور امام اور سب لوگ مسجد کے باہر ہوں، یہی مختار مسئلہ ہے اور ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:1 ص165)

جہاں مسجد کے باہر جنازہ کے لیے جگہ دستیاب ہو، وہاں مسجد میں نمازِ جنازہ قطعاً نہ پڑھی جائے اور جہاں جگہ دستیاب نہ ہو، جیسے گنجان آبادی والے شہروں کے اندر بعض علاقوں میں جگہ کی تنگی ہوتی ہے، وہاں میت محراب کے سامنے رکھ دی جائے اور محراب میں امام اور اُس کے ساتھ حسبِ گنجائش چند مقتدی کھڑے ہو جائیں، بقیہ مقتدی مسجد میں صفیں بنا کر نمازِ جنازہ پڑھ سکتے ہیں، کیونکہ بعض اکابر فقہائے کرام نے اس کی اجازت دی ہے۔ اگر بارش ہو رہی ہو تو اس صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَاتُکرہُ بِعذرِ المَطرِ وَنَحْوِہٖ ھٰکَذَا فِی ''اَلْکَافِی''۔ ترجمہ: ''اور بارش یا اس جیسے دیگر اَعذار کی بنا پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، فتاویٰ ''کافی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص165)

بعض تنگ شہری علاقوں میں مسجد کے باہر کھلی جگہ ہوتی ہی نہیں، جہاں نمازِ جنازہ پڑھی جا سکے، ایسی صورت میں بعض مقامات پر لوگ سڑکوں یا گلیوں کو بلاک کر کے وہاں پر جنازہ پڑھتے ہیں، جبکہ شارعِ عام اور دوسرے کی زمین پر بلااجازت جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ''تُکْرہُ فِی الشَّارِعِ وَ اَرَاضِ النَّاسِ کَذَافِی ''اَلْمُضْمَرَات''۔ ترجمہ: ''سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلااجازت ومنظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص:165)

سڑک پر چونکہ حقِ مُرور (Right of Passage) سب کا ہوتا ہے، اس لیے اسے بلاک کرنے سے سب کا عمومی حق متاثر ہوتا ہے۔ آپ نے جو صورت مسئلہ بیان کی ہے، اس کے مطابق آپ نماز جنازہ کے لیے یہ صورت اختیار کر سکتے ہیں اور اگر امام اور چند نمازیوں کے لیے مسجد سے باہر گنجائش ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

قبر کے لیے مترادف کلمات

سوال:

لفظ ''مزار، قبر، روضہ، مقبرہ، مدفن'' ان میں سے بزرگانِ دین کے لیے کون سا لفظ

استعمال کرنا درست ہے؟، (محمد صدیق مدنی، پشاور)۔

جواب:

لفظِ مَزار، ''اسمِ ظرف'' ہے، اس کے معنیٰ ہیں: زیارت کی جگہ، حدیث پاک میں قبور پر جانے کے لیے ''زِیَارَۃُ الْقُبُوْر'' اور زُوْرُوْھَا (قبرستان جایا کرو) کے کلمات آئے ہیں، ''مَزار'' (بمعنیٰ قبر) اسی سے ہے، یعنی زیارت یا حاضری کی جگہ اور چونکہ بزرگانِ دین کی قبور پر حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کے لیے مسلمان کثرت سے آتے ہیں، اس لیے وہ زیارت گاہ کہلاتی ہے۔ مدینہ منورہ میں اُحد اور دیگر مزارات پر جانے کے لیے ڈرائیور حضرات ''زیارۃ'' کی آواز لگاتے ہیں۔

قبر کے معنی دفن کرنے کا مقام، احادیث مبارکہ میں ''اِذَا قُبِرَالْمَیِّتُ'' (جب میت کو قبر میں دفن کردیا جائے) کے کلمات آئے ہیں، اسی طرح مختلف صیغوں کے ساتھ اس کے ذکر کے علاوہ قبور اور قبرستان کے لیے ''مَقْبَرَۃ اور مَقْبُرَۃ'' کے کلمات آئے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں بعض کلمات کا تلفظ غلط العام کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسے ''تَجْرُبہ'' حالانکہ صحیح تلفظ ''تَجْرِبَہ'' ہے، اسی طرح مقبرے کو فارسی میں ''قَبرِ ستان اور گورستان'' کہتے ہیں، گور کے معنیٰ قبر کے ہیں، جب کہ عوام اس کا تلفظ ''قبرُ ستان'' کرتے ہیں۔ روضہ کے معنی باغ کے ہیں اور قبر کے لیے یہ لفظ بھی حدیث میں آیا ہے: قبر جنت کا باغ ہوتی ہے (روضۃُ الْجَنَّۃ) اور یا جہنم کا گڑھا (حُفرۃُ النَّار)۔

مَقْبُرَہ اسمِ ظرف ہے اور اس کے معنی ہیں: دفن کرنے کی جگہ اور ''مَدْفَن'' کے بھی یہی معنیٰ ہیں۔ قبر اور مدفن کا لفظ عام مسلمانوں کے لیے اور مزار و روضہ بزرگانِ دین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تاہم یہ کوئی ضابطہ نہیں ہے، فقط عُرف ہے، یہ تمام الفاظ عام مسلمانوں کے لیے بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

تعزیت کی ناپسندیدہ رسوم

سوال:

ہمارے علاقے میں اور بالخصوص ہمارے گاؤں سہگل آباد، چکوال میں فوتگی کے موقع پر لوگ تعزیت کے لیے آتے ہوئے اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ میت کے گھر والے آرام کررہے ہوں گے یا ان کے کھانے کا وقت ہے، لوگ صبح کی نماز تک آتے رہتے ہیں۔ میت کے گھر والوں کو صبح کی نماز سے رات ساڑھے دس بجے تک بیٹھنا پڑتا ہے، اتنا لمبا وقت بیٹھنا اور کئی دن تک اس سلسلے کا چلتے رہنا میت کے گھر والوں کے لیے دشوار ہوجاتا ہے۔ تعزیت کا یہ سلسلہ مردوں، عورتوں دونوں میں ایک جیسا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے: کیا تعزیت کے لیے گاؤں والے مل کر اوقات مقرر کرسکتے ہیں، یہ خلافِ شریعت تو نہیں؟، اگر تحدید کردی جائے تو عوام کے لیے کیا دلائل رکھے جائیں گے، تعزیت کے لیے کون سا وقت بہتر ہوگا؟، (سلطان محمد سعید اعوان، سہگل آباد تحصیل وضلع چکوال)۔

جواب:

تعزیت مسنون ہے، حدیث پاک میں ہے:

مَا مِنْ مُؤمِنٍ یُعَزِّی أَخَاہُ بِمُصِیبَۃٍ اِلَّا کَسَاہُ اللہُ سُبْحَانَہٗ مِنْ حُلَلِ الْکَرَامَۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔

ترجمہ: ''جو بھی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی مصیبت میں تعزیت کرے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُسے کرامت کا جوڑا پہنائے گا''۔ (سُنن ابن ماجہ: 1601)

تعزیت کا وقت موت سے تین دن تک ہے اور تین دن کے بعد تعزیت کرنا مکروہ ہے، تعزیت کے لیے پہلا دن افضل وبہتر ہے۔ تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

وَبِالْجُلُوسِ لَھَا فِی غَیرِ مَسجِدٍ ثَلَاثَۃُ أَیَّامٍ، وَأَوَّلُھَا أَفضَلُ، وَتُکرَہُ بَعدَھَا اِلَّا لِغَائِبٍ۔

ترجمہ: ''تعزیت کے لیے اہلِ میت مسجد کے علاوہ کسی جگہ تین دن بیٹھیں، (تو اس میں کوئی حرج نہیں) ایامِ تعزیت میں پہلا دن افضل ہے اور تین دن کے بعد تعزیت کرنا مکروہ ہے،

لیکن ایسا شخص جو غائب ہے اور تین دن کے بعد آیا، (وہ تعزیت کرسکتا ہے)''۔

(جلد 3،ص:139، بیروت)

امام احمد رضا قادری سے سوال ہوا: ''میت کی تعزیت بعد دفن ہی چاہیے یا پیش از دفن بھی جائز ہے؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''افضل یہ ہے کہ بعد دفن قبر سے پلٹ کر ہو کَمَافِی الْجَوھَرَۃِ وَغَیرِھَا (جیسا کہ جوہرہ وغیرہا میں ہے) اور قبل دفن بھی بلا کراہت جائز ہے:

فِی صَحِیْحِ الْاِمَامِ ابنِ السَّکَنِ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: مَنْ اُوْذِنَ بِجَنَازَۃٍ فَاَتٰی اَھْلَھَا فَعَزَّاھُمْ کَتَبَ اللہُ تَعَالٰی قِیْرَاطًا، فَاِنْ تَبِعَھَا کَتَبَ اللہُ لَہٗ قِیْرَاطَیْنِ، فَاِنْ صَلّٰی عَلَیْھَا کَتَبَ اللہُ لَہٗ ثَلٰثَۃَ قَرَارِیْطَ، فَاِنْ شَھِدَ دَفْنَھَا کَتَبَ اللہُ لَہٗ اَرْبَعَۃَ قَرَارِیْطَ اَلْقِیْرَاطُ مِثْلُ اُحُدٍ۔

ترجمہ: ''صحیح امام ابن سکن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جسے کسی جنازہ کی خبر ملی اور اس نے اہلِ میت کے پاس جاکر اُن سے تعزیت کی، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک قیراط ثواب لکھ دے گا، پھر اگر جنازہ کے ساتھ گیا، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دو قیراط اجر لکھ دے گا، پھر اگر اس نے اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے تین قیراط اجر لکھ دے گا، پھر اگر وہ دفن میں بھی شریک ہوا، تو اُس کے لیے چار قیراط اجر لکھ دے گا اور ہر قیراط کوہِ اُحد کے برابر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔۔۔۔ مزید لکھتے ہیں: مَعَ ہٰذا خاص اس قصد سے یعنی تعزیت کے لیے بیٹھنا بھی اگرچہ رخصت ہے، مگر افضل نہ کرنا ہے، کَمَافِی الْھِنْدِیَۃِ مِن معراجِ الدّرایۃ عَن خزانۃِ الفَتَاویٰ: اَلْجُلُوْسُ لِلْمُصِیْبَۃِ ثلثۃَ اَیَّامٍ رُخْصَۃٌ وَتَرْکُہٗ احسنُ، (جیسا کہ ہندیہ میں معراج الدرایہ سے، اس میں خزانۃ الفتاویٰ سے منقول ہے: موت کے سبب مصیبت سے تین دن بیٹھنے کی اجازت ہے اور اس کا ترک بہتر ہے)۔ لہٰذا بہت سے علمائے متاخرین نے میت کے گھر اس ہجوم واجتماع کو پسند نہ فرمایا اور یہی مناسب جانا کہ لوگ دفن کر کے متفرق ہوجائیں، اولیائے میت اپنے کام میں مشغول ہوں اور لوگ اپنے اپنے

کاموں میں مصروف ہوں، كَمَا فِي ''مَرَاقِي الْفَلَاحِ'' لِلْعَلَّامَةِ الشُّرُنْبُلَالِي: قَالَ كَثِيرٌ مِّنْ مُتَأَخِّرِيْ اَئِمَّتِنَا رَحِمَهُمُ اللهُ تَعَالٰى يُكْرَهُ الْاِجْتِمَاعُ عِنْدَ صَاحِبِ الْمُصِيْبَةِ حَتّٰى يَأْتِيَ اِلَيْهِ مَنْ يُعَزِّىْ بَلْ اِذَا رَجَعَ النَّاسُ مِنَ الدَّفْنِ فَلْيَتَفَرَّقُوا أَوْ يَشْتَغِلُوْا بِأُمُوْرِهِمْ وَصَاحِبُ الْمَيِّتِ بِأَمْرِهٖ۔

ترجمہ: ''جیسا کہ علامہ شرنبلالی کی مراقی الفلاح میں ہے کہ ہمارے بہت سے ائمۂ متاخرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میت والے کے یہاں اس مقصد سے اجتماع کہ اس کے یہاں تعزیت کرنے والے آئیں، مکروہ ہے۔ لوگ جب دفن سے واپس ہوں تو متفرق ہوجائیں، لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول ہوں، اہلِ میت اپنے کام میں مصروف ہوں''۔

بالجملہ قولِ فیصل جس سے اختلاف زائل اور توفیق حاصل ہو یہ ہے کہ نفس تعزیت ودعاوایصالِ ثواب بیشک محمود ومندوب اور وقتِ دعاہاتھ اٹھانا بھی جائز اور اگر کوئی شخص اولیائے میت کے مکان پر جاکر تعزیت کرآئے تو بھی قطعاً روا۔ مگر اولیاء کا خاص اس قصد سے بیٹھنا اور لوگوں کا ان کے پاس ہجوم ومجمع کرنا خواہ قبلِ دفن ہو یا بعد اُسی وقت اگر ہو یا کبھی مکانِ میت پر ہو یا کہیں اور، بہرطور جائز ومباح ہے جبکہ منکراتِ شرعیہ سے خالی ہو، مگر اُس کا نہ کرنا افضل ہے، نہ یہ کہ مطلقاً حرام اور گناہ اور فاعل مبتدِع وگمراہ ٹھہرے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد9،ص:401-399)

نوٹ: قیراط سونا تولنے کا ایک وزن ہے اور قیراط کو اُحد پہاڑ کے برابر اجر بیان کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہ بے انتہا اجروثواب کا کام ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ شریعتِ مطہرہ میں تعزیت مسنون ہے، لیکن اس کی پسندیدہ اور افضل صورت یہی ہے کہ اجر کے طلب گار اور تعزیت کرنے والے لوگ جنازے اور تدفین کے تمام مراحل میں شریک ہوں اور دفنِ میت کے بعد متفرق ہوجائیں اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوں۔ اس مقصد کے لیے ہجوم واجتماع کو ائمۂ متاخرین نے ناپسند بلکہ مکروہ فرمایا ہے۔ آپ نے سوال میں تعزیت کی جو صورت بیان کی ہے، وہ میت کے اہلِ خانہ کے لیے

مشقّت کا باعث ہے۔ اگر کوئی برادری یا کمیونٹی تعزیت کے لیے انتقال کے تین دنوں کے اندر سب کی آسانی کے لیے کوئی وقت مُقرر کردیں، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ وقت کی یہ تعیین عرف اور مقامی صورتِ حال کے مطابق کی جاسکتی ہے۔ اس حوالے سے شہروں میں اموات کے لیے دعاءِ مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لیے جو سوئم کی تقریب ہوتی ہے، اس میں سہولت ہے کہ جو لوگ نمازِ جنازہ اور تدفین میں شریک نہیں ہوسکے، ان کی طرف سے تعزیت ہوجاتی ہے اور اجتماعی دعا بھی۔

ہمارے ہاں صوبۂ خیبر پختونخوا، قبائلی علاقوں اور ملک کے بعض دیگر علاقوں میں یہ رواج ہے کہ میت کے اہلِ خانہ اپنے کام کاج چھوڑ کر گھر پر بیٹھے رہتے ہیں اور مہمان آتے رہتے ہیں، دعا اور مہمان داری کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ اگر گھر والے موجود نہ ہوں یا اپنی مصروفیات میں لگ جائیں یا ڈیوٹی پر چلے جائیں، تو لوگ طعن کرتے ہیں کہ باپ یا ماں کا کفن بھی ابھی میلا نہیں ہوا اور یہ دنیاداری میں مشغول ہوگئے۔ اسی طرح انتقال کے بعد جو پہلی عید آتی ہے، اُس میں ازسرِ نو تعزیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ گھر والے تنگ بھی ہوتے ہیں اور نہ آنے والوں کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ جب معاملہ اس حد تک بڑھ جائے تو یہ باعثِ تکلیف ہے اور اس بنا پر یہ کم از کم غیر مستحسن اور خلافِ اَولیٰ ہے، ایسی رسوم کا خاتمہ ہونا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(۱) یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا ترجمہ: ''(دین میں) آسانی پیدا کرو، دشواری نہیں اور (لوگوں کو رحمتِ باری کی) بشارت سناؤ، انہیں دین سے دور نہ کرو''۔

(صحیح البخاری:69)

(۲) اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ۔ ترجمہ: ''بے شک تمہیں آسانی فراہم کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے اور تمہیں دشواری میں مبتلا کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے، (سُنن ترمذی:147)''۔ حیرت ہے کہ وہ علاقے جہاں تعزیت کی یہ ناپسندیدہ رسم جاری ہے، وہاں ایک مکتبۂ فکر کے علماء کے خطابات ودروس کا من پسند موضوع شرک وبدعت ہوتا

ہے، لیکن اس کو وہ بھی اپنا موضوعِ کلام نہیں بناتے، بلکہ وہ اپنے علاقوں میں خود اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں، بعض اوقات رسوم شریعت پر حاوی ہوجاتی ہیں اور علماء کی قوتِ مزاحمت اور جذبۂ اصلاح بھی دب جاتا ہے۔

خیبر پختونخوا میں تعزیت ودعائے مغفرت کی ایک رسم یہ بھی ہے جو روحِ دعا کے منافی ہے مثلاً اہلِ میت کے گھر میں دس افراد بیک وقت داخل ہوئے۔ ایک نے کہا: دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں، کچھ پڑھے پڑھائے یا کلماتِ دعا کہے بغیر ہاتھ چہروں پر پھیر دیے، پھر دوسرا کہے گا کہ جی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں، الغرض باری باری سب اپنی حاضری لگائیں گے، یہ محض ایک دکھاوے کا عمل ہوتا ہے۔ دعا تو اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں حضوریِ قلب کے ساتھ التجا کا نام ہے، سوال کرنے کا نام ہے، اسے محض رفعِ یدین برائے دعا کی ایک مشق (Physical Practice) بنادیا گیا ہے۔ اس سے دعا کی روح مجروح ہوتی ہے، اسے بند ہونا چاہیے۔ جب ایک مجلس دعا میں دس یا سو افراد بیٹھے ہیں اور سب نے خلوصِ نیت سے اللہ کی بارگاہ میں وفات پانے والے شخص کے لیے مغفرت کی دعا اور اُس کے پسماندگان کے لیے صبر کی دعا کرلی تو کافی ہے۔ ایک ہی مجلس میں بیٹھے ہوئے الگ الگ حاضری لگانا بے سود ہے، ریاکاری ہے اور دعا کی حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے۔

ایصالِ ثواب کی مشروعیت اور اس کا مستحسن طریقہ

اجتماعی قرآن خوانی کی شرعی حیثیت

پس منظر:

روزنامہ جنگ کے جمعہ ایڈیشن میں اقرأ صفحہ پر میں بھی ''تفہیم المسائل'' کے عنوان سے دین سے متعلق سوالات کے جوابات لکھتا ہوں اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے مہتمم مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب بھی '' آپ کے مسائل اور اُن کا حل'' کے عنوان سے سوالات کے جوابات لکھتے ہیں۔ اُنہوں نے ایک سے زائد بار ایصالِ ثواب کے لیے اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز لکھا، البتہ مکان یا دکان کے افتتاح کے موقع پر

اسے جائز لکھا۔ اس پر کئی حضرات کو تشویش ہوئی اور سوالات بھیجے، لہٰذا میں نے ''ایصالِ ثواب کی مشروعیت اور اُس کا مستحسن طریقہ'' کے عنوان سے ایک مُدلّل و مُفصّل مقالہ لکھا ہے اور اُس میں اجتماعی قرآن خوانی کی شرعی حیثیت کو بھی واضح کر دیا ہے، اُمید ہے اہلِ علم اور دینی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اِسے مفید پائیں گے۔

سوال:

ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب نے 7 اگست 2015ء کے کالم'' آپ کے مسائل اور اُن کا حل'' میں لکھا ہے: ''کسی شخص کی وفات پر ایصالِ ثواب کے لیے جو اجتماعی قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ تو بہت سے مفاسد کی بنا پر ناجائز ہے، البتہ دکان وغیرہ کے افتتاح اور نئے گھر میں منتقلی کے لیے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ جائز ہے، مگر اس میں بھی شرط ہے کہ اسے ضروری نہ سمجھا جائے اور رسم کی پابندی مقصود نہ ہو، بلکہ حصولِ برکت اور نعمتِ خداوندی کے شکریے میں کی جائے، (ہندیہ، کتاب الکراہیۃ، باب الرابع، ۳۱۷/۵، کفایت المفتی، کتاب الحظر والاباحت ۱۰۹/۹)۔ آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے کالم کے ذریعے مطلع فرمائیں تاکہ لوگوں کے ذہن میں بہت بڑا ایشو کھڑا ہو گیا ہے، دور ہو''۔

(محمد جاوید، راولپنڈی)

جواب:

''ایصالِ ثواب'' کے معنی، کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، یہ شرعاً جائز ہے بلکہ مستحسن امر ہے۔ اَموات واَحیاء یعنی زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں یا ابھی اس دنیا میں نہیں آئے، اُن سب کے لیے دعائے مغفرت اور دعائے برکات وسعادات انبیائے کرام علیہم السلام اور صالحین کی سنّت ہے۔ ایصالِ ثواب کا ایک طریقہ دعائے مغفرت ہے اور اس میں بھی کسی کے غیاب (عدم موجودگی) میں دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

اِنَّ اَسْرَعَ الدُّعَاءِ اِجَابَةً دَعْوَةُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) سب سے جلد قبولیت پانے والی دعا وہ ہے جو کوئی شخص کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے لیے کرے، (سنن ابی داؤد: 1535)۔ کیونکہ یہ سراسر اخلاص پر مبنی ہوتی ہے، سامنے کی دعا میں ریاکاری کا بھی شائبہ ہو سکتا ہے، جبکہ غائبانہ دعا میں اس کا امکان نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: پانچ قسم کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں: مظلوم کی دعا جب تک کہ وہ اپنا حق وصول کرلے، گھر پہنچنے سے پہلے تک حاجی کی دعا، مجاہد کی دعا جب تک کہ وہ جہاد میں مشغول ہے، بیمار کی دعا صحت یاب ہونے تک، کسی کے پیٹھ پیچھے اس کے لیے دعائے خیر اور سب سے زیادہ جلد مقبول ہونے والی غائبانہ دعا ہے، (مشکوٰۃ المصابیح: 2260، سنن بیہقی کے مخطوطے میں اس کی روایت بالمعنیٰ موجود ہے)۔ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے دعا ان آیاتِ مبارکہ سے ثابت ہے:

(۱) قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ: ''(ابراہیم نے) کہا: اور میری اولاد کو بھی! (امامت عطا ہو) اللہ نے فرمایا: میرا عہد (یعنی امامت کا منصب) ظالموں کو نہیں پہنچتا''۔ (بقرہ: 124)

(۲) قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

ترجمہ: کہا: اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اُس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی اور میں ایسے نیک کام کروں جن سے تو راضی ہو اور تو میری اولاد میں بھی نیکی رکھ دے، بے شک میں نے تیری طرف رجوع کیا اور بے شک میں اطاعت گزاروں میں سے ہوں''۔ (احقاف: 15)

(۳) رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما''۔ (فرقان: 74)

(۴)قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۝

ترجمہ:''حضرت موسیٰ نے التجا کی :اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی (ہارون) کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے''۔(الاعراف:151)

(۵)رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ۝

ترجمہ:''(حضرت ابراہیم نے دعا کی)اے ہمارے رب! حساب(یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا''۔(ابراہیم:41)

(۶)رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔

ترجمہ:''اے ہمارے رب: ہماری مغفرت فرما اور ہمارے اُن مومن بھائیوں کی (بھی مغفرت فرما) جو ہم سے پہلے وفات پا چکے''۔(الحشر:10)''۔اور اس کے ایک معنیٰ ہیں: ''جو ایمان لانے میں ہم سے سبقت لے گئے''۔

(۷)رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ

ترجمہ:''(حضرت نوح نے دعا کی)اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما''۔(نوح:28)

پس اہلِ ایمان کا ایک شعار اہلِ ایمان کے لیے دعائے مغفرت ہے،رسول اللہ ﷺ جب قبرستان جاتے تو یہ دعا فرماتے:''اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ، وَفِیْ رِوَایَہِ زُھَیْرٍ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللہُ لَلَاحِقُوْنَ اَسْاَلُ اللہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ۔

ترجمہ:''السلام علیکم !اے بستی والو! زہیر کی روایت میں ہے کہ (اس طرح کہے:)السلام علیکم !اے مومنین اور مسلمین کی بستی والو! ان شاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لیے معافی کا سوال کرتا ہوں''۔(صحیح مسلم:2254)

سو دعا سے دوسروں کو فیض پہنچتا ہے اگر خدانخواستہ یہ دوسروں کے لیے فائدہ مند نہ ہوتی تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ شعارِ انبیاء کرام اور صفتِ حمیدہ کے طور پر اس کا ذکر نہ فرماتا۔

ایصالِ ثواب کی دوسری صورت اعمالِ صالحہ یعنی بدنی عبادات اور مالی صدقات کا ثواب دوسروں کو پہنچانا ہے۔اس کی تعلیمات احادیث مبارکہ میں موجود ہیں:

(۱) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ضَحّٰی بِكَبْشٍ أَقْرَنَ وقَالَ: هٰذَا عَنِّیْ وَعَمَّنْ لَّمْ یُضَحِّ مِنْ اُمَّتِیْ۔

ترجمہ:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک سینگوں والے مینڈھے کی قربانی کی اور فرمایا: یہ میری طرف سے اور میری امت میں سے ہر اس شخص کی طرف سے ہے، جس نے (استطاعت نہ ہونے کی بنا پر) قربانی نہیں کی''۔(مسند احمد:11066)

(۲) عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ، أَنَّهٗ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ: اِنَّ أُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ، فَأَیُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟، قَالَ: اَلْمَاءُ، قَالَ: فَحَفَرَ بِئْرًا وَقَالَ: هٰذِهٖ لِأُمِّ سَعْدٍ۔

ترجمہ:''حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کی:''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! امِّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پاگئی ہیں تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لیے) کون سا صدقہ افضل ہے؟، آپ نے ارشاد فرمایا:''پانی''، چنانچہ انہوں نے کنواں کھدوا کر (وقف کردیا) اور کہا: یہ''اُمِّ سعد'' کا کنواں ہے (یعنی ان کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے)''۔(سنن ابی داؤد:1678)

(۳) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا: أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ أُمِّیْ اُفْتُلِتَتْ نَفْسُهَا، وَأَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ، فَهَلْ لَهَا أَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟، قَالَ: نَعَمْ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:''ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کی: میری والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا ہے، میں گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ (موت سے پہلے) بات کرپاتیں تو صدقہ کرنے کا حکم دیتیں۔ سو اب اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا اِس کا انہیں اجر ملے گا؟، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہاں! (اس کا

اجراُسے ملے گا''۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1388،الفاظ متقاربہ کے ساتھ:2760)

(۴)عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰی قَبْرَیْنِ، فَقَالَ: اِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ مِنْ كَبِيْرٍ، ثُمَّ قَالَ: بَلٰى، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ يَسْعٰى بِالنَّمِيْمَةِ، وَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهٖ، قَالَ: ثُمَّ أَخَذَ عُوْدًا رَطْبًا، فَكَسَرَهٗ بِاثْنَتَيْنِ، ثُمَّ غَرَزَ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا عَلٰى قَبْرٍ، ثُمَّ قَالَ: لَعَلَّهٗ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا دو قبروں پر گزر ہوا، (جن کو عذاب دیا جارہا تھا)، آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک ان کو عذاب دیا جا رہا ہے اور ان کو کسی بڑی چیز کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جارہا، پھر فرمایا: ہاں! ان دونوں میں سے ایک چغلی کھاتا تھا اور دوسرا پیشاب کے قطروں سے نہیں بچتا تھا، راوی بیان کرتے ہیں: پھر آپ ﷺ نے کھجور کے درخت کی ایک تر شاخ لی، اُس کے دو ٹکڑے کیے، پھر ہر ایک کی قبر پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: امید ہے کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہیں ہوں گی، ان کے عذاب میں تخفیف ہوتی رہے گی۔ (صحیح بخاری: 1378)''۔اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی احوالِ قبر سے نبی ﷺ کو مُطلع فرمایا۔

(۵)عَنْ اَبِیْ ذَرٍّعَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهٗ قَالَ:''يُصْبِحُ عَلٰى كُلِّ سُلَامٰى مِنْ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، فَكُلُّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَيُجْزِءُ مِنْ ذٰلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحٰى۔

ترجمہ:حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب کوئی صبح اٹھتا ہے تو اس کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہوتا ہے، اس کا ہر بار''سبحان اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''الحمد للہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''اللہ اکبر'' کہنا صدقہ ہے، کسی شخص کو نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے، کسی کو برائی سے روک دینا صدقہ ہے اور چاشت کی دو رکعت نماز پڑھ لینا ان سب کے لیے

کفایت کرتا ہے''۔(صحیح مسلم:1668)

(٦)عَنْ أَبِي ذَرٍّ أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ قَالُوْا لِلنَّبِيِّ ﷺ: يَارَسُوْلَ اللهِ، ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْأُجُوْرِ: يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ، وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ، وَيَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ أَمْوَالِهِمْ۔ قَالَ: أَوَ لَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللهُ لَكُمْ مَا تَصَدَّقُوْنَ؟ إِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَفِيْ بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ، أَيَأْتِيْ أَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَيَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا أَجْرٌ؟، قَالَ: ''أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ أَكَانَ عَلَيْهِ فِيْهَا وِزْرٌ؟ فَكَذٰلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ أَجْرٌ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے بعض صحابہ نے آپ سے کہا: یارسول اللہ ﷺ! مالدار لوگ تو (ڈھیروں) ثواب کما گئے، وہ ہماری طرح (فرض اور نفل) نمازیں پڑھتے ہیں، ہماری طرح روزے رکھتے ہیں اور اپنے زائد مال سے (اللہ کی راہ میں) صدقہ دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بھی صدقات کے اسباب نہیں بنائے؟ ہر بار''سبحان اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''اللہ اکبر'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''الحمدللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے۔ اور نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے، (جائز طریقے سے) ازدواجی عمل صدقہ ہے۔صحابۂ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنی نفسانی خواہش پوری کرتا ہے، کیا اس میں بھی اس کے لیے اجر ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ذرا سوچو! اگر کوئی شخص حرام طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرے، تو کیا اس پر گناہ نہیں ہوگا؟، پس اسی طرح اگر وہ جائز طریقے سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے تو اسے اجر ملے گا''۔(صحیح مسلم:2326)

(٧)عَنْ عَائِشَةَ تَقُوْلُ: إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: ''إِنَّهٗ خُلِقَ كُلُّ إِنْسَانٍ مِنْ بَنِيْ آدَمَ عَلٰى سِتِّيْنَ وَثَلَاثِمِائَةِ مَفْصِلٍ: فَمَنْ كَبَّرَ اللهَ، وَحَمِدَ اللهَ، وَهَلَّلَ اللهَ، وَسَبَّحَ اللهَ،

وَاسْتَغْفَرَ اللهَ، وَعَزَلَ حَجَرًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ، أَوْ شَوْكَةً أَوْ عَظْمًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ وَأَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ، أَوْ نَهٰى عَنْ مُنْكَرٍ، عَدَدَ تِلْكَ السِّتِّيْنَ وَالثَّلَاثِمِائَةِ السُّلَامٰى فَإِنَّهُ يَمْشِيْ يَوْمَئِذٍ وَقَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهُ عَنِ النَّارِ''۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر انسان 360 جوڑوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، پس جس شخص نے ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' کہا، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰه'' کہا، ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' کہا، ''سُبْحَانَ الله'' کہا، ''اَسْتَغْفِرُ الله'' کہا، لوگوں کے راستے سے کوئی پتھر یا کانٹا یا ہڈی ہٹائی اور نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا (اس نے یہ کام مجموعی طور پر) 360 جوڑوں کی تعداد کے برابر کیے، تو اُس دن وہ اس حال میں چل رہا ہوگا کہ اس نے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے آزاد کرلیا ہے''۔(صحیح مسلم:2327)

ان احادیث مبارکہ میں سُبْحَانَ الله، اَلْحَمْدُ لِلّٰه، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا الله کے کلمات کہنے کو صدقہ یعنی نیکی سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی طرح امر بالمعروف، نہی عن المنکر، راستے سے کسی کے لیے باعثِ تکلیف بننے والے پتھر یا کانٹے یا ناپاکی کو ہٹانے، استغفار کرنے اور رشتۂ نکاح کے بعد ازدواجی تعلق کو بھی نیکی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعائے مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوت، اذکار، درود پاک وغیرہ، اسی طرح کھانے کا وہ اہتمام ہے، جس کا اَعراس کے مواقع پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ مالی صدقات میں صدقۂ جاریہ کو ترجیح دینا افضل ہے۔ قرآن وسنت کی رو سے انسان کو اپنی آخرت کے لیے اعمالِ خیر کا ذخیرہ کرنا چاہیے۔

(۱) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝

ترجمہ:''ہر شخص ان اعمال کو جان لے گا جو اس نے (آخرت کے لیے آگے بھیجے) اور ان کو بھی جو وہ پیچھے چھوڑ آیا (یعنی ان کے نیک وبد ثمرات بعد میں مرتب ہوتے رہیں گے)''۔

(انفطار:5)

(۲) وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ

ترجمہ: ''اور ہر شخص غور کرتا رہے کہ اس نے کل (قیامت کے لیے) کیا بھیجا ہے''۔

(حشر:18)

(۳) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی نہ (کافروں کی) کسی سے دوستی ہوگی اور نہ (کفار کے لیے) شفاعت ہوگی''۔ (بقرہ:254)

(۴) وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

ترجمہ: ''اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے کچھ (ہماری راہ میں) خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے، پھر وہ کہے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ اور دنوں کی مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں صدقہ کرتا اور نیکوں میں سے ہو جاتا''۔ (منافقون:10)

رسول اللہ ﷺ نے انفاق فی الخیر میں صدقاتِ جاریہ کو ترجیح دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ اَوْ عِلْمٍ یُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْ لَهٗ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں لیکن تین عمل منقطع نہیں ہوتے، صدقہ جاریہ، علم نافع اور نیک اولاد جو اُس کے لیے دعا کرتی ہے''۔

(سُنن ابوداؤد:2877)

صدقۂ جاریہ سے مراد ایسا عملِ خیر ہے کہ جس کے اجر و فیضان کا سلسلہ متصدِّق کی موت کے

ساتھ منقطع نہ ہوجائے بلکہ اس کا فیضان تادیر جاری وساری رہے، بقول شاعر:

خیر گر چاہے، پھر فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

جیسے کسی نے مسجد بنائی یا تعمیر میں حصہ لیا یا مدرسہ بنایا یا انسانی فلاح کا کوئی کام کیا، تو جب تک وہ مسجد، مدرسہ یا کنواں وغیرہ باقی ہیں، ان کے بانی یا ان میں حصہ لینے والوں کو ثواب ملتا رہے گا۔ اسی طرح کسی دینی طالب علم، زیرِ تعلیم حافظ یا عالم کی کفالت اپنے ذمے لی تو حافظ قرآن یا عالم ومبلغ اور مُدرّس بن کر وہ دین کی خدمت کرتا رہے گا، اس شخص کو ثواب ملتا رہے گا اور اگر اس کے شاگردوں کے ذریعے دین کا کام جاری رہا تو اس کا ثواب بھی اسے ملتا رہے گا۔ اب رہا اجتماعی طور پر قرآن خوانی کا معاملہ، تو یہ شرعاً جائز ہے۔

اس حوالے سے صحیح مسلم میں باب کا عنوان ہے: بَابُ فَضْلُ الِاجْتِمَاعِ عَلٰی تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَعَلَی الذِّکْرِ (قرآن کی تلاوت اور ذکر کے لیے اجتماع کی فضیلت) اس عنوان کے تحت ایک قدرے طویل حدیث نمبر 6793 درج ہے، اس کے آخر میں لکھا ہے:

وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِی بَیْتٍ مِنْ بُیُوتِ اللهِ، یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللهِ وَیَتَدَارَسُوْنَهٗ بَیْنَهُمْ، اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْهِمُ السَّکِیْنَةُ، وَغَشِیَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِکَةُ، وَذَکَرَهُمُ اللهُ فِیمَنْ عِنْدَهٗ، وَمَنْ أَبْطَأَبِهٖ عَمَلُهٗ، لَمْ یُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔

ترجمہ: ''جب بھی کچھ لوگ اللہ کے کسی گھر (یعنی مسجد) میں جمع ہوکر کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے اور دہراتے ہیں، تو (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) اُن پر تسکین نازل ہوتی ہے اور رحمتِ باری تعالیٰ اُنہیں ڈھانپ لیتی ہے اور ملائکہ اُنہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مُقرّبین کی مجلس میں اُن کا ذکر فرماتا ہے اور جس کا عمل اُسے (خیر کو پانے کا) اہل نہ بنا سکے تو (محض) نسب (کا شرف) اُسے سرخرو نہیں کرسکتا''۔

اس کی شرح میں علامہ نووی لکھتے ہیں: ''یہ حدیث مسجد میں جمع ہوکر قرآن کی تلاوت

کرنے کی فضیلت پر دلیل ہے اور یہ ہمارا اور جمہور فقہاء امت کا مذہب ہے، اس کے بعد والی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ فضیلت مسجد تک محدود نہیں ہے، بلکہ مدرسہ، رِباط اور تمام مقامات کے لیے عام ہے، مسجد کا ذکر کثرتِ وقوع کے طور پر ہے (کیونکہ بالعموم ایسے اجتماعات مساجد میں ہوتے ہیں)''۔

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں نے نبی کریم ﷺ کے متعلق یہ گواہی دی کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''لَا یَقْعُدُ قَوْمٌ یَذْکُرُوْنَ اللهَ عَزَّوَجَلَّ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِکَةُ، وَغَشِیَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَنَزَلَتْ عَلَیْهِمُ السَّکِیْنَةُ، وَذَکَرَهُمُ اللهُ فِیْمَنْ عِنْدَهٗ۔

ترجمہ:''جو قوم بھی اللہ عزوجل کے ذکر کے لیے بیٹھتی ہے، اس کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان کو رحمت ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا اپنے فرشتوں میں ذکر کرتا ہے''۔ (صحیح مسلم:6795)

ایصالِ ثواب، حصولِ ثواب اور خیر و برکت کے لیے اجتماعی طور پر قرآن خوانی کرنا شرعاً درست ہے۔ کارِ خیر کے لیے لوگوں کو دعوت دینا باعثِ سعادت اور موجبِ خیر و برکت ہے۔ اجتماعی قرآن خوانی کے شرکاء اگر آہستہ آواز سے کہ پاس بیٹھے شخص تک اُن کی آواز نہ جائے، تلاوتِ قرآن کر رہے ہوں تو اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں ہے کہ جہری تلاوت پر استماع و انصات (سننا اور خاموش رہنا) لازم آتا ہے۔ جب قرآن مجید پڑھا جائے، تو خاموش رہنا اور توجہ سے سننا واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝

ترجمہ:''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔ (الاعراف:204)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

یُکْرَهُ لِلْقَوْمِ أَنْ یَقْرَؤُا الْقُرْآنَ جُمْلَةً لِتَضَمُّنِهَا تَرْكَ الْاِسْتِمَاعِ وَالْاِنْصَاتِ الْمَامُوْرِ بِهِمَا

كَذَا فِي الْيَنَابِيعِ۔

ترجمہ:''لوگوں کا اجتماعی طور پر (بلند آواز سے) قرآن پڑھنا مکروہ ہے، اس سے توجہ کے ساتھ سننے اور خاموش رہنے کے امر کا ترک لازم آتا ہے،''ینابیع''میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد5،ص:317)

ڈاکٹر صاحب نے اپنے موقف کے حق میں فتاویٰ عالمگیری کی مذکورہ بالا عبارت کا حوالہ دیا ہے اور ہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں، لیکن اس کی رُو سے جو انہوں نے مطلقاً اجتماعی قرآن خوانی کو بدعت قرار دیا ہے، یہ تحریفِ معنوی ہے۔ علامہ نظام الدین کراہت کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ سورۃ الاعراف:204 میں قراءت سننے والے پر استماع (توجہ سے سننے) اور اِنصات (خاموش رہنے) کو لازم قرار دیا ہے اور یہ (یعنی ایک سے زائد افراد کا بلند آواز سے تلاوت کرنا) اس میں مانع ہے۔ لیکن یہ تو اُس صورت میں ہوگا کہ عام اجتماع میں چند افراد یا سب افراد بلند آواز سے تلاوت کررہے ہوں، اس صورت کو ہم بھی منع کرتے ہیں۔ لیکن اگر سب خاموشی سے تلاوت کررہے ہوں اور ہر تلاوت کرنے والے کی آواز دوسرے فرد تک نہ پہنچے تو پھر استماع وانصات کا واجب کیسے ترک ہوجائے گا؟۔

علامہ ابن عابدین شامی''يَجِبُ الِاسْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَةِ مُطْلَقًا''کی شرح میں لکھتے ہیں:

(يَجِبُ الِاسْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَةِ مُطْلَقًا) اَیْ فِي الصَّلَاةِ وَخَارِجِهَا، لِاَنَّ الْآيَةَ وَاِنْ كَانَتْ وَارِدَةً فِي الصَّلَاةِ عَلٰى مَامَرَّ، فَالْعِبْرَةُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا لِخُصُوْصِ السَّبَبِ، ثُمَّ هٰذَا حَيْثُ لَا عُذْرَ، وَكَذَا فِي ''الْقُنْيَةِ'': صَبِيٌّ يَقْرَأُ فِي الْبَيْتِ وَاَهْلُهُ مَشْغُوْلُوْنَ بِالْعَمَلِ يَعْذِرُوْنَ فِي تَرْكِ الْاِسْتِمَاعِ، اِنِ افْتَتَحُوا الْعَمَلَ قَبْلَ الْقِرَاءَةِ وَاِلَّا فَلَا، وَكَذَا قِرَاءَةُ الْفِقْهِ عِنْدَ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ، وَفِي ''الْفَتْحِ'' عَنِ ''الخلاصة'': رَجُلٌ يَكْتُبُ الْفِقْهَ وَبِجَنْبِهِ رَجُلٌ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ فَلَا يُمْكِنُهُ اِسْتِمَاعُ الْقُرْآنِ فَالْاِثْمُ عَلَى الْقَارِي، وَعَلٰى هٰذَا لَوْ قَرَأَ عَلَى السَّطْحِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ يَأْثَمُ: أَیْ لِاَنَّهُ سَبَبٌ لِاِعْرَاضِهِمْ عَنِ اسْتِمَاعِهِ أَوْ لِاَنَّهُ يُؤْذِيْهِمْ بِاِيْقَاظِهِمْ، تَأَمَّلْ۔

ترجمہ: ’’(قرآن مجید کا سننا مطلقاً واجب ہے) یعنی نماز اور خارجِ نماز دونوں حالتوں میں (قرآن سننا واجب ہے)، یہ آیت اگرچہ نماز کے متعلق وارد ہوئی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا ہے، لیکن اعتبار خصوصیت سبب کا نہیں، عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے۔ اور یہ حکم اُس وقت ہے جب کوئی عذر نہ ہو جیسا کہ ’’قنیہ‘‘ میں مذکور ہے: ’’گھر میں بچہ قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور گھر والے کام کاج میں مصروف ہوں تو وہ نہ سننے میں معذور ہیں، بشرطیکہ انہوں نے اُس کے پڑھنے سے پہلے کام شروع کیا ہو، ورنہ وہ معذور نہیں ہوں گے۔ اور اسی طرح فقہ (کی کتاب) پڑھنے والے کے پاس قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کا حکم ہے اور ’’فتح القدیر‘‘ میں ’’خلاصۃ الفتاویٰ‘‘ کے حوالے سے منقول ہے: ایک شخص فقہی مسائل لکھ رہا ہے اور اس کے پاس کوئی شخص (بلند آواز سے) قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے لیے (اپنی علمی مصروفیت کی وجہ سے) توجہ کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کا سننا عملاً دشوار ہے، تو اس کا گناہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے پر ہوگا۔ اسی طرح اگر لوگ سوئے ہوئے ہیں اور ایک شخص چھت پر بیٹھ کر (بلند آواز سے) تلاوت کرتا ہے، تو (لوگوں کے نہ سننے کا) گناہ تلاوت کرنے والے پر ہوگا، کیونکہ لوگوں کے تلاوت قرآن کی طرف توجہ نہ کرنے کا سبب وہی شخص بن رہا ہے یا اس لیے کہ وہ انہیں جگا کر اذیت دے رہا ہے، اس مسئلے میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

اِنَّهٗ يَجِبُ عَلَى الْقَارِی اِحْتِرَامُهٗ بِأَنْ لَّا يَقْرَأَهٗ فِى الْاَسْوَاقِ وَمَوَاضِعِ الْاِشْتِغَالِ، فَاِذَا قَرَأَهٗ فِيْهَا كَانَ هُوَ الْمُضِيْعُ لِحُرْمَتِهٖ، فَيَكُوْنُ الْاِثْمُ عَلَيْهِ دُوْنَ اَهْلِ الْاِشْتِغَالِ دَفْعًا لِلْحَرَجِ۔

ترجمہ: ’’قرآن کریم پڑھنے والے پر اس کا احترام واجب ہے، وہ اس طرح کہ وہ بازاروں میں (بلند آواز سے) قرآن مجید نہ پڑھے اور اُن مقامات پر بھی قرآن کریم نہ پڑھے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں، کیونکہ جب کوئی شخص اُن مقامات پر قرآن کی (بلند آواز سے) تلاوت کرے گا، تو قرآن مجید کے احترام کو ضائع کرنے والا

وہی بنے گا اور گناہ اسی پر ہوگا نہ کہ اپنے کام کاج میں مصروف لوگوں پر، لوگوں سے حرج کو دور کرنے کے لیے (یہ مسئلے کی بہتر توجیہہ ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص:237، 238)

قرآن بھی ذکر ہے اور مجالسِ ذکر کی فضیلت کے بارے میں یہ حدیث پاک بھی ہے:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ لِلّٰہِ مَلَائِکَۃً یَطُوفُونَ فِی الطُّرُقِ یَلْتَمِسُونَ أَھْلَ الذِّکْرِ فَاِذَا وَجَدُوْا قَوْمًا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ تَنَادَوْا ھَلُمُّوا اِلَی حَاجَتِکُمْ، قَالَ: فَیَحُفُّوْنَھُم بِأَجْنِحَتِھِمْ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا، قَالَ: فَیَسْأَلُھُمْ رَبُّھُمْ وَھُوَأَعْلَمُ مِنھُمْ مَایَقُولُ عِبَادِیْ؟، قَالُوا: یَقُوْلُوْنَ: یُسَبِّحُوْنَکَ وَیُکَبِّرُوْنَکَ وَیَحْمَدُوْنَکَ وَیُمَجِّدُوْنَکَ،

ترجمہ: ''اللہ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو راستوں میں گھومتے رہتے ہیں اور ذکر کرنے والوں کو ڈھونڈتے ہیں، پس جب وہ کسی جماعت کو ذکرِ الٰہی میں مشغول پاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں: آؤ اپنی حاجت کی طرف، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر فرشتے اپنے پروں سے آسمانِ دنیا تک اُن لوگوں کا احاطہ کرلیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اُن کا رب اُن سے سوال کرتا ہے حالانکہ وہ اُن سے زیادہ اُن کے حال کو جاننے والا ہے، میرے بندے کیا کہتے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: وہ تیری پاکی بیان کررہے تھے اور تیری کبریائی کا اقرار کررہے تھے، تیری حمد بیان کررہے تھے اور تیری بزرگی بیان کررہے تھے، (یعنی وہ سبحان اللہ، اللہ اکبر، الحمدللہ، جلّ جلالہٗ پڑھ رہے تھے)''۔ طویل حدیث کے آخر میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَیَقُوْلُ: فَأُشْھِدُکُمْ أَنِّیْ قَدْ غَفَرْتُ لَھُمْ، قَالَ: یَقُوْلُ: مَلَکٌ مِنَ الْمَلَائِکَۃِ فِیھِمْ فُلَانٌ لَیْسَ مِنھُمْ اِنَّمَا جَاءَ لِحَاجَۃٍ، قَالَ: ھُمُ الْجُلَسَاءُ لَایَشْقٰی بِھِمْ جَلِیسُھُمْ۔

ترجمہ: ''پھر اللہ تعالیٰ (ملائکہ کو) ارشاد فرماتا ہے: میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اُنہیں بخش دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اُن میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے: اِن میں ایک شخص

ایسا بھی تھا جو اپنے کسی کام سے گزر رہا تھا کہ اُن کو دیکھ کر اُن کے ساتھ بیٹھ گیا (یعنی وہ مجلس ذکر میں شمولیت کے ارادے سے نہیں آیا تھا)، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: یہ (ایسی پاکیزہ) مجلس والے ہیں کہ اُن کا ہم نشین بھی بدنصیب نہیں رہتا''۔ (صحیح بخاری: 6408)

(۲) عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اِلٰى سَعْدِبْنِ مُعَاذٍ حِيْنَ تُوُفِّيَ، فَلَمَّا صَلّٰى عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَوُضِعَ فِي قَبْرِهٖ سُوِّيَ عَلَيْهِ، سَبَّحَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، فَسَبَّحْنَا طَوِيْلًا، ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا، فَقِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ كَبَّرْتَ؟، قَالَ: لَقَدْ تَضَايَقَ عَلٰى هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ، حَتّٰى فَرَّجَهُ اللهُ عَنْهُ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گئے، رسول اللہ ﷺ نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور جب اُن کی تدفین ہو چکی تو رسول اللہ ﷺ نے سبحان اللہ کہا، پس ہم سب نے بھی دیر تک سبحان اللہ کہا، پھر آپ نے اللہ اکبر کہا، ہم نے بھی اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! آپ نے (ان کی قبر پر) تسبیح و تکبیر کیوں پڑھی؟، آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اس نیک بندے پر اس کی قبر تنگ ہو رہی تھی، یہاں تک کہ (ہماری تسبیحات کی برکت سے) اللہ تعالیٰ نے اُس کی قبر کو کشادہ کر دیا''۔ (مسند امام احمد: 14885، جلد: 3)

(۳) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِي مَسْجِدِهٖ فَقَالَ: كِلَاهُمَا عَلَى الْخَيْرِ، وَأَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ، أَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَدْعُوْنَ اللهَ وَيَرْغَبُوْنَ اِلَيْهِ، فَاِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ، وَأَمَّا هٰؤُلَآءِ فَيَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ أَوِ الْعِلْمَ وَيُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ، فَهُمْ أَفْضَلُ، وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا، ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا گزر مسجدِ نبوی میں دو مجلسوں پر ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دونوں بھلائی پر ہیں، مگر ایک مجلس دوسری سے بہتر ہے، (مجلسِ ذاکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:) یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے دعا و التجا کر رہے ہیں (یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے) اگر چاہے، تو ان کی حاجت پوری فرما دے اور

چاہے تو اُنہیں محروم رکھے۔ اور (دوسری مجلس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:) یہ لوگ فقہ اور علم سیکھ رہے ہیں اور نہ جاننے والوں کو بھی سکھا رہے ہیں، پس (دونوں میں سے) یہ افضل ہیں اور مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے، پھر آپ ﷺ اُسی مجلس (تعلیم و تعلّم) میں تشریف فرما ہوئے''۔ (سنن دارمی: 353)

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجلسِ ذکر کو بھی خیر سے تعبیر فرمایا اور مجلسِ تعلیم و تعلّم کو افضل قرار دے کر اُن کے ساتھ بیٹھ گئے اور ترجیح کا سبب بھی بتادیا۔

سیرۃ النبی ﷺ کے اجتماعات، تبلیغی اجتماعات، دروسِ قرآن و ختمِ قرآن، افتتاحِ بخاری اور ختمِ بخاری کے اجتماعات تمام مکاتبِ فکر کے لوگ باقاعدہ دعوت دے کر منعقد کرتے ہیں، ان کے لیے اشتہارات چھاپے جاتے ہیں اور اخبارات میں اعلانات شائع ہوتے ہیں، آج کل بعض لوگ ان اجتماعات کی تشہیر کے لیے ایس ایم ایس یا ٹیکسٹ میسیج کا میڈیم بھی استعمال کرتے ہیں اور آج تک ان سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ پس میلاد النبی ﷺ اور اعراس و ایصالِ ثواب کے لیے ختمِ قرآن مجید کی مجالس و تقریبات اسی قبیل سے ہیں اور جائز ہیں۔ ان امورِ خیر کے لیے دن، مقام اور وقت کا تعین سہولت کی غرض سے ہوتا ہے، یہ تعیین عُرفی ہے، شرعی نہیں ہے۔ شرعی تعیین سے مراد یہ ہے کہ کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ کسی خاص وقت یا مقام یا دن اور تاریخ کو یہ کام کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے اور اس سے قبل یا بعد یا دوسرے وقت اور مقام پر ایسا کرنا اجر کا سبب نہیں ہے۔ یہ تعینِ شرعی ہے اور ایسی تعیین صرف شارع علیہ السلام کا اختیار ہے جیسے وقوفِ عرفہ کے لیے 9 رذوالحجہ، ایامِ نحر یا ایامِ عید وغیرہ، سہولت کے لیے دینی اجتماعات منعقد ہو سکتے ہیں خواہ یہ مجالس تبلیغ کے لیے ہوں یا ایصالِ ثواب کے لیے۔

حدیثِ مبارک میں ہے:

(۱) كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْأَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا

ترجمہ: ''نبی ﷺ وعظ و نصیحت (کے ایام یا اوقات مقرر کرنے) میں ہمارا خیال رکھا

کرتے تھے تاکہ ہمارے لیے تنگی نہ ہو''۔ (صحیح بخاری:68)

یعنی آپ ﷺ صحابۂ کرام کی آسانی کا خیال رکھا کرتے تھے اور آج کل بھی مجالس خیر کے لیے دن تاریخ اور وقت کا تعین لوگوں کی آسانی کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ پہلے سے لوگوں کے علم میں ہو اور وہ اپنے معمولات میں اس کے لیے گنجائش نکال سکیں۔

(۲) عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ: كَانَ عَبْدُاللهِ يُذَكِّرُالنَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيْسٍ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَاأَبَاعَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ؟،قَالَ: أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِن ذٰلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ،وَإِنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا۔

ترجمہ: ''حضرت ابووائل کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات لوگوں کو وعظ فرمایا کرتے تھے تو ایک شخص نے ان سے عرض کی: اے ابوعبدالرحمٰن! میری خواہش ہے کہ آپ ہمیں روزانہ وعظ فرماتے، انہوں نے جواب دیا: میرے لیے تمہاری اس خواہش کی تعمیل میں یہ امر مانع ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ (روزانہ مجالسِ وعظ منعقد کرکے) تمہارے لیے تنگی اور طبیعت کے اچاٹ ہونے کا سبب بنوں۔ میں وعظ ونصیحت کے معاملے میں تمہاری سہولت کا اسی طرح خیال رکھتا ہوں، جس طرح نبی کریم ﷺ ہمارا خیال رکھا کرتے تھے، تاکہ ہمارے لیے تنگی کا باعث نہ بنے''۔ (صحیح بخاری:70)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وعظ ودرس کے لیے دن مقرر کیا جاسکتا ہے تاکہ عوام کو شرکت میں سہولت رہے۔ یہی حکمت قرآن خوانی سمیت مجالس ایصالِ ثواب میں کارفرما ہوتی ہے۔

شیخ ابن تیمیہ دمشقی سے گھر والوں کے قرآن مجید پڑھنے اور تسبیح، تحمید اور تکبیر وتہلیل کا ثواب میت کو پہنچانے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا: ''جب گھر والے قرآن مجید پڑھ کر اور تسبیح وتہلیل اور تمام اذکار کرکے اُن کا ثواب میت کو پہنچائیں تو اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے''۔ (مجموعۃ الفتاویٰ، جلد 24، ص:180، مطبوعہ: دارالجیل)

شیخ ابن تیمیہ دمشقی سے پوچھا گیا کہ کوئی شخص ستر ہزار مرتبہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچائے تو اس کا ثواب میت کو پہنچے گا اور کیا یہ میت کے لیے دوزخ سے براءت کا ذریعہ ہوگا؟۔ انہوں نے جواب دیا: ''جب کوئی انسان اس طرح ستر ہزار مرتبہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' پڑھ کر یا اس سے کم یا زیادہ پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچائے تو اللہ تعالیٰ میت کو اُس کا نفع اور فائدہ پہنچائے گا''۔

(مجموعۃ الفتاویٰ، جلد 24، ص:180، مطبوعہ: دارالجیل)

نیز شیخ ابن تیمیہ سے سوال کیا گیا: کبار ائمۂ دین اور فقہاء کرام میت کے لیے قرآن پڑھنے اور اس پر اجرت لینے اور مستحقین کے لیے اہلِ میت کا کھانا کھانا جائز ہے یا نہیں؟۔ انہوں نے جواب میں لکھا: ''الحمدللہ رب العالمین! مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنے کا ثواب میت کو پہنچتا ہے، اس سلسلے میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیثِ صحیحہ ہیں، جیسا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میری والدہ انتقال فرما گئیں اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ کلام کرتیں تو صدقہ کا کہتیں۔ کیا میری طرف سے اُن کے لیے صدقہ کرنا اُن کے لیے نفع کا باعث ہوگا؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ اِسی طرح ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میت کی طرف سے حج، قربانی اور غلام آزاد کرنے کا اُس کے لیے استغفار کرنے کا ثواب بھی اسے پہنچتا ہے۔ میت کی طرف سے نفل نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور قرآن مجید پڑھنے کے سلسلے میں علماء کے دو قول ہیں: (۱) امام احمد بن حنبل اور امام ابوحنیفہ وغیرہم اور بعض شوافع کا مذہب یہ ہے کہ ان کا فائدہ میت کو پہنچتا ہے۔ (۲) امام مالک اور امام شافعی کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اس کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا۔ رہا تلاوتِ قرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ تو اس میں ایک قول یہ ہے کہ دنیاوی مال کے عوض جو تلاوت کی گئی ہے، وہ مقبول نہیں، اس کا ثواب بھی نہیں ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ فقیر اور تنگدست کا تلاوتِ قرآن پر اجرت لینا جائز ہے اور غنی اور خوشحال کا اجرت لینا جائز نہیں ہے اور یہی بات امام احمد کے مذہب کے موافق ہے، کیونکہ اس نے

اجرت اپنی ضرورت کی بنا پر لی اور اُس کے ذریعے وہ اللہ کی اطاعت پر مدد حاصل کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی نیت پر اجر دے گا۔ پس اس نے طیب چیز کو کھایا اور نیک عمل کیا اور جب کوئی شخص مال کو مستحق پر خرچ کرے، تو اس صدقہ کا ثواب اس میت کو مل جائے گا۔ اگر اس کا مقصود اس سے قرآن کے پڑھنے پر اور اس کی تعلیم پر اعانت کرنا ہو تو یہ افضل اور اَحسن ہے کیونکہ مسلمانوں کی جان و مال سے قرآن مجید کے پڑھنے اس کے تعلیم دینے پر معاونت کرنا افضل ترین اعمال میں سے ہے''۔

(مجموعۃ الفتاویٰ، جلد 24، ص:176-175، مطبوعہ: دارالجیل)

ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب نے کفایت المفتی کا حوالہ دیا ہے، اس میں مجالس الابرار کے حوالے سے جو حدیث نقل کی ہے وہ بنیادی طور پر مجالسِ ذکر کے بارے میں ہے، اجتماعی قرآن خوانی کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ حدیث مصنّف عبدالرزاق میں موجود ہے اور اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کوفہ کی ایک مسجد میں دو حلقے دیکھے، آپ نے ان سے پوچھا تم میں سے کون سے حلقے والے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ نے دوسرے حلقے والوں سے فرمایا: تم ان لوگوں کے ساتھ مل جاؤ، پس آپ نے ان کی ایک جماعت بنالی، (المصنف :5425)۔ بعض محدثین نے ممانعت کی روایات کو نمازِ جمعہ سے پہلے حلقہ بنانے پر محمول کیا ہے، (صحیح ابن خزیمہ: 1816)۔ سنن ابوداؤد میں بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازِ جمعہ سے پہلے حلقہ بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا''۔ (سنن ابوداؤد:1079)

آج بھی علمائے دیوبند میں اجتماعی طور پر سِرّی اور جہری ذکر کرانے کی مثالیں موجود ہیں، سِرّی ذکر تو متعدد علماء کراتے ہیں اور کربوغہ شریف کے شیخ مفتی سید مختار الدین شاہ سلسلۂ چشتیہ کے مطابق اجتماعی طور پر جہری ذکر بھی کراتے ہیں، جبکہ خیر المدارس ملتان کے شیخ الحدیث مولانا محمد صدیق نے اجتماعی ذکر کی سِرّی و جہری دونوں صورتوں کو بدعت لکھا ہے، سو ہر ایک کا اپنا اپنا اجتہاد ہے۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے فضائلِ ذکر میں ذکر

بالجہر کو مستحسن لکھا ہے۔

بعض حضرات نے مسائلِ شرعیہ کی تعبیر وتشریح پر اپنی خودساختہ اجارہ داری قائم کررکھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز کہہ دیتے ہیں اور اجتماعی ذکر کو جائز بلکہ مستحسن قرار دیتے ہیں، شاعر نے درست کہا ہے:

تمہاری زلف میں پہنچی تو حُسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب اپنے اِسی فتوے میں لکھتے ہیں: ''کسی شخص کی وفات پر ایصالِ ثواب کے لیے جو اجتماعی قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ تو بہت سے مفاسد کی بنا پر ناجائز ہے''۔ اِس عبارت سے مُتصل ہی فوراً بعد لکھتے ہیں: ''البتہ دکان وغیرہ کے افتتاح اور نئے گھر میں منتقلی کے لیے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ جائز ہے، مگر اس میں بھی شرط ہے کہ اسے ضروری نہ سمجھا جائے اور رسم کی پابندی مقصود نہ ہو، بلکہ حصولِ برکت اور نعمتِ خداوندی کے شکریے میں کی جائے''۔

(ہندیہ، کتاب الکراہیۃ، باب الرابع، ۵/۳۱۷، کفایت المفتی، کتاب الحظر والاباحت ۹/۱۰۹)

یہ تقسیم موصوف کی اپنی اختراع ہے، منشائے شریعت ہرگز نہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ ایک طرف ایصالِ ثواب کے لیے اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور دوسری جانب دکان کے افتتاح اور نئے گھر میں منتقلی کے موقع پر کی جانے والی اسی اجتماعی قرآن خوانی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ دلیل کے طور پر جو حوالہ پیش کیا ہے، اُس کے اطلاق میں ایک صورت (یعنی ایصالِ ثواب کے لیے کی جانے والی قرآن خوانی) عدمِ جواز کی اور دوسری صورت (یعنی دکان کے افتتاح اور نئے گھر میں منتقلی) جواز کی بتائی گئی ہے، مقامِ حیرت یہ ہے کہ اس تقسیم پر کوئی دلیل نہیں دی گئی کہ آیا یہ موصوف کی ذہنی اختراع ہے یا اس کی کوئی فقہی اساس ہے، کیونکہ اصولی طور پر تو اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز قرار دیا ہے۔ ہم اس پر گزشتہ سطور میں کلام کرچکے ہیں۔

تاہم یہ ضروری ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی میں آداب کو ملحوظ رکھا جائے۔ ہمارے ہاں کی مُروجہ قرآن خوانی میں چند اُمور اصلاح طلب ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ جلدی جلدی پارہ یا قرآن مجید ختم کرنے کی غرض سے صحت تلفظ اور صحت ادا کا خیال نہیں رکھا جاتا، یہ درست نہیں ہے، خلافِ ادب ہے اور بعض صورتوں میں گناہ کا سبب بن سکتا ہے۔ بعض اوقات جلدی ختم کرنے کے لیے ایک صفحہ ایک صاحب پڑھتے ہیں اور دوسرا صفحہ دوسرے صاحب، خواہ آیت مکمل ہو یا نہ ہو، معنوی ربط رہے یا نہ رہے، یہ بھی درست نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ایک صاحب نے اپنی سہولت اور دلی رغبت سے ایک پارہ یا دو پارے یا جتنا بھی چاہا پڑھ لیا۔ اب تقریب کے منتظمین اصرار کریں گے کہ ایک پارہ اور پڑھ لیجیے۔ اس صورت میں وہ کبیدہ خاطر ہوکر بیٹھ جاتا ہے اور مارے باندھے پڑھتا رہتا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ صرف اس تلاوت پر اجر کامل وتمام ملتا ہے جو پوری دلی رضا اور رغبت سے کی جائے اور طبیعت پر بار بالکل نہ ہو، حدیثِ پاک میں دعا کی عدمِ قبولیت کا ایک سبب استحسار یعنی اکتا کر چھوڑ دینا یا بے دلی سے دعا کرنا، اُس کے لیے فرمایا گیا: اللہ تعالیٰ غافل اور بے توجہ دل کی دعا قبول نہیں فرماتا۔

۳۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ قرآن مجید کو لازماً ایک مجلس میں ختم کیا جائے ورنہ ''ختمِ قرآن'' نہیں کہلائے گا، جتنا بھی دلی رغبت، حضوریٔ قلب اور خوش دلی سے پڑھ لیا جائے، دعا کرکے ایصالِ ثواب کرسکتے ہیں۔ قرآن خوانی کی بعض مجالس میں باقاعدہ فہرست پڑھ کر سنائی جاتی ہے کہ اتنی بار ختمِ قرآن، اتنی بار آیتِ کریمہ یا کلمہ شریف یا اتنی بار درود شریف وغیرہ پڑھا گیا، یہ کہنا ضروری نہیں ہے۔ بس دعا میں اتنا کہنا کافی ہے: یااللہ! جس جس نے جہاں جہاں ایصالِ ثواب کی نیت سے جس قدر پڑھا ہے اور دیگر صورتوں میں ایصالِ ثواب کا جو بھی اہتمام کیا ہے، اُن سب حسنات وصالحات کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما اور اس کا اجر مرحوم کو عطا فرما، ایک سے زائد افراد بلکہ جمیع مومنین ومومنات کے لیے بھی ایصالِ

ثواب کر سکتے ہیں، بلکہ یہ صورت پسندیدہ ہے۔

۴۔بعض مقامات پر ایصالِ ثواب کی فاتحہ کے موقع پر انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات، پھل، کپڑے وغیرہ سب چیزیں سامنے رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے، ایسا کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں ریا کا عنصر بھی شامل ہوسکتا ہے۔ سامنے رکھنا شریعت میں اصولی اعتبار سے منع بھی نہیں ہے اور ایسا کرنے پر اصرار بھی درست نہیں ہے۔ ایصالِ ثواب کی اشیاء کو سامنے رکھے بغیر فاتحہ وایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے اور کھانے کے بعد بھی فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے، امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''وقتِ فاتحہ کھانا سامنے رکھنے کی ممانعت نہیں، مگر اُسے ضروری جاننا یا یہ سمجھنا کہ بے اس کے فاتحہ نہیں ہوسکتی، یا ثواب کم ملے گا، غلط وباطل خیال ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:598)

۵۔اسی طرح بعض اوقات جون تا اگست ملک کے بیشتر حصوں میں گرمی، حبس اور برسات کا موسم ہوتا ہے اور مکھیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے انواع واقسام کے کھانے سامنے رکھے ہوتے ہیں اور مکھیاں بھنک رہی ہوتی ہیں۔ جدید دور کے لوگوں کو ایسے مناظر سے کراہیت محسوس ہوتی ہے اور دیندار لوگوں کے بارے میں طبیعت میں ناگواری پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب وہ لوگ بن رہے ہوتے ہیں جو شریعت کی نظر میں محض ایک مباح امر کو ضروری سمجھ کر کر رہے ہوتے ہیں۔

۶۔بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی صاحب فاتحہ کے لیے رکھے گئے ماکولات ومشروبات کو کپڑے یا اخبار سے ڈھانپ دیں تو کوئی دوسرا شخص شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ فاتحہ اس کھانے تک نہیں پہنچے گی، اس کپڑے یا اخبار کو اٹھا دیتے ہیں۔

دین میں حکمت کی بڑی اہمیت ہے، دین کی عظیم تر حکمت کے تحت بعض اوقات پسندیدہ کام کو بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔ رسول پاک ﷺ نے بھی اسی دینی حکمت کے تحت اپنے بعض پسندیدہ امور کو ترک فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ بنائے قریش پر بنی ہوئی ''کعبۃ اللہ'' کی عمارت کو شہید کردیں اور پھر اس میں ''حطیم'' کو

شامل کر کے بنائے ابراہیم علیہ السلام پر تعمیر کریں، اسلام کو حجاز میں غلبہ حاصل ہو چکا تھا اور آپ کے پاس مالی وسائل بھی تھے۔لیکن آپ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ وَلَجَعَلْتُهَا عَلٰى أَسَاسِ إِبْرَاهِيمَ فَإِنَّ قُرَيْشًا حِينَ بَنَتِ الْبَيْتَ اِسْتَقْصَرَتْ وَلَجَعَلْتُ لَهَا خَلْفًا۔

ترجمہ:''اگر تمہاری قوم نے نیا نیا کفر نہ چھوڑا ہوتا تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم کر دیتا اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر قائم کرتا، کیونکہ جب قریش نے اس کو بنایا تھا تو (وسائل کی کمی کے سبب ایک جانب سے) اس کو چھوٹا کر دیا تھا اور میں اس کی پچھلی جانب بھی ایک دروازہ بناتا''۔(صحیح مسلم، رقم الحدیث:3227)

متفرقات

کثرتِ استغفار کی برکات اور حکمتیں

سوال:

میں نے کچھ عرصہ قبل ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ انسان اپنے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی اللہ کی بارگاہ میں سچے دل سے معافی مانگتا ہے تو اللہ وہ گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بار بار ان گناہوں کی معافی مانگنا اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے، کیا اس سے اللہ ناراض ہو جاتا ہے؟

(رمشا عمر خان، کراچی)

جواب:

بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے اور جب بندہ صدقِ دل سے اُس کے حضور توبہ کرے تو وہ معاف فرما دیتا ہے۔ لیکن استغفار کی کثرت رب کی ناراضی کا سبب بنے! ایسا ہرگز نہیں، بلکہ قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ میں توبہ و استغفار کی کثرت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کی کئی حکمتیں احادیثِ مبارکہ سے مستفاد ہوتی ہیں۔ استغفار کی کثرت نعمتوں کی فراوانی کا سبب بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (حضرت نوح نے جب اپنی قوم سے کہا):

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۖ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾

ترجمہ: ''تم اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بہت معاف فرمانے والا ہے۔ وہ تم پر موسلا دھار بارش نازل فرمائے گا اور مالوں اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے لیے باغات اگائے گا اور تمہارے لیے دریا بہائے گا''۔ (نوح:12-10)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ

ترجمہ: ''بے شک اللہ کثرت سے توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔ (بقرہ:222)

(۳) وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ

لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۝۱۳۳

ترجمہ:اور اپنے رب کی بخشش اور اس کی جنت کی طرف جلدی کرو،جس کا عرض تمام آسمان اور زمینیں ہیں جو مُتقین کے لیے تیار کی گئی ہے''۔(آل عمران:133)

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱)عَنۡ أَبِی هُرَیۡرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: لَلّٰهُ أَفۡرَحُ بِتَوۡبَةِ أَحَدِكُمۡ مِنۡ أَحَدِكُمۡ بِضَالَّتِهٖ إِذَا وَجَدَهَا۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:تم میں سے کسی شخص کو اپنی گمشدہ سواری کے مل جانے سے جتنی خوشی ہوتی ہے،اللہ کو تمہاری توبہ سے اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے،(سُنن ترمذی:3538)''۔اس سے معلوم ہوا کہ استغفار رضائے الٰہی کا سبب ہے۔

(۲)حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:اللہ سے بہت زیادہ استغفار کیا کرو کیونکہ اللہ نے تم کو استغفار کی اسی لیے تعلیم دی ہے کہ وہ تم کو بخشنا چاہتا ہے''۔(الدر المنثور،جلد8،ص:269)

(۳)حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کا صحیفۂ اعمال اس کو خوش کرے،وہ بہت زیادہ استغفار کرے،(المعجم الاوسط:843)''۔اس سے معلوم ہوا کہ استغفار آخرت میں نجات کا سبب ہے۔

(۴)عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنۡ لَزِمَ الۡاِسۡتِغۡفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنۡ كُلِّ ضِيۡقٍ مَخۡرَجًا، وَمِنۡ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا، وَرَزَقَهٗ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جس شخص نے استغفار کو لازم کرلیا،اللہ تعالیٰ اس کی ہر پریشانی کو حل کردے گا،ہر تنگی میں اس کے لیے فراخی کردے گا اور جہاں اس کا گمان بھی نہ ہوگا،اس کو وہاں سے رزق عطا فرمائے گا''۔(سُنن ابوداؤد:1515)

اِس حدیثِ پاک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استغفار مشکلات میں آسانی، غموں سے نجات اور رزق کی کشادگی کا سبب ہے۔

(۵)عَن أَبِي هُرَيرَةَ سَمِعتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: وَاللهِ اِنِّي لَأَستَغفِرُ اللهَ وَأَتُوبُ اِلَيهِ فِي اليَومِ أَكثَرَ مِن سَبعِينَ مَرَّةً۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ کی قسم! بے شک میں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں اور اُس کی طرف توبہ کرتا ہوں، (صحیح بخاری: 6307)''۔اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ استغفار بلندیِ درجات کا سبب ہے۔

(۶)عَن عَائِشَةَ أَنَّ نَبِيَّ اللهِ ﷺ كَانَ يَقُومُ مِنَ اللَّيلِ حَتّٰى تَتَفَطَّرَ قَدَمَاهُ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ:لِمَ تَصنَعُ هٰذَا يَا رَسُولَ اللهِ وَقَد غَفَرَ اللهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟، قَالَ: أَفَلَا أُحِبُّ أَن أَكُونَ عَبدًا شَكُورًا۔ فَلَمَّا كَثُرَ لَحمُهُ صَلّٰى جَالِسًا، فَاِذَا أَرَادَ أَن يَركَعَ قَامَ، فَقَرَأَ، ثُمَّ رَكَعَ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ راتوں کو (اتنا طویل) قیام فرماتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں (مبارک) پھٹ گئے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مغفرت کی قطعی اور کلی سند عطا فرمادی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا زیادہ شکر کرنے والا بندہ بنوں، پھر جب رسول اللہ ﷺ کا جسم ذرا فربہ ہوگیا تو پھر آپ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے، لیکن جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے تو کھڑے ہوکر (کچھ دیر) قراءت کرتے، پھر رکوع کرتے''۔(صحیح بخاری:4837)

اس حدیث پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) عبادت سے مقصود بلندیِ درجات بھی ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر تشکّر کا بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ شکر کامل یہ ہے کہ بندہ زبان، اعضاء اور قلب سے شکر ادا کرے یعنی مجسّم

تَشکُّر بن جائے اور شکر کی ساری صورتیں نماز میں جمع ہوتی ہیں۔

(۶) یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو قیام کی حالت سے رکوع وسجود میں جانا پسند تھا۔

(۷) عَنِ الْأَغَرِّ الْمُزَنِيِّ، وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي، وَإِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ، فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ۔

ترجمہ:''صحابیِ رسول حضرت اَغَرِّ مُزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے دل پر حجاب چھا جاتا ہے اور میں ایک دن میں اللہ تعالیٰ سے سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، (صحیح مسلم:2702)''۔حضرت سید علی ہجویری نے لکھا ہے: ''رَین'' قلب پر اس میل یا دھبے کو کہتے ہیں، جو معصیتوں کی پاداش میں مستقل طور پر چھا جاتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

ترجمہ:''ہرگز نہیں، بلکہ ان کے برے کاموں نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے، (المطفّفین:14)''۔اور ''غین'' اسے کہتے ہیں جو عارضی طور پر چھا جاتا ہے اور استغفار سے رفع ہو جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کے قلب پر ''غین'' یا حجاب کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُمّت کی اصلاح کے کاموں میں مشغولیت کے سبب جب آپ کی توجہ حضوریِ بارگاہِ رب العالمین کی طرف کم ہوتی، تو پھر استغفار فرماتے، یعنی آپ کی یہ کیفیت فی نفسہٖ کسی بھی درجے میں خطا نہیں تھی، کیونکہ نبوت کے کاموں میں مشغول رہنا، امت کے احوال کی اصلاح پر توجہ دینا اور امت کی مشکلات کا حل نکالنا، یہ سب بحیثیتِ نبی آپ کا فریضہ تھا اور اس پر آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجرِ عظیم کے حق دار تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف معمولی سی بے توجہی کو اس کے حضور اپنے مقامِ رفیع وارفع کے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے، اس لیے اس پر استغفار فرماتے۔

گم شدہ گائے کا حکم

سوال:

عیدالاضحیٰ سے دو دن قبل ہمارے محلے میں ایک گائے آئی (جس کے بارے میں

غالب گمان یہ ہے کہ یہ کسی کی قربانی کا جانور ہے جو بھاگ کر آیا ہے)۔ محلے کی مسجد انتظامیہ نے مسجد کے سامنے باندھ دیا تاکہ گائے کا مالک آکر لے جائے ،کافی تلاش کے بعد بھی کوئی نہ آیا اور مسجد انتظامیہ کے لیے اُس کی دیکھ بھال دشوار ہوئی تو ایک صاحب کچھ دن کے لیے اپنے گھر لے گئے ،دوتین روز بعد اُن کے لیے سنبھالنا مشکل ہوگیا اور گائے کھول کر چھوڑ دی ،پھر ایک دوسرے شخص نے تین دن گائے کی دیکھ بھال کی ۔اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے؟ ،(سید وسیم شاہ ،ایبٹ آباد)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر اُس جانور کی دیکھ بھال لوگوں کے لیے واقعی دشوار ہے،تو اُس جانور کو دو عادل گواہوں کی موجودگی میں مناسب بازاری قیمت پر فروخت کر کے وہ رقم کسی ذمے دار اور امانت دار شخص کے پاس رکھ دیں ،ایک سال تک اُس کے مالک کا انتظار کیا جائے ،اگر اِس دوران وہ آجائے اور شواہد سے ثابت ہوجائے کہ وہی اِس کا مالک ہے،تو رقم اُس کے حوالے کردی جائے ۔حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ، وَسُئِلَ عَنِ اللُّقْطَةِ؟ ،فَقَالَ: لَا تَحِلُّ اللُّقْطَةُ، مَنِ الْتَقَطَ شَيْئًا فَلْيُعَرِّفْهُ سَنَةً،فَإِنْ جَاءَهُ صَاحِبُهَا فَلْيَرُدَّهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ لَمْ يَأْتِ صَاحِبُهَا فَلْيَتَصَدَّقْ بِهَا۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے لُقطہ (گری پڑی چیزوں) کے بارے میں سوال ہوا،آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لُقطہ حلال نہیں ہے،جو شخص پڑا ہوا مال اٹھائے ،اُس کی ایک سال تک تشہیر کرے ،اگر مالک آجائے تو اُسے دے دے اور نہ آئے تو صدقہ کردے''۔(سنن دار قطنی:4309)

اگر اُس شخص یا اُس کے کسی شرعی وارث کا کسی بھی طریقے سے پتا نہ چل سکے،تو وہ رقم اُس کی طرف سے صدقہ کردیں،جس کا ثبوت آپ کے پاس موجود ومحفوظ رہنا چاہیے ۔اگر بالفرض بعد میں وہ کبھی آجائے اور اس تصدق سے مطمئن ہو تو آپ اپنی ذمے داری سے

عہدہ برا ہوجائیں گے، ورنہ آپ لوگوں کو اس کی رقم ادا کرنی ہوگی اور اس تصدُّق کا آپ سب کو اجر ملے گا۔

اگر وہ کسی شخص کی قربانی کا جانور تھا، تو اب قربانی کا وقت گزر جانے کے بعد اُس شخص پر بھی اُس جانور کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''بدائع الصنائع'' میں ہے: جو بکری قربانی کے لیے خریدی گئی ہو اور ایامِ قربانی میں اُس کی قربانی نہ کی ہو اور قربانی کے دن گزر گئے، تو وہ شخص غنی ہے یا فقیر اُس جانور کو زندہ صدقہ کرے، اِس پر ہمارے ائمہ کا اِجماع ہے۔ (اور اگر زندہ صدقہ کرنے کے بجائے ذبح کردیا) تو اُس شخص کو اُس ذبیحے کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے (بلکہ سارا گوشت فُقراء پر صدقہ کرے)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:9،ص:389)

صاحبِ ''بدائع الصنائع'' کے مطابق ائمۂ احناف کا متفق علیہ قول یہی ہے کہ قربانی کے لیے خریدے ہوئے جانور کی قربانی اگر ایامِ قربانی میں کسی وجہ سے نہ کی ہو، تو فقیر کی طرح مالدار بھی بعینہٖ اُس جانور کو زندہ صدقہ کرے اور ذبح کرکے صدقہ کرنے کی صورت میں اُس کا گوشت خود نہ کھائے بلکہ سارا گوشت فُقراء پر تقسیم کردے، کیوں کہ اس جانور کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ اگر قربانی کے لیے خریدے ہوئے جانور کو ایامِ قربانی کے بعد فروخت کردیا ہو تو اُس کی قیمت کا بھی صدقہ کرنا واجب ہے۔

طبی تحقیق کے لیے جانوروں کا استعمال

سوال:

میں کینسر ریسرچ کی طالبہ ہوں، ریسرچ کے لیے مختلف جانور مثلاً چوہا وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ تجربات کے دوران مختلف Compounds کی Toxicity Testing کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اُس میں کینسر داخل کیا جاتا ہے، پھر مختلف Compound سے Treat کرکے دیکھا جاتا ہے کہ اُس پر کیا اثر ہوا، آخر میں خون یا سیل حاصل کرنے کے لیے ماردیا جاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح تجربات کے لیے Animals

کے استعمال اور مارنے کی اجازت ہے؟۔اس طرح جانوروں کو انسان کے علاج اور فائدے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سائنسی تجربات کے لیے ہمارے پاس فی الوقت جانوروں کا متبادل موجود نہیں ہے۔(سیدہ روحینہ علی، بلاک 14 ایف۔بی ایریا، کراچی)

جواب:

میڈیکل کے طلبہ کے لیے زمانۂ تعلیم میں ریسرچ اور سرجری کے لیے مختلف جانداروں پر مشق یا تجربات کی ضرورت پڑتی ہے۔شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ: اَلضَّرُوْرَۃُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ (ضرورت ممنوعات کو مباح کردیتی ہے)۔موذی (ضرر اور ایذا پہنچانے والے) جانوروں کو ویسے بھی مارنا جائز ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: خَمْسٌ فَوَاسِقُ یُقْتَلْنَ فِی الْحَرَمِ: اَلْفَارَۃُ وَالْعَقْرَبُ، وَالْغُرَابُ وَالْحُدَیَا، وَالْکَلْبُ الْعَقُوْرُ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانچ فواسق (موذی) جانوروں کو حرم میں (بھی) ماردیا جائے،(وہ یہ ہیں:) چوہا، بچھو، کوا، چیل اور کاٹنے والا کتا،(سنن ترمذی:837)''۔

فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ اس حدیث پاک کی رُو سے ضرر رساں کیڑوں کا مارنا مباح ہے۔ الغرض طبی تحقیق، مختلف مہلک اَمراض کے طبی اسباب کو جاننے اور ان کی اَدوِیہ (Medicines) کی دریافت کے لیے آپ کے بیان کیے ہوئے طریقے کے مطابق چوہے، مینڈک یا کسی بھی جانور کا استعمال جائز ہے۔

اچھے اور برے خواب

سوال:

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح برے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور اُن خوابوں کا کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہیے، اسی طرح اچھے خوابوں کا بھی کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہیے اور اگر کسی کو رسول اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی ہو، اس کا بھی ذکر نہیں کرنا

چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے کی فضیلت اور اس بارے میں احادیث کی وضاحت فرمادیں۔(رمشا عمر، کراچی)

جواب:

حدیثِ پاک میں ہے:

(۱)عَنْ أَبِي سَعِيدِ الْخُدرِی أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: إِذَا رَأَىٰ أَحَدُكُم رُؤْيَا يُحِبُّهَا فَإِنَّمَا هِيَ مِنَ اللهِ، فَلْيَحْمَدِ اللهَ عَلَيْهَا وَلْيُحَدِّثْ بِهَا، وَإِذَا رَأَىٰ غَيْرَ ذٰلِكَ مِمَّا يَكْرَهُ فَإِنَّمَا هِيَ مِنَ الشَّيطَانِ فَلْيَسْتَعِذْ مِنْ شَرِّهَا وَلَا يَذْكُرْهَا لِأَحدٍ فَإِنَّهَا لَا تَضُرُّهُ۔

ترجمہ:''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جو اس کو پسند ہو تو وہ اللہ کی جانب سے ہے، وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور وہ اس خواب کو بیان کرے اور جب وہ کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو وہ شیطان کی طرف سے ہے، وہ اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور وہ خواب کسی کے سامنے نہ بیان کرے پھر وہ خواب اس کو ضرر نہیں دے گا''۔(صحیح بخاری:6985)

(۲) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ الرُّوْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيطَانِ، فَمَنْ رَأَى شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفِثْ عَنْ شِمَالِهِ ثَلَاثًا وَلْيَتَعَوَّذْ مِنَ الشَّيطَانِ فَإِنَّهَا لَا تَضُرُّهُ، وَإِنَّ الشَّيطَانَ لَا يَتَرَاءَىٰ بِيْ۔

ترجمہ:''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: نیک خواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے ہیں، پس جب کوئی شخص ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اپنی بائیں جانب تین مرتبہ تھتکار دے اور شیطان سے پناہ طلب کرے تو پھر وہ خواب اس کو ضرر نہیں دے گا اور شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا''۔

(صحیح بخاری:6995)

خواب میں زیارتِ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:

وَمَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِیْ، فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ فِیْ صُوْرَتِیْ، وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''جس نے خواب میں مجھے دیکھا، اُس نے مجھے ہی دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا، اور جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 110، 6197)''۔

اس حدیث مبارک کی رُو سے یہ امر ثابت ہے کہ سعادت مند مومن کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوسکتی ہے، یہ بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ شیطان رسول اللہ ﷺ کی صورت مبارکہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اور مذکورہ حدیث میں جو دوسری اہم بات بیان فرمائی گئی، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے والا حقیقتاً آپ ہی کو دیکھتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص محض اپنی بڑائی اور شان ظاہر کرنے کی خاطر جھوٹا خواب بیان کرے یعنی اس نے حضور ﷺ کی زیارت نہ کی ہو اور لوگوں سے بیان کرتا پھرے، تو حدیث کے مطابق وہ نارِ جہنم کا مستحق ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں اس طرح پتا چلتا ہے کہ خواب میں کوئی تعارف کرائے یا اس کے دل میں بات آئے کہ یہ نبی کریم ﷺ ہیں۔

رسمِ آمین

سوال:

میری بیٹی کی عمر ساڑھے چھ سال ہے، قرآن کریم ختم کرلیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ''رسمِ آمین'' کا پروگرام کروں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ چھوٹی بیٹی کی عمر چار سال ہے، اُس کی دینی تعلیم کی ابتدا کے لیے بسم اللہ کی تقریب کرنا کیسا ہے؟۔ نیز بیٹیوں کی پرورش کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟، (سید واثق حسین، صفورہ چورنگی کراچی)۔

جواب:

بنیادی طور پر رسوم ورواج سماجی زندگی کی علامت شمار ہوتے ہیں، کسی بھی قوم کی تہذیب کے اجتماعی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ رسوم عموماً دو سبب سے پروان چڑھتی

ہیں: (۱) معاشرتی دباؤ (۲) مذہبی جذبات۔

اسلام کا نقطۂ نظر اِس حوالے سے یہ ہے کہ جو رسمیں انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے موزوں اور مفید ہیں، اُنہیں برقرار رکھا اور بعض مواقع پر اُن کی ترغیب بھی دی گئی، جو رسوم اسلامی مزاج سے ہم آہنگ نہ ہوں یا انسانی معاشرے کے لیے مضر ہوں، اُن کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور اُن کے خاتمے کی تدابیر بھی بیان کی گئی ہیں۔ اسلام کے اِس بنیادی اصول کی بہترین مثال خطبۂ حجۃ الوداع ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے بیک وقت کئی جاہلانہ رسوم کا خاتمہ فرمایا، طویل مدت سے جاری سماجی تفریق، انتقامی کارروائیاں اور سودی لین دین کا خاتمہ فرمایا۔ غلاموں، یتامیٰ، مساکین، خواتین اور معاشرے کے کمزور طبقات جو اپنی بنیادی حقوق سے محروم تھے، اُن کے حقوق مُتعین فرمائے۔

علماء نے قرآن وسنت کی روشنی میں کچھ اصول ومعیار مقرر کیے ہیں، ان کی روشنی میں جن رسوم میں خیر کا پہلو پایا جاتا ہو، اُنہیں باقی رکھا جائے، اس حوالے سے ''عرف وعادت'' کو فقہاء نے شریعتِ اسلامی کے ضمنی مآخذ میں شمار کیا ہے۔

بچے کی تعلیم کے آغاز کے لیے ہمارے معاشرے میں رسمِ بسم اللہ کی جاتی ہے، اِس میں شرعی قباحت تو کوئی نہیں البتہ اسراف، تفاخر، ریاکاری اور معصیت کے پہلو نہیں ہونے چاہئیں، یہ زیادہ سے زیادہ ایک دعائیہ تقریب ہوتی ہے۔ لیکن آج کل اسے نام ونمود اور تحائف کے لین دین کا ذریعہ بنالیا گیا ہے، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے اور اس طرح کی لین دین کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔

امام احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی ''الکشف والبیان عن تفسیر القرآن'' میں ایک روایت نقل فرماتے ہیں:

فَاِنَّ الْمُعَلِّمَ اِذَا قَالَ لِلصَّبِیِّ: قُلْ: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، فَقَالَ الصَّبِیُّ: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، كَتَبَ اللّٰهُ بَرَاءَةً لِلصَّبِیِّ، وَبَرَاءَةً لِاَبَوَيْهِ، وَبَرَاءَةً لِلْمُعَلِّمِ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''جب معلم بچے سے کہتا ہے: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کہو، تو بچہ (اس کے جواب

میں) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ (اس عمل کی برکت سے) بچے، اُس کے والدین اور معلم (تینوں) کے لیے جہنم سے نجات مقدر فرما دیتا ہے''۔

(سورۃ الفاتحہ، فی فضل التسمیہ، جلد 1، ص:21، بیروت)

ہمارے ہاں ''رسمِ آمین'' سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جب بچہ ناظرہ یا حفظ قرآن مکمل کرلے، تو اس کے تشکّر کے طور پر دعائیہ تقریب منعقد کی جائے، سنت میں ایسی روایت ثابت نہیں ہے، لیکن صحابۂ کرام کے بعض آثار سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

مفتی احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سورۂ بقرہ بارہ سال میں تمام حقائق واسرار کے ساتھ پڑھی اور جس دن ختم کی، اُس دن خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے صحابۂ کرام کی دعوت کی''۔ اس روایت کے ذیل میں مفتی احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ دینی کتابیں شروع یا ختم کرتے وقت شیرینی تقسیم کرنا سنتِ صحابہ ہے، (تفسیر نعیمی، جلد:1، ص:98)''۔ یہی بات دیوبندی مکتبۂ فکر کے معروف عالم مولانا عبدالحفیظ مکی نے ''فتح الجواد فی معارفِ آیاتِ الجہاد'' کی تقریب رونمائی میں بیان کی اور کہا کہ ایک اونٹ ذبح کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم سو آدمیوں کی اُنہوں نے دعوت کی، واضح رہے کہ مولانا مکی مکۃ المکرمہ میں مقیم ہیں، یہی وجہ ہے کہ دینی کتب کی تقریب رونمائی کی جاتی ہے۔ مولانا عبدالحفیظ مکی کی تقریر نیٹ پر موجود ہے۔

احادیث میں بچوں کی اچھی تربیت کا حکم دیا گیا ہے:

(۱) بچوں کی عمدہ تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مُرُوْا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ، وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرٍ، وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ۔

ترجمہ: ''تمہارے بچے جب سات سال کے ہوجائیں، تو اُنہیں نماز کا حکم دو اور جب وہ دس سال کے ہوجائیں (اور نماز نہ پڑھیں) تو اُنہیں (تادیباً معمولی) مارو اور اُن کے بستر علیحدہ کردو''۔ (سُنن ابوداؤد:491)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهٗ نَحْلاً أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ۔

ترجمہ:''کسی باپ نے اپنے بیٹے کو عمدہ اور بہترین ادب سے زیادہ اچھا ہدیہ نہیں دیا''۔
(مسند امام احمد بن حنبل:16710)

(۳) أَكْرِمُوْا أَوْلَادَكُمْ، وَأَحْسِنُوا أَدَبَهُمْ۔

ترجمہ:''اپنے بچوں کا اکرام کرو اور انہیں اچھی تربیت دو''۔(سنن ابن ماجہ:3671)

بیٹیوں کی اچھی تربیت اور پرورش کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جنت اور نارِ جہنم سے نجات کی بشارت دی ہے، حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ كَهَاتَيْنِ۔ وَضَمَّ أَصَابِعَهُ

ترجمہ:''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے دو لڑکیوں کے بالغ ہونے تک پرورش کی، قیامت کے دِن میں اور وہ اِس طرح آئیں گے(راوی کہتے ہیں کہ) آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں باہم ملا دیں''۔
(صحیح مسلم:6572، سنن ترمذی:1914)

(۲) مَنْ كَانَ لَهُ ثَلَاثُ بَنَاتٍ، فَصَبَرَ عَلَيْهِنَّ وَأَطْعَمَهُنَّ وَسَقَاهُنَّ وَكَسَاهُنَّ مِنْ جِدَّتِهِ، كُنَّ لَهُ حِجَابًا مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

ترجمہ:''جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان پر صبر کرے، ان کو کھلائے، پلائے اور ان کو اپنی کمائی سے کپڑے پہنائے تو وہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ کی آگ سے حجاب بن جائیں گی''۔(سنن ابن ماجہ:3669)

(۳) وَمَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ أَوْ مِثْلَهُنَّ مِنَ الْأَخَوَاتِ فَأَدَّبَهُنَّ وَرَحِمَهُنَّ حَتّٰى يُغْنِيَهُنَّ اللّٰهُ أَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ الْجَنَّةَ، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَاثْنَتَيْنِ؟، قَالَ:''أَوِ اثْنَتَيْنِ''، حَتّٰى لَوْ قَالُوْا: أَوْ وَاحِدَةً؟، لَقَالَ: وَاحِدَةً

ترجمہ:''اور جس نے تین بیٹیوں یا اتنی ہی تعداد میں بہنوں کی کفالت کی، ان کی تربیت کی اور ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ اللہ نے (مال کے ذریعے یا شادی کی صورت

میں یا وفات کی صورت میں)انہیں اس سے مستغنی کر دیا،تو ایسے شخص کے لیے اللہ (اپنے کرم سے) جنت کو واجب فرمادے گا، ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ !اگر کسی کی صرف دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں تو؟،آپ نے فرمایا:اگر کسی کی صرف دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں،تب بھی (وہ جنت کا حق دار ہوگا)،(راوی بیان کرتے ہیں، مجھے ایسا لگا کہ) یہاں تک کہ اگر صحابہ پوچھتے: یارسول اللہ !اگر کسی کے زیرِ کفالت صرف ایک بیٹی یا ایک بہن ہو، تو رسول اللہ ﷺ فرماتے: اگر ایک ہو،تب بھی (وہ اس اجر کا حق دار ہوگا)''۔

(شرح السنہ للبغوی:3557)

واضح رہے کہ بیٹیوں اور بہنوں کی کفالت، پرورش اور نگہداشت کی ترغیب اور اجر کی نوید ایک ایسے معاشرے میں دی، جہاں بیٹیوں کی ولادت کو باعثِ ننگ و عار سمجھا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

ترجمہ:''اور وہ (فرشتوں کو) اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں،اللہ اس سے پاک ہے اور اپنے لیے وہ جس کو پسند کرتے ہیں (یعنی بیٹے) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی ہے،اُس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصے میں بھر جاتا ہے،اسی بشارت کو برا سمجھنے کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، (وہ سوچتا ہے کہ) آیا ذلت برداشت کر کے اسے روکے رکھے (یعنی زندہ رہنے دے) یا اسے (زندہ) زمین میں دبا دے، ارے! بہت ہی برا حکم لگاتے ہیں''۔(النحل:57-59)

کیا حجرۂ انور یا روضۂ انور بھی جنت کی کیاری ہے

سوال:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے حجرے سے میرے منبر تک جنت کا ٹکڑا ہے

(جس کو روضۃ الجنۃ کہا جاتا ہے)، قیامت کے دن یہ ٹکڑا اوپر اٹھالیا جائے گا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس میں حجرہ مبارک داخل ہے یا نہیں؟، (مخدوم حسن، ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

حدیث شریف میں ہے:

(۱)عَنْ عَبدِاللّٰہِ بْنِ زَیْدِ الْمَازِنِی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: مَابَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن زید مازنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے''۔ (صحیح مسلم: 3366)

علامہ یحیٰ بن شرف النووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''قَالَ الطَّبَرِی: فِی الْمُرَادِ بِبَیْتِیْ ھُنَا قَوْلَانِ: أَحَدُھُمَا: اَلْقَبرُ، قَالَہٗ زَیْدُ بْنُ اَسْلَمَ کَمَا رُوِیَ مُفَسَّرًا بَیْنَ قَبرِیْ وَمِنْبَرِیْ، وَالثَّانِیْ: اَلْمُرَادُ بَیْتُ سُکْنَاہُ عَلٰی ظَاھِرِہٖ وَرُوِیَ مَابَیْنَ حُجْرَتِیْ وَمِنْبَرِی، قَالَ الطَّبَرِی: وَالْقَوْلَانِ مُتَّفِقَانِ لِاَنَّ قَبْرَہٗ فِیْ حُجْرَتِہٖ وَھِیَ بَیْتُہٗ''۔

ترجمہ: ''طبری نے کہا: ''میرے گھر'' کے بارے میں دو قول ہیں، ایک تو یہ کہ آپ کی قبر مبارک، زید بن اسلم نے کہا جیسا کہ ''بین قبری و منبری'' والی روایت میں وضاحت کی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ظاہر طور پر آپ ﷺ کی جائے رہائش ہے، ایک روایت میں ''مَابَیْنَ حُجْرَتِیْ وَمِنْبَرِی'' بھی آیا ہے۔ امام طبری نے فرمایا: دونوں اقوال کی مراد ایک ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ کی قبر حجرے میں ہے اور وہی آپ کا بیت ہے''۔

(شرح النووی، جلد 6، ص: 3709، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ)

(۲)عَنْ أَبِی ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَابَینَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوضَۃٌ مِن رِیَاضِ الْجَنَّۃِ وَمِنْبَرِیْ عَلٰی حَوضِیْ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے''۔ (صحیح بخاری:1888)

علامہ بدرالدین عینی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ''اَنَّ الْمُرَادَ بِقَوْلِہٖ: بَیْتِیْ، اَحَدُ بُیُوْتِہٖ لَا کُلُّھَا، وَھُوَ بَیْتُ عَائِشَۃَ الَّذِیْ دُفِنَ ﷺ فِیْہِ فَصَارَ قَبْرُہٗ، وَقَدْ وَرَدَ فِیْ حَدِیْثٍ: مَابَیْنَ الْمِنْبَرِ وَبَیْتِ عَائِشَۃَ رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ، اَخْرَجَہُ الطَّبَرَانِیُّ فِی (الْاَوْسَطِ)، قَوْلُہٗ: ''رَوْضَۃٌ'' اَیْ: کَرَوْضَۃٍ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ فِیْ نُزُوْلِ الرَّحْمَۃِ وَحُصُوْلِ السَّعَادَاتِ، وَحُذِفَ اَدَاۃُ التَّشْبِیْہِ لِلْمُبَالَغَۃِ، وَقِیْلَ: مَعْنَاہُ اَنَّ الْعِبَادَۃَ فِیْھَا تُؤَدِّیْ اِلَی الْجَنَّۃِ فَیَکُوْنُ مَجَازًا، اَوِ الْمُرَادُ اَنَّ ذٰلِکَ الْمَوْضِعَ بِعَیْنِہٖ یَنْتَقِلُ اِلَی الْجَنَّۃِ،

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں ''بیتی'' سے مراد آپ ﷺ کے گھروں میں سے ایک گھر ہے، تمام گھر مراد نہیں اور وہ گھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے، جس میں آپ ﷺ کی تدفین ہوئی اور آپ کی قبر شریف بنی۔ طبرانی کی المعجم الاوسط کی ایک حدیث میں روایت ہے: ''میرے منبر اور عائشہ کے گھر کے درمیان والی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے''۔ آپ ﷺ کا قول ''روضہ'' (جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہونے) سے مراد یہ ہے کہ یہ جگہ نزولِ رحمت اور حصولِ سعادات میں جنت کی مثل ہے، اور مبالغے کے طور پر حرفِ تشبیہ (ک) کو حذف کردیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس جگہ عبادت کرنا دخولِ جنت کا سبب ہے اور یہ مجازاً ہے یا مراد یہ ہے کہ یہ جگہ بعینہٖ جنت میں منتقل کردی جائے گی''۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد 10، ص:355)

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: وَمَکَّۃُ اَفْضَلُ مِنْھَا عَلَی الرَّاجِحِ اِلَّا مَاضَمَّ اَعْضَائَہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ فَاِنَّہٗ اَفْضَلُ مُطْلَقًا حَتّٰی مِنَ الْکَعْبَۃِ وَالْعَرْشِ وَالْکُرْسِیِّ۔

ترجمہ: ''راجح قول یہ ہے کہ مکہ افضل ہے، مگر وہ جگہ جو رسول اللہ ﷺ کے جسمِ اقدس سے متصل ہے، وہ مطلقاً (تمام جگہوں سے) افضل ہے، یہاں تک کہ کعبہ، عرش اور کرسی

سے (بھی) افضل ہے"، (جلد 4،ص:47، دارُاحیاءِ التراث العربی، بیروت)"۔ اس تفصیلی بحث سے معلوم ہوا کہ قبرِانور یعنی روضۂ مبارکہ اور حجرۂ مبارکہ اس بشارت میں شامل ہے۔

بزرگانِ دین کی تصویر لٹکا کر اُس کی تعظیم کرنا اور اس سے حاجات مانگنا

سوال:

میرا تعلق آستانہ خواجہ غریب نواز سے ہے، یہاں کراچی میں آستانے میں کسی مرید نے اجمیری شاہ بابا کی تصویر بڑی کرواکر لگادی ہے، کچھ لوگ اس تصویر پر ہار پھول ڈالتے ہیں۔ لوگ تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور حاجات اور منتیں مانتے ہیں۔ منع کرنے پر کہتے ہیں کہ شریعت میں اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس بابت شرعی حکم بیان فرمائیں، (نعیم احمد، سول اسٹاف کوارٹر کراچی)۔

جواب:

شریعتِ مطہرہ میں جاندار کی تصاویر بنانے کی ممانعت ہے، سوائے اُن اُمور کے جن کے لیے تصویر بنوانا ناگزیر (Unavoidable) ہے، مثلاً شناختی کارڈ، پاسپورٹ، ویزا، ڈومیسائل، ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ۔ کسی بزرگ کی تصویر بنواکر اُس کے سامنے اس طرح عقیدت کا اظہار شرک سے مماثلت رکھتا ہے۔

تعظیم وتکریم کے لیے فوٹو کھینچنا ناجائز وحرام ہے۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز لکھتے ہیں:"دنیا میں بت پرستی کا آغاز تصاویر کو جانبِ قبلہ صرف نصب کرنے سے ہوا کَمَا فِیْ صَحِیْحِ الْبُخَارِی وَغَیْرِہٖ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا (جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے) نہ کہ سجدہ کہ جانبِ قبلہ نصب سے ہزار ہا درجہ بدتر اور کفر سے ایسا ہی قریب ہے، جیسے آنکھ کی سپیدی سے سیاہی، تصویر کی تعظیم مطلقاً حرام ہے بلکہ غیر محلِ اہانت میں اُس کا رکھنا ہی حرام و مانعِ دخولِ ملائکۂ رحمت ہے"۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 22،ص:413-412، رضافاؤنڈیشن لاہور)

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ ذَكَرَتْ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ كَنِيسَةً بِأَرْضِ الْحَبَشَةِ، يُقَالُ لَهَا مَارِيَةُ، فَذَكَرَتْ لَهُ مَا رَأَيْتُ فِيهَا مِنَ الصُّوَرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أُولَئِكَ قَوْمٌ إِذَا مَاتَ فِيهِمُ الْعَبْدُ الصَّالِحُ، أَوِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، وَصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، أُولَئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ انہوں نے حبشہ کی سرزمین میں ایک گرجا دیکھا تھا، جس کا نام ماریہ تھا، انہوں نے اس کا ذکر کیا اور ان صورتوں کے مجسموں کا ذکر کیا جو انہوں نے اس میں دیکھے تھے، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان میں سے کوئی نیک بندہ یا نیک شخص فوت ہوجاتا، تو یہ اس کی قبر پر مسجد (یعنی عبادت گاہ) بنادیتے اور اس عبادت گاہ میں اُن کی صورتوں کے مجسمے بنادیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں''۔

(صحیح بخاری:434)

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں: (إِذَا مَاتَ فِيهِمِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ) أَيْ مِنْ نَبِيٍّ أَوْ وَلِيٍّ (بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا) أَيْ مُتَعَبَّدًا وَيُسَمُّوْهُ كَنِيسَةً (ثُمَّ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ) أَيْ صُوَرَ الصُّلَحَاءِ تَذْكِيرًا بِهِمْ وَتَرْغِيبًا فِي الْعِبَادَةِ لِأَجْلِهِمْ

ترجمہ: ''جب اُن میں کوئی مردِ صالح فوت ہوجاتا تھا یعنی نبی یا ولی فوت ہوجاتا، تو اس کی قبر پر مسجد یعنی عبادت گاہ بنالیتے اور اُس کا نام کنیسہ رکھتے، پھر اُس کنیسا میں اُن بزرگوں کی تصویریں (یا مجسمے) بنادیتے تاکہ اُن کی یاد باقی رہے اور اُن کی خاطر عبادت میں رغبت پیدا ہو''۔ (مرقاۃ المفاتیح، جلد ثامن، ص:338)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ علامہ ابوالعباس احمد بن عمر القرطبی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''متقدمین نصاریٰ اپنے مردِ صالح کی قبر پر اس کا مجسمہ بناکر اس لیے رکھتے تھے تاکہ اس مردِ صالح کی صورت دیکھ کر وہ مانوس ہوں اور اس کے نیک اعمال کو یاد کریں اور اس کی

عبادت کی طرح خود بھی عبادت کرنے کی کوشش کریں اور ایسے نیک بندوں کی قبروں کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، پھر جب کافی زمانہ گزر گیا اور ان کے بعد متاخرین آئے تو وہ قبروں پر ان مجسموں کی اغراض سے ناواقف تھے اور شیطان نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ ان کے آباء واجداد ان مجسموں کی عبادت کرتے تھے تو انہوں نے ان مجسموں کی تعظیم کی اور ان کی عبادت کرنی شروع کردی، نبی ﷺ نے ایسے کاموں سے ڈرایا اور ان کاموں کو سختی سے منع کیا اور ان کاموں پر عذاب کی وعید سنائی اور غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ اور اس کا دروازہ بند کردیا اور فرمایا: ''اس قوم پر اللہ کا شدید غضب نازل ہوتا ہے، جو اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیتی ہے، پس تم قبروں کو مساجد نہ بناؤ''۔ (مؤطا امام مالک، کتاب السفر :85) یعنی میں تم کو اس کام سے منع کرتا ہوں اور فرمایا: ''اللہ عزوجل یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد بنالیا، (صحیح مسلم :532)''۔ اور فرمایا: ''اے اللہ ! میری قبر کو بت نہ بنا، جس کی عبادت کی جائے، (تنویر الحوالک، ص:189، مؤطا امام مالک، کتاب السفر :85)''۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر انور پر آپ کی عبادت کا ذریعہ قطع کرنے میں بہت مبالغہ کیا اور آپ کی قبر کی دیواروں کو بہت اونچا کردیا اور ان میں داخلہ مسدود کردیا، پھر ان کو یہ خوف ہوا کہ کہیں آپ کی قبر کو قبلہ نہ بنالیا جائے تو انہوں نے قبر کے دو رکنوں پر دو دیواریں بنادیں، حتیٰ کہ کسی شخص کے لیے نماز میں عین قبر کی طرف منہ کرنا ممکن نہ ہو، اسی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا، تو آپ کی قبر کو ظاہر کردیا جاتا''۔

(المفہم، جلد 2، ص:128)، (نعمۃ الباری، شرح صحیح بخاری، جلد 2، ص:190-189)۔

اگر صالحین کے مزارات کے قریب حصولِ برکت کے لیے مسجد بنائی، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''فَاَمَّا مَنِ اتَّخَذَ مَسۡجِدًا فِیۡ جِوَارِ صَالِحٍ وَقَصَدَ التَّبَرُّکَ بِالۡقُرۡبِ مِنۡهُ لَا لِلتَّعۡظِیۡمِ لَهٗ وَلَا لِلتَّوَجُّهِ اِلَیۡهِ فَلَا یَدۡخُلُ فِی الۡوَعِیۡدِ الۡمَذۡکُوۡرِ

ترجمہ:''رہا وہ شخص جس نے کسی نیک شخص کے مزار کے قریب حصول برکت کے لیے مسجد بنائی مگر اس کے قرب سے اس کی تعظیم اور نہ ہی نماز میں اس کی طرف رُخ کرنے کا ارادہ کیا، تو یہ اس وعید میں داخل نہیں ہے، (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد 4،ص:258، دارالکتب علمیہ، بیروت)''۔اس موضوع پر تفصیلی بحث علامہ غلام رسول سعیدی کی شرح صحیح مسلم، جلد2،ص:87-82 پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا، فَقَالَ: يَا غُلَامُ إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ، احْفَظِ اللهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ ۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ایک سواری پر نبی ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں، تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کو یاد رکھو، تم اُسے (مصیبت کے وقت اپنی مدد کے لیے) موجود پاؤ گے، جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو اور جان لو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے، تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ اور اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائیں، تو تمہیں صرف وہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جسے اللہ نے (پہلے سے) تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے (یعنی وہ غیر مرئی Unseen) دستاویز جس میں بندے کی تقدیر کے معاملات لکھتے ہوتے ہیں) خشک ہو چکے ہیں، (جامع الترمذی، رقم الحدیث: 2516)''۔ یہ حدیث متعدد کتبِ حدیث میں موجود ہے، جن میں سے چند کے حوالہ جات

درج ذیل ہیں:

☆ امام ابویعلیٰ، ''مسند ابویعلیٰ'' (جلد 3،ص:85,84،مطبوعہ بیروت)۔

☆ امام ابن سنی، ''عمل الیوم واللیلۃ'' (ص:136،مجلس الدائرۃ المعارف دکن، بھارت)۔

☆ امام ابن عبدالبر'' تمہید'' (جلد 4،ص:111 ،مکتبۂ قدوسیہ،لاہور)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ آستانے پر بزرگوں کی تصاویر آویزاں کرنا، انہیں ہار پہنانا اور لوگوں کا اُس کے سامنے عقیدت کا اظہار کرنا، ان تصاویر کو مخاطب کر کے حاجات اور منتیں ماننا شرعاً ممنوع ہے، مزار کے متولی اور ذمے داران کو چاہیے کہ اس کا فوری تدارک کریں۔ اگر ان باتوں سے بروقت نہ روکا جائے، تو آگے چل کر دیگر شرعی مفاسد کا ذریعہ بنتی ہیں اور بدعت میں حد سے تجاوز کرتے کرتے بندہ شرک کے قریب پہنچ جاتا ہے، جیسا کہ ابتدا میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کا حوالہ گزر چکا ہے۔

نوٹ: حضرت عثمان بن حُنیف رضی اللہ عنہ کی توسُّل سے متعلق روایت (سُنن ترمذی: 3589،سُنن ابن ماجہ:1385) درست ہے اور اسے لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے، جو شرعی احتیاط اور اس کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور اختیارِ ذاتی اور عطائی کے معنوی فرق اور نزاکت کو سمجھتے ہیں، ہوائے نفس کے پجاریوں کی ذہنی ساخت (Mind Set) جدا ہے۔

عَلانیہ شرعی مجرم کا سماجی مقاطعہ

سوال:

ہمارے خاندان کے ایک شخص نے کچھ عرصہ قبل نوابشاہ میں ایک عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالا، پکڑا گیا۔ اُس کا ساڑو ضمانت پر اُس کو لے آیا، یہاں آکر بھی اُس کی یہی حرکتیں رہیں۔ سگی بھانجی کے ساتھ اور سگے ساڑو کی سمدھن کے ساتھ بھی یہی حرکت کی۔ اس شخص کی بیٹی اور بیٹے شادی شدہ ہیں ایسے شخص کی شرعی سزا کیا ہے؟۔ اس سے رشتہ یا کسی قسم کا تعلق رکھنا کیسا ہے؟، (عبدالوہاب، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

مذکورہ شخص اگر زنا کا مرتکب ہے اور شرعی معیار کے مطابق چار عینی گواہوں یا مجرم کے اقرار سے مُجاز عدالت کے سامنے جرم ثابت ہو جائے تو اسلامی ریاست میں یہ جرم ''موجبِ حد'' ہے اور اس پر حدِ شرعی نافذ کرنا صرف عدالت کا دائرۂ اختیار ہے۔ شادی شدہ زانی کی سزا رجم (سنگسار کرنا) ہے۔ حدود قائم کرنا حاکمِ اسلام یا اُس کے مقررہ و مُجاز قاضی کا کام ہے۔

زنا اسلام میں سنگین جرم ہے اور ان جرائم میں شامل ہے، جن کی سزا اللہ تعالیٰ نے کسی حاکم یا حکومتِ وقت کی صوابدید پر نہیں چھوڑی بلکہ خود اپنی حکمت سے مقرر فرمائی ہے، جس میں کسی کمی بیشی کا اختیار کسی حاکم یا حکومتِ وقت کو بھی نہیں ہے۔ عدالت میں اقرارِ جرم یا گواہوں کے ذریعہ جرم ثابت ہونے کی صورت میں معافی کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

ترجمہ: ''زانیہ عورت اور زانی مرد ان میں سے ہر ایک کو تم سو کوڑے مارو''۔ (نور:2)

آپ اُسے دعوت و تذکیر سے عذابِ آخرت کا خوف دلائیں اور سچی توبہ پر آمادہ کریں، جسے قرآن نے ''توبۃً النَّصوح'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ (قال: ابومعاوية: وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ) وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: شَيْخٌ زَانٍ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ۔

ترجمہ: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین اشخاص سے نہ کلام فرمائے گا اور نہ اُنہیں پاک کرے گا (ایک اور روایت میں ابومعاویہ فرماتے ہیں: نہ اُن کی طرف نظرِ کرم فرمائے گا) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا حاکم اور تیسرا مغرور فقیر''۔ (صحیح مسلم:108)

اسلام چونکہ مسلمان کو جان و مال اور آبرو کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے لہٰذا اگر کوئی شخص

کسی شخص پر زنا کا الزام لگائے اور مُلزَم (Accused Person) اپنی عزت کے تحفظ کے لیے عدالت سے رجوع کرے، جسے آج کل ازالۂ حیثیتِ عرفی یا Defamation کی بابت دعویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو مُدّعی کو عدالت میں اپنا دعویٰ چار عینی گواہوں سے ثابت کرنا ہوگا، دعوے کے ثابت ہوجانے کی صورت میں وہ مُلزَم زنا کا مجرم قرار پائے گا اور اُس پر حدِ زنا جاری ہوگی اور اگر مُدّعی چار عینی گواہوں (Eye Witness) سے اپنا دعویٰ ثابت نہ کرسکا تو اس پر حدِ قذف جاری ہوگی، جو اَسّی کوڑے ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب چار عینی گواہوں کی شہادت رَد ہوگئی، تو ان چاروں کو اَسّی اَسّی کوڑے لگائے گئے۔

انفرادی طور پر اسلام اس بات کو پسند کرتا ہے کہ لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالا جائے اور حتی الامکان کسی کی پردہ دری یعنی راز افشا کرنے سے گریز کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

ترجمہ: ''جس نے کسی مسلمان (بھائی کے عیوب) کی پردہ پوشی کی، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کی پردہ پوشی فرمائے گا''۔ (صحیح بخاری: 2442)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ أَخِيْهِ الْمُسْلِمِ، سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ كَشَفَ عَوْرَةَ أَخِيْهِ الْمُسْلِمِ، كَشَفَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ حَتّٰى يَفْضَحَهُ فِيْ بَيْتِهِ۔

ترجمہ: ''جس نے اپنے مسلمان بھائی کے کسی عیب پر پردہ ڈالا، تو (اس کی جزا کے طور پر) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا اور جس نے اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کی، تو اللہ تعالیٰ اُس کے عُیوب کو فاش فرمائے گا، یہاں تک کہ اسے اُس کے گھر میں رسوا فرمادے گا''۔ (سُنن ابن ماجہ: 2546)

(۳) ''وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ، فَاِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيْهِ الْمُسْلِمِ تَتَبَّعَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ،

ترجمہ: ''مسلمانوں کے پوشیدہ احوال کا سراغ نہ لگاؤ، کیونکہ جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کے درپے ہوگا، اللہ اس کی پردہ دری فرمائے گا''۔ (سُنن ترمذی: 2032)

(۴) ایک شخص سے بشری کمزوری کے تحت زنا کا جرم سرزد ہوا، وہ خود اعترافِ جرم کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا کہ مجھ پر حدِ شرعی جاری فرما دیجیے، اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''لَقَدْ سَتَرَکَ اللّٰہُ، لَوْ سَتَرْتَ نَفْسَکَ''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے عیب پر پردہ ڈال رکھا تھا، کاش کہ تم خود بھی اپنے عیب پر پردہ ڈالے رہتے، (صحیح مسلم: 2763)''۔ یعنی اُس پر کسی نے زنا کا الزام نہیں لگایا تھا، نہ ہی کسی نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا تھا، اُس کے ضمیر (نفسِ لوّامہ) نے خود اسے ملامت کیا، وہ اپنے قصور پر نادم ہوا اور اس نے چاہا کہ آخرت کے عبرتناک انجام سے بہت بہتر ہے کہ اس دنیا ہی میں وہ اپنے کیے کی سزا بھگت لے اور اپنے قلب وروح کو اس گناہ کی آلودگی سے پاک کرلے، پس اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ مقبولہ کی سعادت عطا فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان سے بشری کمزوری کے تحت گناہ سرزد ہوگیا ہو اور اس کا جرم عیاں نہ ہوا ہو، تو وہ صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے اور آئندہ اپنی توبہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید کرنی چاہیے کہ وہ اُسے معاف فرمادے گا۔ البتہ جس کا جرم عَلانیہ ہے اور وہ گناہوں پر اتنا جری ہے کہ اسے معاشرے میں عار بھی محسوس نہیں ہوتا اور اس کی بدکرداری کی وجہ سے پورا معاشرتی ماحول متاثر ہورہا ہے، تو پھر ایسے شخص کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کرنا چاہیے تاکہ اس پر معاشرتی دباؤ پڑے اور وہ اپنی خباثتوں سے باز آجائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ

ترجمہ: ''اور بے شک کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا گیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا

انکار کیا جارہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جارہا ہے، تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو، حتیٰ کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہوجائیں، ورنہ بلاشبہ تم بھی انہی کی مثل ہوجاؤ گے''۔ (نسا:140)

(۲) وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝

ترجمہ: ''اور (اے مخاطَب!) جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات میں کج بحثی کرتے ہیں، تو ان سے منہ پھیر لو، حتیٰ کہ ان کی بحث کا موضوع بدل جائے اور (اے مخاطَب!) اگر تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے کے بعد قومِ ظالمین کے ساتھ نہ بیٹھو''۔ (انعام:68)

(۳) وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ

ترجمہ: ''جن لوگوں نے ظلم کیا، ان کی طرف مائل نہ ہو، ورنہ تمہیں (دوزخ کی) آگ پہنچے گی''۔ (ہود:113)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے دعائے قنوت کی تعلیم کی، اس میں یہ الفاظ ہیں: نَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ یَّفْجُرُكَ

ترجمہ: '' جو تیری نافرمانی کرے، ہم اُس سے قطع تعلق کرتے ہیں، (مُصنّف ابن ابی شیبہ: 6965)''۔ یعنی ہم وتر کی نماز پڑھتے ہوئے ''دعائے قنوت'' میں اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ: ''اے اللہ! جو تیرا نہیں وہ میرا نہیں''، یعنی ہماری ایک دوسرے سے دوستی یا دشمنی، محبت یا نفرت کا مدار نفسانی اغراض وخواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہوتی ہے، اسی بات کو احادیث مبارکہ میں مقامِ مدح میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، جس میں ایسے سات خوش نصیب انسانی طبقات کا ذکر کیا گیا ہے، جو قیامت کی حشر سامانیوں میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی سایۂ رحمت میں عافیت وامان میں ہوں گے، ان کا تفصیلی بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''(ان میں سے) ایسے دو اشخاص بھی ہیں کہ ان کی آپس کی محبت کی اساس اللہ

تعالیٰ کی رضا ہے، مل بیٹھتے ہیں تو محض اللہ کی رضا کی خاطر اور (اگر کبھی) رشتہ توڑنا پڑے تو بھی اللہ کی رضا کے لیے''۔ (صحیح بخاری:660)

علامہ اقبال نے کہا ہے:

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بُتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الاّ اللہ

حدیث قدسی ہے: ''اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میری محبت ان کے لیے لازم ہے، جو صرف اور صرف میری رضا کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، باہم مل بیٹھتے ہیں، ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے آتے جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں''۔ (مؤطا امام مالک، باب ماجاء فی المتحابین فی اللہ)

اس کے برعکس اللہ عزّوجلّ نے مشرکین کی مذمت میں فرمایا:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝

ترجمہ: ''یہ (مشرک) چاہتے ہیں کہ آپ دین کے معاملے میں ان کو بے جا رعایت دیں تاکہ یہ بھی جواباً آپ کو رعایت دیں''۔ (القلم:9)

وظائف اور دعائیں پڑھنا

سوال:

کسی مشکل کے حل کے لیے جو وظائف پڑھے جاتے ہیں، سنا ہے کہ کسی بزرگ کی اجازت کے بغیر نہیں پڑھنا چاہیے، ورنہ انسان پاگل ہو جاتا ہے، کیا اس بات میں کوئی سچائی ہے؟۔ اگر نہیں تو کیا ہم کسی بھی قسم کا وظیفہ کر سکتے ہیں، وہ چاہے شادی کے لیے ہو یا پڑھائی کے لیے، (اسما، لاہور)۔

جواب:

قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں جو دعائیں بیان کی گئی ہیں، اُن کے پڑھنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، اُن میں مختلف انبیاءِ کرام علیہم السلام کی دعائیں بھی

شامل ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا کسی دعا کی تعلیم فرما دینا ہی اُس کی اجازتِ عام ہے، کیونکہ دعا کی ترغیب اللہ عزّوجلّ نے خود قرآن مجید میں دی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کی تعلیم فرمائی ہے اور دعا کو عبادت کا مغز قرار دیا ہے، کیونکہ عبادت میں بندہ اپنے معبود کی بارگاہ میں حضوری کے شرف سے مُشرّف ہوتا ہے اور دعا تو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست التجا اور تخاطب کا نام ہے، اسی لیے اس پر کسی خاص زبان یا الفاظ کی پابندی بھی نہیں ہے۔ البتہ جو وظائف کسی خاص مقصد کے لیے پابندی اور شرائط کے ساتھ کیے جاتے ہیں، اُن میں رجعت کا احتمال ہوتا ہے، اُنہیں کسی صاحبِ نظر عامل کی اجازت سے پڑھنا افضل ہے۔

تبلیغِ دین فرضِ کفایہ ہے

سوال:

تبلیغی جماعت کی حقیقت کیا ہے؟ مزید یہ کہ تبلیغی جماعت میں شرکاء کے لیے حقوق العباد کی ادائیگی ترک کر کے تبلیغ کو فرض عین سمجھنا کہاں تک جائز ہے؟۔ آپ قرآن وسنت کی روشنی میں ہمیں تعلیم فرمائیں کہ کیا کوئی شخص اپنی بیمار بیوی اور ایک بیٹی عمر 5 سال ایک بیٹا عمر 11 سال دوسرا بیٹا عمر 9 سال تیسرا کمسن بیمار ونحیف بیٹا عمر 3 سال کو اللہ کے رحم وکرم پر چھوڑ کر کبھی سہ روزہ چلے پر کبھی چار ہفتے کے چلے پر تو کبھی چار مہینے کے چلے پر جا سکتا ہے کبھی کبھی اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جاتا ہے اور سب بچوں کو اپنے کسی رشتے دار کے گھر چھوڑ جاتا ہے کیا اس کا یہ عمل قرآن اور سنت کے مطابق ہے۔ آپ کی نظر میں اس کا کیا حل ہے کیا تبلیغی جماعت کے اکابرین ایسے لوگوں سے ناواقف نہیں؟، (ایک دردمند باپ)۔

جواب:

تبلیغی جماعت کو زیرِ بحث لانے سے قطعِ نظر کر کے ہم قرآن وسنت کی روشنی میں نفسِ مسئلہ پر بات کریں گے۔ تبلیغِ دین بحیثیتِ مجموعی اُمّتِ مسلمہ پر فرضِ کفایہ (Community Obligation) ہے، یہ الگ بات ہے کہ اجر کا حق دار صرف وہی

ہوگا جو اس دینی فریضہ سے عہدہ برا ہوگا۔ اس سلسلے میں ارشاداتِ باری تعالیٰ یہ ہیں:

(۱) وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۝

ترجمہ: ''اور تم میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت ہونی چاہیے جو اچھائی کی طرف بلائیں اور نیک کاموں کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور وہی لوگ فلاح کو پہنچنے والے ہیں''۔ (آلِ عمران:104)

(۲) كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ‌ؕ وَلَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ لَڪَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ‌ؕ مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ۝

ترجمہ: ''جو امتیں لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہیں تم ان سب میں بہترین امت ہو، (تمہاری خوبی یہ ہے کہ) تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر تھا، ان میں سے بعض مؤمن ہیں اور اکثر کافر ہیں'' (آلِ عمران:110)

(۳) وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ‌ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيۡعُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ سَيَرۡحَمُهُمُ اللّٰهُ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ۝

ترجمہ: ''اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، ان ہی لوگوں پر عنقریب اللہ رحم فرمائے گا، بے شک اللہ بہت غلبہ والا بے حد حکمت والا ہے، (توبہ:71)''۔

(۴) اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ۝

ترجمہ: ''ان لوگوں کو اگر ہم زمین میں اقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور نیکی کا حکم دیں اور بُرائی سے روکیں اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے''۔ (الحج:41)

حدیثِ پاک میں ارشاد ہے: (۱) مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَ ذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَان

ترجمہ: ''تم میں سے جو شخص کوئی بُرائی دیکھے تو اسے اپنی قوتِ بازو سے روکے اور اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے روکے (یعنی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے یا وعظ وتذکیر سے کام لے) اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو (کم ازکم) اسے دل سے بُرا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے، (مسلم:49)''۔ علماء نے فرمایا: بُرائی کو طاقت سے روکنا حاکمِ وقت کی ذمے داری ہے، وعظ وتذکیر سے روکنا علماء یا معاشرے کے بااثر لوگوں کی ذمہ داری ہے اور دل سے بُرا جاننا یہ ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا:

(۲) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ''مِثْلُ الْمُدَاھِنِ فِیْ حُدُوْدِ اللّٰہِ وَالْوَاقِعِ فِیْھَا، مِثْلُ قَوْمٍ اِسْتَھَمُوْا سَفِیْنَۃً فَصَارَ بَعْضُھُمْ فِیْ اَسْفَلِھَا، وَصَارَ بَعْضُھُمْ فِیْ اَعْلَاھَا، فَکَانَ الَّذِیْ فِیْ أَسْفَلِھَا یَمُرُّ بِالْمَاءِ عَلَی الَّذِیْنَ فِیْ أَعْلَاھَا، فَتَأَذَّوْا بِہٖ، فَأَخَذَ فَأْسًا، فَجَعَلَ یَنْقُرُ أَسْفَلَ السَّفِیْنَۃِ، فَأَتَوْہُ فَقَالُوْا: مَالَکَ؟ قَالَ: تَأَذَّیْتُمْ بِیْ وَلَا بُدَّ لِیْ مِنَ الْمَاءِ، فَاِنْ أَخَذُوْا عَلٰی یَدَیْہِ أَنْجَوْہُ وَنَجَّوْا اَنْفُسَھُمْ، وَاِنْ تَرَکُوْہُ أَھْلَکُوْہُ وَأَھْلَکُوْا اَنْفُسَھُمْ۔

ترجمہ: ''اللہ کی حدود میں مُداھنت کرنے والے (یعنی مصلحت پسندی کا شکار ہوکر لاتعلق رہنے والے یا اہلِ باطل کی بے جا رعایت کرنے والے) اور بُرائی میں مبتلا ہونے والے کی مثال ایسی ہے کہ لوگوں نے کشتی میں سوار ہونے کے لیے آپس میں قرعہ اندازی کی، بعض کشتی کی بالائی منزل پر آ گئے اور کچھ زیریں منزل پر، پھر نچلی منزل والوں نے بالائی منزل والوں سے کہا کہ ہمیں پانی دو، تو انہوں نے اذیّت رسانی سے کام لیا۔ اس کے ردِ عمل میں

نچلی منزل والوں نے کلہاڑا اٹھایا اور پانی حاصل کرنے کے لیے کشتی میں سوراخ کرنے لگے، اوپر والوں نے یہ ماجرا دیکھا تو نیچے آئے اور کہا یہ کیا کررہے ہو؟۔ انہوں نے جواب دیا: آپ لوگوں نے پانی نہ دے کر ہمیں تکلیف پہنچائی ہے، اب ہمیں پانی تو بہرحال چاہیے۔ اگر بالائی منزل والے پانی دے کر کشتی میں شگاف ڈالنے سے انہیں روک لیں گے تو دونوں فریق ڈوبنے سے بچ جائیں گے اور اگر وہ انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیں گے تو کشتی میں پانی داخل ہوجائے گا اور دونوں ہلاک ہوجائیں گے، (مشکوٰۃ:5138)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر معاشرہ مجموعی حیثیت سے شر اور معصیتوں کی مزاحمت نہیں کرے گا اور تبلیغِ دین کے فریضے سے لاتعلق ہوجائے گا، تو انجامِ کار سب تباہی سے دوچار ہوں گے۔

خطبۂ حجۃ الوداع کے مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے مجمعِ عام سے سوال کیا: اِنَّکُمْ تُسْاَلُوْنَ عَنِّیْ فَمَاذَا تُجِیْبُوْنَ؟، تم سے (قیامت کے دن) میرے بارے میں پوچھا جائے گا، تو تم کیا جواب دو گے؟، سب نے جواب دیا: ''آپ نے دین کی امانت بلاکم وکاست ہم تک پہنچادی، آپ نے تبلیغِ دین کا حق ادا کردیا، آپ نے کمال درجے کی خیرخواہی کی''۔ پھر آپ ﷺ نے سوال کیا: اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ، قَالُوْا بَلٰی، کیا میں نے اللہ کا پیغام بلاکم وکاست تم تک پہنچا نہیں دیا؟، سب نے یک زبان ہوکر جواب دیا: یقیناً آپ نے اللہ کا پیغامِ ہدایت ہم تک پہنچادیا ہے۔ پھر آپ نے تین مرتبہ اپنی انگشت شہادت بلند کرکے نیچے کی اور تینوں بار فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہنا (کہ میں فریضۂ نبوت یعنی تبلیغِ دین کی ذمے داری سے عہدہ برا ہوچکا اور تیرے یہ بندے علی الاعلان اس کا اقرار واعتراف کررہے ہیں)، پھر آپ نے فرمایا: ''آج جو یہاں (میدان عرفات میں) موجود ہیں، وہ (یہ دعوتِ حق اور امانتِ دین) ان تک پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں''۔

لیکن تبلیغِ دین کی یہ ذمے داری ہر ایک کے حالات اور استطاعت کے مطابق ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اس فریضے کو ادا کرتے ہوئے حقوق العباد سے غافل ہوجائے، دین کُلّیت (Totality) کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، بے شک شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے''۔ (البقرہ: 208)

یعنی دین میں تجزی کرنا اور پسند و ناپسند کی بنیاد پر بعض احکام کو مان لینا اور بعض کو ترک کرنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں اس کے لیے مکمل رہنمائی موجود ہے:

(۱) نبی ﷺ نے (مُواخاتِ انصار و مہاجرین کے موقع پر) حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا، حضرت سلمان، حضرت ابوالدرداء کی ملاقات کے لیے گئے۔ اُنہوں نے (اُن کی بیوی) حضرت اُم الدرداء کو خستہ حالت میں دیکھا تو ان سے پوچھا: یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟۔ اُنہوں نے بتایا کہ تمہارے بھائی ابوالدرداء کو دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر حضرت ابوالدرداء آئے تو انہوں نے حضرت سلمان کو کھانا پیش کیا، حضرت سلمان نے کہا: آپ بھی کھائیں، تو حضرت ابوالدرداء نے کہا: میں روزے سے ہوں، حضرت سلمان نے کہا: میں اُس وقت تک نہیں کھاؤں گا، جب تک کہ آپ نہیں کھائیں گے، پھر حضرت ابوالدرداء نے (مہمان کی دلداری کے لیے نفلی روزہ توڑ کر) کھانا کھایا۔ پھر جب رات ہوگئی تو حضرت ابوالدرداء (قیام اللیل کے) نوافل پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے، حضرت سلمان نے اُن سے کہا: آپ سو جائیں، سو وہ سو گئے۔ پھر (تھوڑی دیر بعد) وہ نماز کے لیے اٹھے، حضرت سلمان نے پھر کہا: آپ سو جائیں۔ پھر جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت سلمان نے کہا: اب آپ اٹھیں، پھر دونوں نے نماز پڑھی، پھر اُن سے حضرت سلمان نے کہا: اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَیْكَ حَقًّا، وَلِنَفْسِكَ عَلَیْكَ حَقًّا، وَلِاَهْلِكَ عَلَیْكَ حَقًّا، فَاَعْطِ كُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ، فَاَتَی النَّبِیَّ ﷺ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهٗ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: صَدَقَ سَلْمَانُ۔

ترجمہ: ''بے شک آپ کے رب کا آپ پر حق ہے، آپ کے نفس کا آپ پر حق ہے اور آپ

کے اہلِ خانہ کا آپ پر حق ہے، سو آپ ہر حق دار کو اُس کا حق (پورا پورا) دیں، پھر حضرت ابوالدرداء نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور (شکایت کے انداز میں) آپ کو یہ قصہ سنایا (کہ میرے بھائی سلمان نے رات مجھے قیام اللیل سے روکے رکھا) تو نبی ﷺ نے فرمایا: سلمان نے سچ کہا ہے۔ (صحیح بخاری:1968)

(۲): سَمِعَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يَقُوْلُ: جَآءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ اِلٰى بُيُوْتِ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا كَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا وَاَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ قَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا اَنَا فَاِنِّيْ اُصَلِّي اللَّيْلَ اَبَدًا وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا اُفْطِرُ وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَاءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِلَيْهِمْ فَقَالَ: اَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا اَمَا وَاللهِ اِنِّيْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ لٰكِنِّيْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّيْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ: تین افراد نبی ﷺ کی ازواج کے گھروں میں گئے اور ان سے نبی ﷺ کی عبادت (کے معمولات) سے متعلق سوال کیا، پس (ازواجِ مطہرات نے) آپ ﷺ کے معمولاتِ عبادت بتائے، تو گویا انہوں نے (اپنی دانست میں) اتنی عبادت کو کم سمجھا۔ پھر انہوں نے کہا: کہاں ہم اور کہاں نبی ﷺ؟، آپ کے تو تمام اگلے اور پچھلے بہ ظاہر خلافِ اولیٰ کاموں کی مغفرت کر دی گئی ہے، تو ان میں سے ایک نے کہا: ''میں تو ہمیشہ پوری رات نوافل پڑھتے ہوئے گزاروں گا''، دوسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ (نفلی) روزے رکھا کروں گا اور روزہ کبھی نہیں چھوڑوں گا''، تیسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ عورتوں سے اجتناب کروں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا (تاکہ نہ بیوی بچے ہوں اور نہ خانگی ذمے داریوں کا جھنجھٹ)''۔ دریں اثنا رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، تو آپ ﷺ نے (ان کی باتوں کو سن کر) فرمایا: تو تم وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا تھا؟، سنو! اللہ کی قسم! بے شک میں تم سب سے زیادہ

متقی ہوں اور میرے دل میں اللہ کی خشیت سب سے زیادہ ہے، لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور کبھی چھوڑ بھی دیتا ہوں اور رات کو (نفلی) نماز پڑھتا بھی ہوں اور رات کے بعض حصے میں سو بھی جاتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ سو جس نے میری سنت سے اعراض کرکے (تقوے کا اپنا من پسند طریقہ اختیار کیا) تو وہ میرے (پسندیدہ) طریقے پر نہیں ہے''۔ (بخاری:5063)

اگر مذکورہ شخص کی بیوی یا بچے بیمار ہیں اور اُن کی خدمت کرنے اور ضروریات پوری کرنے کے لیے ان کا گھر پر موجود رہنا ضروری ہے اور متبادل کوئی انتظام بھی نہیں ہے، تو اُسے اس ذمے داری کو ترجیح دینی چاہیے، کیونکہ تبلیغ کے لیے دوسرے ایسے افرادِ معاشرے میں موجود ہو سکتے ہیں، جن کے لیے یہ معاملات رکاوٹ نہ بن رہے ہوں۔ اور آدمی اپنی خاندانی ذمے داریاں نباہتے ہوئے اپنے اپنے دائرۂ کار میں تبلیغ کو بھی جاری رکھ سکتا ہے، اپنے خاندان، محلے، بستی، دفتر اور کارخانے میں یا جہاں بھی وہ کام کرتا ہے۔ اور اگر کچھ لوگ اس کے ساتھ ہیں یا ماتحت ہیں تو انہیں بھی دینی احکام پر عمل کرنے کی احسن طریقے سے ترغیب دے سکتا ہے۔ سو تبلیغِ دین کے ایک سے زیادہ مواقع (Opportunities) ہمیشہ دستیاب رہتے ہیں۔ اسلام توسُّط واعتدال کا دین ہے، دینی امور میں افراط وتفریط اور غُلُوّ سے بچتے ہوئے متوازن طریقہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ یہ تأثر پیدا نہ ہو کہ دین دار لوگ اپنے آپ کو کوئی مافوق البشر مخلوق سمجھتے ہیں یا انسانی حقوق کی پاس داری نہیں کرتے اور صرف ایک ہی رُخ پر چل پڑتے ہیں اور آخرِ کار ایک انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔

آج سے تیس سال پہلے جنوبی افریقا کے دورے پر تھا، تو کچھ لوگ اس مسئلے پر آپس میں بحث کررہے تھے، ایک صاحب نے فوراً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ دیا کہ دیکھئے وہ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو بے آب وگیاہ سرزمین پر چھوڑ آئے۔ میں نے اُن کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مَرکَزُ الْمِلَل (Centre Point of three Revealed Religions) تھے، وہ اولوالعزم انبیاء کرام میں سے

تھے اور انہوں نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم پر کیا تھا۔ وہ تو اپنے خواب پر عمل کرتے ہوئے بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہوگئے اور اس میں ذرا برابر بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی، اس لیے کہ نبی کا خواب وحیِ ربانی ہوتا ہے اور حجت ہوتا ہے، جب کہ ہر بندۂ مومن کا الہام یا خواب حُجتِ شرعی نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعض اُمورِ نبوت کے خصائص میں سے ہوتے ہیں، جیسے رسول اللہ ﷺ کا صومِ وصال (مسلسل روزے) رکھنا اور بیک وقت چار سے زیادہ ازواجِ مُطہرات کو نکاح میں رکھنا۔

پس جو شخص تبلیغِ دین کے لیے مصروفِ عمل ہے، یقیناً اس کی خواہش ہوگی کہ لوگ اس کی ''دعوت الی اللہ'' پر لبیک کہیں، تو اُسے بھی اخلاص اور لِلّٰہیت پر مبنی دوسرے دینی بھائی کی دعوتِ خیر پر توجہ دینی چاہیے، دین کے معاملات میں اَڑیل پن اور حُجّت بازی پسندیدہ بات نہیں ہے۔

اسلامی یا شرعی لباس کا کم از کم معیار

سوال:

لباس کی شرعی تعریف کیا ہے؟ ساڑھی کے لیے کیا حکم ہے؟، (سیدہ آمنہ، کراچی)۔

جواب:

لباس اُس چیز کو کہتے ہیں، جس کو پہنا جائے۔ علامہ زبیدی لکھتے ہیں: ''لَبِسَ الثَّوبَ'' کا معنیٰ کپڑا پہننا یا پہنانا ہے، اس کا مصدر لُبس ہے اور لباس کا لفظ مشہور ہے، (تاج العروس شرح القاموس، جلد 4،ص:238)''۔ اتنا لباس جس سے سترِ عورت ہوجائے اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچے، فرض ہے اور اس سے زائد جس سے زینت مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار کیا جائے، مستحب ہے۔ حدیث پاک میں ہے: اِنَّ اللہ یُحِبُّ اَنْ یَّرٰی اَثَرَ نِعمَتِہٖ عَلٰی عَبدِہٖ۔ ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ وہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھے (یعنی اسراف سے بچتے ہوئے جائز حد تک اللہ تعالیٰ کی نعمت سے استفادہ شکرِ نعمت کی ایک صورت ہے)''۔ (سُنن ترمذی:2819)

ایسا لباس جس سے ستر مکمل طور پر نہ ڈھانپا جا سکے یا باریک لباس جس سے جسم نظر آئے یا ایسا لباس جس سے واجب السّتر اعضاء کی ساخت یا خدوخال واضح ہوتے ہوں، پہننا ممنوع ہے۔ حدیث پاک میں ہے: وَنِسَآءٌ کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ مُمِیلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُؤُسُهُنَّ کَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا یَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یَجِدْنَ رِیحَهَا وَإِنَّ رِیحَهَا لَیُوجَدُ مِنْ مَسِیرَةِ کَذَا وَکَذَا۔

ترجمہ: ''اور (اہلِ جہنم میں) وہ عورتیں بھی ہوں گی، جو لباس پہننے کے باوجود عریاں ہوں گی، وہ راہِ حق سے ہٹانے والی اور خود بھی ہٹی ہوئی ہوں گی، ان کے سر بختی اونٹوں کی طرح ایک طرف جھکے ہوئے ہوں گے، وہ جنت میں داخل ہوں گی، نہ جنت کی خوشبو پائیں گی اور جنت کی خوشبو اتنی اتنی مسافت سے آتی ہے۔ (صحیح مسلم: 2128)''۔ (یعنی بہت دور سے آتی ہے اور ایک حدیث کی رُو سے جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے آتی ہے)''۔

(المستدرک للحاکم، رقم الحدیث: 133)

امام نووی نے اس حدیث کی شرح ان الفاظ میں کی ہے: ''کاسیاتٌ'' کے معنی ہیں: وہ اپنے بدن کا بعض حصہ اپنی نمود کے لیے کھلا رکھیں گی یا ایسا باریک اور شفاف لباس پہنیں گی، جس سے ان کے مستور اعضاء جھلک رہے ہوں گے۔ ''مائلاتٌ'' کے معنیٰ ہیں: اللہ کی اطاعت سے انحراف کرنے والی ہوں گی یا ستر شرعی سے انحراف کر رہی ہوں گی اور اس کے ایک معنیٰ ہیں: متکبرانہ انداز میں کندھوں کو اُچکاتے ہوئے چلیں گی یا ایسا میک اپ کر کے چلیں گی، جس سے وہ لوگوں کے لیے مرکزِ نگاہ بنیں، جسے شمعِ محفل کہا جاتا ہے۔ ''ممیلاتٌ'' کے معنیٰ ہیں: اپنے حسن یا مذموم حرکات کے جلوے دکھائیں گی''۔

(صحیح مسلم بشرح النووی، جلد: 14، ص: 92، بیروت)

ساڑھی پہننے سے اگر ستر شرعی کا مقصد پورا ہوتا ہے تو درست ہے اور اگر ساڑھی پہننے سے بدن کا بعض حصہ بے لباس رہے یا اعضائے مستورہ کی ساخت نمایاں ہو، تو جائز نہیں ہے، الغرض ہر قسم کے لباس کے لیے شرعی ضابطہ ایک ہی ہے۔

نامناسب نظر آنے والے بالوں کا ازالہ

سوال:

چہرے ہاتھ اور پیروں پہ اُگنے والے بالوں کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کا صاف کروانا جائز ہے؟۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ مردوں سے مشابہت ہونے کی صورت میں جائز نہیں، تو اس مشابہت کی کیا حد ہے؟، (سیدہ آمنہ، کراچی)۔

جواب:

محض زیبائش کے لیے فطری بناوٹ کو بدلنا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے بال نوچنے اور نُچوانے والیوں پر لعنت فرمائی ہے۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ عبدِ اللہ: لَعَنَ اللہُ الواشِمَاتِ وَالمُستَوشِمَاتِ، وَالمُتَنَمِّصَاتِ، وَالمُتَفَلِّجَاتِ لِلحُسنِ، المُغَيِّرَاتِ خَلقَ اللہِ تَعَالٰی،

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ گودنے والیوں اور گودوانے والیوں پر لعنت فرماتا ہے اور بال نوچنے والیوں اور دانتوں میں حسن کے لیے کشادگی کرانے والیوں پر، جو اللہ کی تخلیق کو متغیر کرنے والی ہیں''۔ (صحیح بخاری: 5931)

البتہ اگر عورت کے چہرے اور ہاتھوں پر غیر معتاد بال اُگ آئیں، تو اُن کے صاف کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، اسی طرح جن بالوں سے شوہر کو کراہیت ہو تو ان کو صاف کرنے کی بھی اجازت ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَلَعَلَّہ مَحمُولٌ عَلٰی مَا اِذَا فَعَلَتهُ لِتَتَزَیَّنَ لِلأَجَانِبِ، وَاِلَّا فَلَو کَانَ فِی وَجهِهَا شَعرٌ یَنفِرُ زَوجُهَا عَنهَا بِسَبَبِہٖ فَفِی تَحرِیمِ اِزَالَتِہٖ بُعدٌ، لِاَنَّ الزِّینَةَ لِلنِّسَاءِ مَطلُوبَةٌ لِلتَّحسِینِ، اِلَّا اَنْ یَحمِلَ عَلٰی مَالَا ضَرُورَةَ اِلَیہِ لَمَا فِی نَتفِہٖ بِالمِنمَاصِ مِنَ الاِیذَاءِ۔ وَفِی ''تَبیِینِ المَحَارِمِ'' اِزَالَةُ الشَّعرِ مِنَ الوَجهِ حَرَامٌ، اِلَّا اِذَا نَبَتَ لِلمَرأَةِ لِحیَةٌ أَو شَوَارِبُ فَلَا تَحرُمُ اِزَالَتُہُ بَل تُستَحَبُّ۔ وَفِی ''التَّاتَرخَانِیَة'' عَنِ ''المُضمَرَاتِ'': وَلَابَأسَ بِأَخذِ الحَاجِبَینِ وَشَعرِ وَجهِہٖ مَالَم یُشبِہِ المُخَنَّثَ۔

ترجمہ:''شاید یہ ممانعت کا حکم اس پر محمول ہے کہ (کوئی عورت) اجنبی مردوں کے سامنے اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کے لیے یہ کام کرے، ورنہ اگر کسی عورت کے چہرے پر ایسے بال ہیں کہ اُن کی وجہ سے اس کا شوہر اس سے نفرت کرتا ہے (یا اعراض کرتا ہے)، تو ایسے بالوں کا ازالہ کرنے (یعنی ہٹانے) کو حرام قرار دینا (حکمتِ شرعی سے) بعید بات ہے، سوائے اس کے اس کی حرمت کو ایسے بالوں کے دور کرنے پر محمول کیا جائے، جن کے ازالے کی ضرورت نہیں ہے اور ان کو نوچنے میں ایذا بھی ہے، ''تبیین المحارم'' میں ہے: چہرے سے بالوں کا دور کرنا حرام ہے، مگر جب عورت کے چہرے پر ڈاڑھی یا مونچھیں اُگ آئیں، تو ان کا دور کرنا حرام نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اور ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' میں ''مضمرات'' کے حوالے سے ہے: اَبروؤں اور چہرے کے (غیر ضروری) بالوں کو دور کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جب تک کہ مُخنّث سے مُشابہت نہ ہو''۔

(جلد 9، ص:455، بیروت)

اسی طرح ابرو (بھنوؤں) کے بال اگر عام حالت سے زیادہ بڑے ہوئے ہیں اور چہرہ عیب دار معلوم ہوتا ہو تو شرعاً اُس عیب کو ختم کرنے کی غرض سے ان بالوں کو کم کرکے عام حالت کے مطابق کیا جاسکتا ہے، البتہ بغیر کسی عذر کے بالوں کو عام حالت سے کم یا مصنوعی طریقے سے زیادہ کرنا جائز نہیں ہے۔ فقہاء نے ممانعت کے تین سبب بیان کیے ہیں:

(۱) تَغیِیر لِخَلق اللہ یعنی اللہ کے بنائے ہوئے اعضا اور شکل وصورت میں تبدیلی کرنا۔

(۲) تَزَیُّنْ لِلاَجَانِب یعنی غیر محرم مردوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے خود کو مزین کرنا۔

(۳) خود کو بلاوجہ اذیت دینا۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب بعنوان: ''اَلْمُتَشَبِّھُونَ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّھَاتِ بِالرِّجَالِ'' باندھا، جس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''لَعَنَ رَسُولُ اللہ ﷺ اَلْمُتَشَبِّھِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّھَاتِ مِنَ

النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے مشابہت رکھنے والے مردوں اور مردوں سے مشابہت رکھنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے''۔ (صحیح بخاری:5885)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں: ''أَیْ: هٰذَا بَابٌ فِی بَیَانِ ذَمِّ الرِّجَالِ الْمُتَشَبِّهِیْنَ بِالنِّسَاءِ وَبَیَانِ ذَمِّ النِّسَاءِ الْمُتَشَبِّهَاتِ بِالرِّجَالِ، وَیَدُلُّ عَلٰی ذٰلِكَ ذِكْرُ اللَّعْنِ فِیْ حَدِیْثِ الْبَابِ وَتَشَبُّهُ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ فِی اللِّبَاسِ وَالزِّیْنَةِ الَّتِیْ تَخْتَصُّ بِالنِّسَاءِ مِثْلُ لُبْسِ الْمَقَانِعِ وَالْقَلَائِدِ وَالْمَخَانِقِ وَالْأَسْوِرَةِ وَالْخَلَاخِلِ وَالْقُرْطِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ مِمَّا لَیْسَ لِلرِّجَالِ لُبْسُهٗ، وَتَشَبُّهُ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ مِثْلُ لُبْسِ النِّعَالِ الرِّقَاقِ وَالْمَشْیِ بِهَا فِیْ مَحَافِلِ الرِّجَالِ وَلُبْسِ الْأَرْدِیَةِ وَالطَّیَالِسَةِ وَالْعَمَائِمِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ مِمَّا لَیْسَ لَهُنَّ اِسْتِعْمَالُهٗ،

ترجمہ: ''یعنی اس باب میں اُن مردوں کی مذمت کا بیان ہے، جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ان عورتوں کی مذمت کا بیان ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اس باب کی احادیث میں ان پر لعنت کی گئی ہے اور مردوں کا عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان جیسا لباس یا زینت اختیار کی جائے، مثلاً مرد وہ زیور پہنے جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً گلے کا ہار، کانوں کی بالیاں اور بُندے، پازیب، کنگن، ریشمی کپڑوں کا پہننا اور سونے کی انگوٹھی وغیرہ پہننا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو مردوں کے پہننے کے لیے نہیں ہیں اور عورتوں کی مردوں کے ساتھ مشابہت ایسی چیزوں میں ہے جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے مردوں کی مانند جوتے، کپڑے اور پگڑیاں اور دستار وغیرہ پہننا اور اس طرح کا مردانہ لباس پہن کر مردوں کی مجالس میں جانا، یہ ایسی چیزیں ہیں جو عورتوں کے استعمال کے لیے نہیں ہیں''۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد22،ص:63)

اگر مرد کے ہاتھوں پر ایسے بال ہیں کہ وہ بھدے نظر آتے ہیں، جس سے آدمی کریہہ المنظر

ہو جاتا ہے، تو ان کو زائل کرنا درست ہے، لیکن جس طرح آج کل فلموں، ڈراموں اور ٹی وی پروگراموں میں مردوں کا بھی باقاعدہ عورتوں کی طرح باقاعدہ میک اَپ کیا جاتا ہے اور ایک مصنوعی سی شکل بنائی جاتی ہے، جسے آج کل Facial کہتے ہیں، یہ '' تَشَبُّہ بِالنِّسَاء '' کے زمرے میں آئے گا اور ممنوع ہے۔

نعت خوان کے خلاف شرع ریمارکس

سوال:

میں محافل نعت میں بحیثیت نقیبِ محفل شرکت کرتا رہتا ہوں اور میں خود بھی اکثر محافلِ نعت منعقد کراتا ہوں۔ اکثر رشتے داروں اور احباب کے یہاں محافل منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ایک نعت خواں کے وقت کی پابندی نہ کرنے، جھوٹ بولنے اور فقرے بازی کی وجہ سے میں نے اُس کو بلانا چھوڑ دیا، اب جہاں کہیں محفل میں وہ نعت خواں ہوتا ہے، مجھ پر جملے بازی شروع کر دیتا ہے، میں نے یہ طے کیا کہ آئندہ اس نعت خواں کو نہیں سنوں گا۔ جب میں نے یہ عمل کیا تو اُس نے مائک پر بھرے مجمع میں کہا: ''میں جیسے ہی نعت پڑھنے بیٹھتا ہوں، شیطان اٹھ کر چلا جاتا ہے''۔ لوگ اُس نعت خواں کو سمجھانے کے بجائے مجھے یکطرفہ طور پر اُس نعت خواں کو معاف کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور مجھ پر زور دے رہے ہیں کہ میں اُس کے گھر جا کر اُس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں۔ اِس بارے میں شرعی احکام جاننا چاہتا ہوں کہ اُس نعت خواں کے مذکورہ الفاظ کیا حکم رکھتے ہیں؟، (محمد اشرف رشید، کراچی)۔

جواب:

دینِ اسلام ایک مکمل ضابطہ ودستورِ حیات ہے، جس میں ہر شعبۂ زندگی کے افراد کے لیے روشن ہدایات موجود ہیں۔ ہر شخص اَخلاقی اَقدار کا پابند ہے، دوسروں کا احترام لازم ہے، کسی کا تمسخر اُڑانا یا برے القاب سے پکارنا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ

الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ:''اے ایمان والو! مردوں کا کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان (مذاق اڑانے والوں) سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور تم ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے بلاؤ، ایمان کے بعد فاسق کہلانا کتنا برا نام ہے اور جو لوگ توبہ نہ کریں تو وہی ظالم ہیں''۔(الحجرات:11)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَعِّفٍ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ، أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ۔ ترجمہ:''کیا میں تمہیں اہل جنت کی خبر نہ دوں، وہ بہت زیادہ کمزور شخص ہوتا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ (کے کرم پر یقین کامل رکھتے ہوئے) کسی کام کے کرنے کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ وہ کام کر کے اس کو ضرور اس کی قسم میں سچا کردیتا ہے اور کیا میں تمہیں اہل دوزخ کی خبر نہ دوں، وہ ہر بدخصلت، اُجڈ اور متکبر ہوتا ہے''۔(سنن ابن ماجہ:4116)

نعت خوانی دراصل رسول اللہ ﷺ سے عقیدت اور ادب کے اظہار کا ایک سلیقہ ہے، اور اس عقیدت وادب کا تقاضا یہ ہے کہ کلام پڑھنے والے اور سننے والے دونوں ہی باادب ہونے چاہئیں۔ ادب کے یہ تقاضے قرآن وسنّت اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سیکھنے کو ملتے ہیں۔ سچائی، وقت کی پابندی اور عمدہ اخلاق ایک مومن کا زیور ہیں اور تعلیماتِ مصطفیٰ ﷺ کا منشا بھی۔ ثناخوانِ مصطفیٰ ﷺ کو تو ان کمالات سے متصف ہونا ہی چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے:

قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ أَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا، فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهُ: أَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلًا، فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهُ: أَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا، فَقَالَ: لَا۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کہ کیا

مومن جھوٹا ہو سکتا ہے، فرمایا: نہیں''۔

(موطا امام مالک: 2832، 3630، شعب الایمان، جلد 10 ص: 326، رقم الحدیث: 4472)

حدیث پاک میں کسی مسلمان کی تحقیر کو شر سے تعبیر فرمایا ہے:

بِحسبِ امرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَن یَحقِرَ أَخَاهُ المُسلِمَ

ترجمہ: ''کسی مسلمان کے شریر ہونے کے لیے اتنا ثبوت کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے''۔ (صحیح مسلم: 2564)

جو نعت خواں آپ سے نفرت کرتا ہے، اس کی محفل میں آپ کا جانا شرعاً ضروری تو نہیں ہے اور نہ ہی ہر محفلِ نعت میں شریک ہونا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ اگر کوئی شخص کسی محفل وعظ، درس و تدریس یا محفل نعت میں بیٹھا ہے اور اپنی ضرورت کے لیے یا طبیعت کے عدمِ استحضار کی وجہ سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے، تو اس پر ملامت کرنے کا شرعاً کسی کو حق نہیں ہے۔ محفل نعت میں باادب ہو کر بیٹھنا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے اور ترکِ مستحب پر کسی کو ملامت کرنا، اُسے واجب کا درجہ دینا ہے اور یہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اختیار ہے نہ کہ کسی واعظ یا نعت خواں کا۔ ایسے لوگ جو شریعت کے احکام کی پاس داری نہ کریں اور عُجُب، تَعَلِّی اور تَکَبُّر و اِستِکبار میں مبتلا ہوں، ان کو مجالس میں نہیں بلانا چاہیے۔ ایک صحیح العقیدہ مسلمان کو محض ذاتی نفرت کی بنا پر تعریضاً و توریۃً یعنی اشارات و کنایات میں شیطان کہنا، یہ دین پر بہت بڑی جسارت ہے اور اس پر اُسے اُسی مجمع میں توبہ کرنی چاہیے، کیونکہ علانیہ گناہ کی توبہ بھی علانیہ ہوتی ہے۔

کیا یہ ناشکری ہے

سوال:

آج سے دو سال قبل میں دوبئی گیا تھا، ان دو سالوں میں ہر دن یہی سوچتا تھا کہ میں ویزا ختم کر کے اپنے وطن جاؤں گا اور جاب کروں گا۔ دو سال ختم ہو گئے اور میں وطن واپس آ گیا، چھ ماہ سے بے روزگار ہوں۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تم سے ناراض ہے کہ تم نے

رزق کی قدر نہیں کی، کیا میں اللہ کا دیا ہوا رزق ٹھکرا کر واپس آیا ہوں، اس لیے اب مجھے جاب نہیں مل رہی۔ میرے خدشات دور کرنے کے لیے جواب ضرور عنایت فرمائیں۔

(موہن رضا)

جواب:

جی ہاں! اسے آپ ناشکری اور بے تدبیری دونوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ روزی اور روزگار کا کوئی وسیلہ عطا فرمائے تو اُس کی قدر کرنی چاہیے۔ حدیثِ پاک میں ہے: عَنْ نَافِعٍ، قَالَ: كُنْتُ أُجَهِّزُ إِلَى الشَّامِ وَإِلَى مِصْرَ، فَكَانَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ يَرْزُقُ خَيْرًا كَثِيرًا. فَجَهَّزْتُ إِلَى الْعِرَاقِ فَلَمْ يَرْجِعْ رَأْسُ مَالِي، فَدَخَلْتُ عَلَى عَائِشَةَ، فَقَالَتْ: يَا بُنَيَّ، الْزَمْ تِجَارَتَكَ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، يَقُولُ: إِذَا فُتِحَ لِأَحَدِكُمْ رِزْقٌ مِنْ بَابٍ فَلْيَلْزَمْهُ

ترجمہ: حضرت نافع بیان کرتے ہیں: میں سامانِ تجارت لے کر شام اور مصر کی طرف جایا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے کشادہ رزق عطا فرماتا تھا۔ پھر میں سامانِ تجارت لے کر عراق گیا تو اصل مال بھی واپس نہ لا سکا (یعنی اتنا خسارہ ہوا کہ اصل سرمایہ بھی گھٹ گیا)۔ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا میرے ہاں تشریف لائیں تو فرمایا: اے پیارے بیٹے تم اپنی تجارت کا (مصر و شام والا سلسلہ) سلسلہ جاری رکھو، کیونکہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کے لیے رزق کا کوئی دروازہ (یعنی ذریعۂ معاش) کھول دیا جائے (یعنی اللہ کی طرف سے مقدر ہو جائے) تو اسے لازم پکڑو۔ (الآداب للامام بیہقی: 789)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وسیلۂ معاش مقدر ہو جائے اسے بلا وجہ ترک نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ بہتر مُتبادل کی تلاش میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جب تک مُتبادل وسیلۂ روزگار ہاتھ نہ آئے تو پہلے سے دستیاب وسیلے کو چھوڑنا نہیں چاہیے، یہ کسی حد تک ناشکری بھی ہے اور بے تدبیری بھی۔ اپنے وطن سے محبت بلا شبہ قابلِ قدر ہے، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی روزگار کے حصول میں

مشکل پیش آرہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ہر پاکستانی کو پاکستان میں باعزت روزگار ملے اور اُسے بیرونِ ملک طلبِ معاش کے لیے سرگرداں نہ ہونا پڑے۔

اب چونکہ آپ دبئی میں روزگار چھوڑ کر پاکستان آگئے ہیں، توحصولِ روزگار کے لیے جدوجہد کریں اور اللہ تعالیٰ سے رزق کی کشادگی کی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاۙ وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُؕ وَ مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗؕ

ترجمہ: ''اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے (مشکل سے) نکلنے کی کوئی سبیل مقدر فرما دیتا ہے اور اس کو وہاں سے رزق عطا فرما دیتا ہے، جہاں سے اُس کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ اسے کافی ہے، (طلاق:3-2)''۔ ہمارا یہ بھی ایمان ہونا چاہیے کہ جو رزق ہمارے مقدر میں لکھا ہوا ہے، وہ مل کر رہے گا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَاۚ هُوَ مَوْلٰىنَاۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝

ترجمہ: ''آپ فرمائیے! ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، ماسوا اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے، وہی ہمارا مالک ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے (توبہ:51)''۔ توکل کا معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ انسان عمل سے دست بردار ہو جائے اور رزق کے اسباب کو تلاش کرنا چھوڑ دے بلکہ توکل کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق جد وجہد کرے، اسباب کو اختیار کرے اور اپنی محنت کے بارآور ہونے کے لیے اسباب پر نہیں بلکہ خداوند مُسبّبُ الاسباب پر بھروسا کرے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنَّ الرِّزْقَ لَيَطْلُبُ الْعَبْدَ كَمَا يَطْلُبُهُ أَجَلُهُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رزق اسی طرح بندے کے تعاقب میں ہوتا ہے جس طرح موت اس کے تعاقب میں

ہوتی ہے''۔(صحیح ابن حبان:3238)

بعض اوقات انسان کو کامیابی ملنے میں تاخیر ہوجاتی ہے اور انسان بے صبرے پن اور مایوسی کا شکار ہوتا ہے، یہ سوچ اور رویہ درست نہیں ہے، ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی ہے، حدیثِ پاک میں ہے: عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَا تَسْتَبْطِئُوا الرِّزْقَ، فَإِنَّهُ لَنْ يَمُوْتَ الْعَبْدُ حَتّٰى يَبْلُغَهُ آخِرُ رِزْقٍ هُوَ لَهُ، فَأَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ: أَخْذِ الْحَلَالِ وَتَرْكِ الْحَرَامِ۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رزق کے حصول میں تاخیر کو (محرومی) نہ سمجھو، کیونکہ بندہ جب تک کہ اپنے حصے کا مقررہ رزق نہ پالے، اُسے موت ہرگز نہیں آئے گی، سوتم اچھے طریقے سے رزق طلب کرو حلال کو لینے والے اور حرام سے بچنے والے بنو، (صحیح ابن حبان:3239)''۔لہٰذا آپ کو مشورہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر، جو کہ چٹان کے اندر کیڑے کو بھی اُس کے حصے کا رزق پہنچاتا ہے، ایمان پختہ رکھو، اُس کی ذات سے اُمید کا رشتہ قائم رکھو اور فرائض وواجبات اور سُنن ومستحبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ کثرت سے دعا کرو۔

حدیث پاک میں ہے: ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہر رات سورۂ واقعہ پڑھی، وہ کبھی فاقے سے نہیں رہے گا''۔(شعب الایمان:2498)

(۲) ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنی عورتوں کو سورۂ واقعہ سکھاؤ کیونکہ یہ خوشحال کرنے والی سورت ہے''۔(الفردوس بماثور الخطاب:4005)

ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: دنیا نے مجھ سے پیٹھ موڑ لی ہے (یعنی رزق میں برکت نہیں، بہت تنگدست ہوں)، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں وہ تسبیح یاد نہیں جو ملائکہ کی تسبیح ہے؟ جس کی برکت سے روزی دی جاتی ہے، خلقِ دنیا تیرے پاس ذلیل وخوار ہوکر آئے گی، طلوعِ فجر (صبحِ صادق) کے ساتھ سو بار پڑھا کرو:''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ، وَبِحَمْدِهٖ أَسْتَغْفِرُ اللهَ'' سات دن

گزرے تھے کہ وہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: "حضور میرے پاس اس کثرت سے آرہا ہے کہ حیران ہوں کہاں اٹھاؤں کہاں رکھوں"۔

(ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول)

بعد نمازِ عشاء برہنہ سر کھلے آسمان کے نیچے پانچ سو بار روزانہ "یا مُسَبِّبَ الاسباب" اول آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھیے"۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 5، قدیم)

بعد نمازِ فجر 400 مرتبہ یَا رَزَّاقُ یَا اَللّٰهُ" اور بعد نماز عشاء" اَللّٰهُ رَبِّی لَا شَرِیْكَ لَهٗ" 874 مرتبہ پڑھیں اور اپنے مقصد کے لیے دعا کریں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "سورۂ یٰسٓ جس مقصد کے لیے بھی پڑھی جائے اسی کے لیے ہے"۔

نام بگاڑنا

سوال:

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی نسبت سے بچے کا نام حسان رکھا گیا ہے۔اگر کوئی بچے کا نام بگاڑ دے، اُس کو مختصر کر کے حسّو پکارے تو شرعی حکم کیا ہے؟۔

(عبیدالرحمٰن نیازی، گلشن اقبال کراچی)

جواب:

نسبت سے عقیدت کی وجہ سے امت میں نیک لوگوں کے نام پر نام رکھنے کی روایت ہمیشہ موجود رہی ہے، کیونکہ اکابر کے نام پر نام رکھنے میں نسبت کی فضیلت کا حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ شریعتِ مُطہرہ میں برے ناموں سے پکارنے کی ممانعت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ: "اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے بلاؤ، ایمان کے بعد فاسق کہلانا کتنا برا کام ہے اور جو لوگ توبہ نہ کریں تو وہی ظالم ہیں"۔ (الحجرات: 11)

نام کی تصغیر یعنی مختصر کرنا درست نہیں ہے بلکہ اگر اسماء الٰہیہ میں سے نام ہو اور قصداً اس کی تصغیر کی گئی ہو تو کفر ہے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

''ہاں اس زمانہ میں چونکہ عوام میں ناموں کی تصغیر کرنے کا بکثرت رواج ہو گیا ہے، لہٰذا جہاں ایسا گمان ہو ایسے نام سے بچنا ہی مناسب ہے۔ خصوصاً جب کہ اسماء الٰہیہ کے ساتھ عبد کا لفظ ملا کر نام رکھا گیا، مثلاً عبدالرحیم، عبدالکریم، عبدالعزیز کہ یہاں مضاف الیہ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور ایسی صورت میں تصغیر اگر قصداً ہوتی تو معاذ اللہ کفر ہوتی، کیونکہ یہ اس شخص کی تصغیر نہیں بلکہ معبود برحق کی تصغیر ہے مگر عوام اور ناواقفوں کا یہ مقصد یقیناً نہیں ہے، اسی لیے وہ حکم نہیں دیا جائے گا بلکہ ان کو سمجھایا اور بتایا جائے اور ایسے موقع پر ایسے نام ہی نہ رکھے جائیں جہاں یہ احتمال ہو''۔ (بہارِ شریعت، جلد سوم، ص:602)

خلاصۂ کلام یہ کہ نام کا بگاڑنا، کسی کو برے نام یا نسبت سے پکارنا، سوائے اس کے وہ نام ان شخصیات کا عرف بن چکے ہوں، جیسے حداد، قدوری، حافی، غزالی، قصاف وغیرہ۔ لہٰذا حسان نام کو بگاڑ کر حَسُّو پکارنا بھی ناپسندیدہ ہے، ان کو نرمی اور حکمت سے سمجھایا جائے، اس پر کوئی فتویٰ لگانا درست نہیں ہے۔

عائشہ نام رکھنا

سوال:

میرا بیٹا خرم حسن کینیڈا میں مقیم ہے، اُن کی پہلی بیٹی کا نام سعدیہ ہے اور دوسری کا نام عائشہ رکھا ہے۔ میرے بیٹے نے معلوم کیا ہے کہ عائشہ نام کیسا ہے؟۔ کیونکہ وہ زیادہ چست، ہوشیار محسوس نہیں ہوتی، کیا اس کا نام تبدیل کر دیا جائے؟، (مخدوم صدیقی، کراچی)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّکُمْ تُدْعَوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِاَسْمَائِکُمْ وَاَسْمَاءِ آبَائِکُمْ، فَاَحْسِنُوْا اَسْمَاءَ کُمْ ترجمہ: ''تم قیامت کے دن اپنے ناموں اور اپنے باپوں کے ناموں سے پکارے جاؤ گے، سو اپنے اچھے نام رکھو، (سُنن ابوداؤد: 4938)''۔ اس سے معلوم ہوا

کہ قیامت کے دن حضرت آدم علیہ السلام کے استثناء کے ساتھ ہر ایک کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا اور یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ ماں کے نام سے پکارا جائے گا، درست نہیں ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ماں کے نام سے پکارا جانا اُن کا اعزاز و اختصاص ہے، کیونکہ اُن کی ولادت اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خرقِ عادت کے طور پر باپ کے بغیر ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تَسَمَّوا بِأَسْمَاءِ الْأَنْبِيَاءِ، وَأَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللهِ: عَبْدُ اللهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ. وَأَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَهَمَامٌ. أَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَمُرَّةٌ۔

ترجمہ: ''انبیاءِ کرام کے نام پر اپنے (بچوں کے) نام رکھو، اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں اور سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں اور سب سے برے نام حرب اور مُرّہ ہیں''۔ (سُنن ابوداؤد:4940)

''هَمَامٌ'' کے معنیٰ ہیں: کسی بات کا ارادہ کر کے اُسے کرگزرنے والا، یعنی اُولُوالْعَزْم اور ہُمام کے معنیٰ ہیں: بلند ہمت بادشاہ، سخی سردار، شیر وغیرہ اور حارث کے معنیٰ کاشت کرنے کے ہیں اور یہ شیر کی کُنیت بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ شجاعت کے معنیٰ میں ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دینی اکابر کے نام پر نام رکھنا چاہیے اور اس صورت میں معنیٰ کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ نسبت کا اعتبار ہوگا۔ پس عائشہ نام کو اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نسبت ہے اور اس لحاظ سے یہ پسندیدہ نام ہے۔ عائشہ معنوی اعتبار سے طویل زندگی اور اچھے حالات سے عبارت ہے، اس بابرکت نام کو بدلنا نہیں چاہیے، یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ دین کا مسئلہ جاہل عاملوں کی بجائے علماءِ کرام سے پوچھنا چاہیے۔ اگر نام کے معنیٰ نامناسب ہوں اور کسی مُقدّس شخصیت سے نسبت بھی نہ ہو تو اُسے بدل دینا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے: سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں:

أَنَّ جَدَّهُ حَزْنًا قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: مَا اسْمُكَ قَالَ: اِسْمِي حَزْنٌ، قَالَ: بَلْ أَنْتَ سَهْلٌ قَالَ: مَا أَنَا بِمُغَيِّرٍ اِسْمًا سَمَّانِيهِ أَبِي، قَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ: فَمَا زَالَتْ فِينَا

اَلْحُزُوْنَةُ بَعْدُ۔

ترجمہ: ''اُن کے دادا کا نام حَزْن تھا، وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟، اُنہوں نے عرض کی: میرا نام حَزْن ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلکہ تم سَہل ہو، اُنہوں نے عرض کی: میں اپنے باپ کے رکھے ہوئے نام کو تبدیل نہیں کروں گا، سعید بن مُسیّب بیان کرتے ہیں کہ ہمارے خاندان کے مزاج میں ہمیشہ سختی رہی ہے''۔(صحیح بخاری:6193)

حَزْن کے معنی سختی کے ہیں اور سَہل کے معنیٰ نرمی کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں نام کے معنوی اَثرات مُرتب ہوسکتے ہیں، اگرچہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ برے نام کو تبدیل فرمادیتے تھے''۔

(سُنن ترمذی:2839)

رسول اللہ ﷺ نے جو نام تبدیل فرمائے وہ یہ ہیں: ''آپ نے اصرم (یہ صَرم یعنی کاٹنے کے معنیٰ میں اسمِ تفضیل ہے) نام کو بدل کر ''زرعہ'' رکھا، اس کے معنیٰ بیج کے ہیں یعنی قابلِ کاشت زمین۔ اسی طرح آپ نے عاص، عزیز، عَتَلہ، شیطان، حَکم، غُراب (دوری، کوا)، حُباب (شیطان کا نام) اور شہاب (آگ کا شعلہ) ناموں کو بھی تبدیل فرمایا۔ عاص کا مادہ اگر عصیان ہوتو اس کے معنی ہیں نافرمان۔ عزیز کے معنیٰ ہیں غالب اور یہ اللہ کی صفت ہے، بندے کی صفت عبد ہے جو تذلُّل، تواضع اور خشوع وخُضوع کے معنی میں آتا ہے، لہٰذا عبدالعزیز نام رکھنا چاہیے، عَتَلہ کے معنیٰ سختی کے ہیں۔

حضرت زینب بیان کرتی ہیں کہ میرا نام ''بَرّہ'' (بہت نیک) رکھا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اپنی پاکیزگی (پارسائی) کا دعویٰ نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، پاک فرماتا ہے''۔(۲) اور تم میں سے نیکو کاروں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، (صحیح بخاری:6192)''۔ سو ایسے نام جن میں برتری کا دعویٰ ہو، رسول اللہ ﷺ نے اسے ناجائز نہیں کہا۔ رسول اللہ ﷺ کی نانی کا نام ''بَرّہ'' (بمعنی نیکوکار) تھا، لیکن یہ

اسلام سے پہلے کا دور تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مطلقاً ممانعت بھی نہیں فرمائی۔ اسی طرح ایک اور خاتون کا نام ''بَرّہ'' تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اُسے تبدیل کر کے ''جویریہ'' رکھ دیا، کیونکہ حضور اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی کہے: بَرّہ یعنی نہایت نیکوکار خاتون چلی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے عاصیہ (نافرمان) نام کو بدل کر جمیلہ رکھا۔ آپ ﷺ کے سامنے مُنذر بن اُسید (ڈرانے والا) کو لایا گیا، آپ نے اُسے اپنی گود میں لیا اور فرمایا: ''یہ مُنذر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرا ہوا۔ آپ ﷺ نے حَکَم (حاکم کے معنی میں) نام کو بھی پسند نہیں فرمایا اور اُسے تبدیل کر دیا، اسی طرح آپ ﷺ نے ''اَجدَع'' (جس کی نسل ختم ہو جائے یا جو حُجّت میں لاجواب ہو جائے)۔ آپ ﷺ نے مَلِکُ المُلُوک یا شہنشاہ نام کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ بادشاہوں کا بادشاہ یا حقیقی بادشاہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات ناموں سے نیک فال لیتے تھے، جیسے صلح حدیبیہ کے موقع پر سُہیل بن عمرو قریشِ مکہ کا سفارتی نمائندہ بن کر آیا تو آپ نے اس سے نیک فال مراد لی اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارا معاملہ آسان کر دیا''۔ (سُبلُ الھدیٰ والرشاد، جلد 5، ص:52)

غیر قانونی واٹر کنکشن کا مسئلہ

سوال:

کراچی شہر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے 200 کلومیٹر دور سے پانی لایا جاتا ہے، پانی لانے اور شہر کے اندر دور دراز علاقوں تک پہنچانے کے لیے بجلی یا ڈیزل جنریٹر سے چلنے والے پمپس کے ذریعے شہریوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ان کاموں کے لیے ہزاروں کی تعداد میں عملہ رکھا جاتا ہے۔ اربوں روپے سالانہ اخراجات ہوتے ہیں، جو شہریوں کی طرف سے کنکشن فیس اور ٹیکس کی ادائیگی کی صورت میں جمع ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مساجد، امام بارگاہوں اور دیگر عبادت گاہوں میں حکومتی طریقہ کار کو نظر انداز کر کے غیر قانونی کنکشن لینے کی ازروئے شرع کیا حیثیت ہے؟۔ کیا ان اداروں کی انتظامیہ کو ماہانہ ٹیکس کی عدم ادائیگی کی اجازت ہے؟۔ چونکہ فقہاء نے قبضے کی زمین پر بنائی گئی مسجد میں

نماز کو جائز قرار نہیں دیا ہے، تو کیا ناجائز کنکشن کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے؟۔ اور ایسی مساجد جہاں چوری کے کنکشن لیے گئے ہوں، نماز کی ادائیگی درست ہے؟۔

(مصباح الدین فرید، مینجنگ ڈائرکٹر کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ)

جواب:

پانی کا غیر قانونی کنکشن خواہ وہ کسی بھی مقصد کے لیے لیا جائے، ناجائز ہے۔ مسلمان کو اپنی عزتِ نفس کے تحفظ کے لیے اور قانون شکنی کی صورت میں ممکنہ ذلت سے بچنے کے لیے ملک کے ان تمام قوانین کا احترام کرنا چاہیے جو شریعت کے احکام سے متصادم نہیں ہیں۔ حدیث پاک میں ہے:

لَایَنبغِی لِلمُؤْمِنِ أَن یُذِلَّ نَفسَهُ، قَالُوا: وَکَیفَ یُذِلُّ نَفسَهُ؟، قَالَ: یَتَعَرَّضُ مِنَ البَلَاءِ لِمَا لَایُطِیقُ۔

ترجمہ: ''مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خود کو ذلیل ورسوا کرے، صحابہ نے عرض کی: (یارسول اللہ!) وہ کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ خود کو ایسی مشکل سے دوچار کرے، جس سے عہدہ برا ہونے کی وہ طاقت نہیں رکھتا''۔

(سُنن ترمذی: 2254)

پس ملکی قوانین کی پاس داری ہر شخص پر لازم ہے۔ اسلام قطعاً کسی نیکی کی آڑ میں گناہ یا قانون شکنی کے ارتکاب کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا مسجد، امام بارگاہ یا عبادت گاہ یا دیگر رفاہی اداروں کے لیے غیر قانونی کنکشن لینا ناجائز ہے۔ دینی ودنیوی اُمور میں غیر قانونی طرزِ عمل کو جواز کی سند عطا کرنا اور اس کے لیے حیلے سے کام لینا جائز نہیں ہے۔ ایک سچا مومن کبھی کسی بھلائی کو پانے کے لیے برائی کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ یقینی طور پر حکومتی و ریاستی ٹیکس کی ادائیگی مفادِ عامہ کے لیے بنائے جانے والے منصوبوں کی تکمیل، اُن پر ہونے والے اخراجات اور شہری ضروریات کے عوام الناس تک بلاتعطّل فراہمی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم حکومت کو اور قانونی طور پر بجلی، پانی اور گیس فراہم کرنے

والے اداروں کو مساجد، امام بارگاہوں اورعوامی عطیات سے چلنے والے اداروں کو خصوصی رعایت Subsidy دینی چاہیے۔

جہاں تک وضو کی درستگی اور نماز کی ادائیگی کا سوال ہے، سواگر نماز تمام فقہی اصولوں اور شرعی اَحکام کے مطابق صحیح طور پر ادا کی جارہی ہے، تو فقہی طور پر کہا جائے گا کہ نماز درست ہے اور نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی اور بندہ ادائے فرض سے بری الذمہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت اُس کی رضا پر موقوف ہے اور اس کا علم اسی کے پاس ہے۔ دنیا میں حکم ظاہر پر لگایا جاتا ہے، باطن کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے۔ تاہم اکلِ حرام اور کسبِ حرام کا اثر عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر یقیناً مرتب ہوتا ہے، حدیث پاک میں ہے: عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ''لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ، وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ''۔ ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں''۔ (سنن ترمذی:1)

عام نمازی جن کا مسجد میں پانی کی چوری سے کوئی تعلق نہیں، نہ اُن کی مرضی سے یہ عمل کیا جاتا ہے، اُن کی نمازوں پر سوال اٹھانا بے محل ہے۔ آپ مُجاز ادارے کے سربراہ ہیں اور آپ اپنے اختیارات سے مساجد وامام بارگاہوں کے لیے رعایت کا راستہ نکال سکتے ہیں، یہ آپ کا نیکی کے کام میں تعاون ہوگا۔

پانی کی چوری کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ پانی کے ضیاع کا بھی ہے اور اس میں جتنا کردار عوام کا ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ پانی کی فراہمی کے حکومتی ادارے Water & Sewerage Board کا عملہ اس کا ذمے دار ہے۔ آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کہیں پانی کی سپلائی لائن یعنی پائپ میں رساؤ (Leakage) شروع ہوجائے تو کئی دنوں یا ہفتوں یا مہینوں تک کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ اور نہ صرف یہ کہ پانی کا ضیاع ہوتا ہے بلکہ نئی تعمیر شدہ سڑکیں تباہ وبرباد ہوجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ پانی کی

ترسیل کے غیر قانونی نلکے (Hydrant) جا بجا لگے ہوئے ہیں، جہاں سے کاروباری بنیادوں پر پانی کے ٹینکر بھرے جاتے ہیں اور فروخت کیے جاتے ہیں، اس کاروبار کو قانونی شکل دیدی جائے تو بہتر ہے، ورنہ واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کا عملہ جو واٹر لائن کی حفاظت پر مامور ہے، شریکِ جرم سمجھا جائے گا۔

آپ نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے دلیل کے طور پر یہ لکھا کہ ''فقہاء نے قبضے کی زمین پر بنائی گئی مسجد میں نماز کو جائز قرار نہیں دیا''، درست نہیں۔ فقہ حنفی میں غصب شدہ زمین پر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اَلصَّلٰوۃُ فِیْ أَرْضٍ مَغْصُوبَۃٍ جَائِزَۃٌ وَلٰکِنْ یُعَاقَبُ بِظُلْمِہٖ فَمَا کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ تَعَالٰی یُثَابُ وَمَا کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْعِبَادِ یُعَاقَبُ کَذَا فِی ''مختار الفتاوی''۔

ترجمہ: ''غصب شدہ زمین میں نماز جائز تو ہے (یعنی پڑھنے سے ادا ہو جائے گی) لیکن ظلماً زمین غصب کرنے کے سبب اس کو سزا دی جائے گی۔ جو کچھ اُس بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے، (اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اُسے نماز کا) ثواب دے گا اور جو کچھ اُس کے اور بندوں کے درمیان ہے، اس کا مواخذہ کیا جائے گا، جیسا کہ ''مختار الفتاویٰ'' میں ہے، ایسے تمام مقامات پر شرائط وارکانِ صلاۃ کے پائے جانے کی وجہ سے نماز جائز ہے لیکن غیر مکروہ طریقے سے نماز کا اعادہ بہتر ہے، جو نماز کراہت کے ساتھ ادا کی گئی ہو اُس کا یہی حکم ہے۔ ہدایہ میں اسی طرح مذکور ہے، اگر کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہو تو نماز واجب الاعادہ ہے اور کراہتِ تنزیہی کی صورت میں اعادہ مستحب ہے کیونکہ کراہت تحریمی کا ممنوعات میں وہی درجہ ہے جو مامورات میں واجب کا ہے، ''فتح القدیر'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:109، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ طحطاوی متوفیٰ 1231ھ لکھتے ہیں: (وَ) یُکْرَہُ فِی (أَرْضِ الْغَیْرِ بِلَا رِضَاہُ)

ترجمہ: ''کسی شخص کی زمین پر اُس کی مرضی کے بغیر نماز پڑھنا مکروہ ہے، (حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 1، ص:484)''۔ پس آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ غصب شدہ زمین پر نماز مکروہ ہے۔

الغرض مساجد یا عبادت گاہوں کے منتظمین کے لیے بلاشبہ قانون شکنی کی اجازت نہیں ہے اور انہیں قانونی طریقے سے مُجاز ادارے سے اس کی اجازت لینی چاہیے۔ لیکن حکومت اور حکومتی اداروں پر بھی لازم ہے کہ مساجد کو مفت یا نہایت مناسب نرخوں پر یہ سہولتیں فراہم کریں اور انہیں ٹیکس سے مُستثنیٰ قرار دیں۔ کیونکہ دستورِ پاکستان کی رُو سے یہ حکومت کی ذمے داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے سہولتیں فراہم کرے۔ ہم نے اپنے دارالعلوم نعیمیہ اور جامع مسجد اقصیٰ کے لیے کنویں کھودے ہوئے ہیں، ان کی کھدائی اور دیگر تمام مصارف ان اداروں نے اپنے وسائل سے ادا کیے ہیں اور ان کنووں سے موٹروں کے ذریعے پانی نکالا جاتا ہے اور ان کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ سال دو سال بعد جب یہ خشک ہونے لگتے ہیں تو انہیں مزید گہرا کیا جاتا ہے۔ ہمارے اداروں میں واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کی واٹر سپلائی لائن سے پانی کا کوئی قانونی یا غیر قانونی کنکشن نہیں ہے، اس کے باوجود وقتاً فوقتاً بھاری بل بھیج دیے جاتے ہیں جو ہم نہیں ادا کر پاتے اور واٹر بورڈ کا پانی استعمال نہ کرنے کے باوجود بل بھیجنا اور قیمت طلب کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ ہم آلودگی کے نکاس کے لیے واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کی سیوریج لائن استعمال کرتے ہیں، اس کے لیے مناسب رقم پر مشتمل بل بھیجیں تاکہ ہم ادا کریں اور اپنی شرعی اور قانونی ذمے داری سے بری الذمہ ہوں۔

غیر قانونی طور پر قبضہ کیے ہوئے پلاٹوں پر خواہ مساجد بنائی گئی ہوں یا رہائشی مکانات، اس کا سبب بھی متعلقہ اداروں کی غفلت ہے، جو ان زمینوں کے کسٹوڈین اور محافظ ہیں کہ وہ بروقت کارروائی کر کے غیر قانونی تجاوزات کا سدِّ باب نہیں کرتے، اس لیے وہ بھی شریکِ جرم قرار پاتے ہیں، ورنہ ڈی ایچ اے، کنٹونمنٹ اور دیگر منظم سوسائٹیوں میں اس طرح کی غیر قانونی تجاوزات کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

محفلِ قراءت ونعت میں تالیاں بجانا

سوال:

آج کل بعض اسکولوں میں کوئی دینی پروگرام بھی ہو، کوئی بچہ نعت پڑھے یا تقریر کرے تو استاذ داد دینے کے لیے تالیاں بجاتے ہیں، کیا ایسا کرنا درست ہے؟۔

(محمد ایوب، نکیال آزاد کشمیر)

جواب:

(عبادت کی نیت سے) تالیاں بجانا شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے، اور قرآن مجید میں بیت اللہ کے پاس تالیاں بجانے کو کفار کا شِعار قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝

ترجمہ: ''اور بیت اللہ کے پاس اُن کی نماز اس کے سوا کیا تھیں کہ یہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، سو اب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے''۔ (الانفل:35)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں: قرآن مجید نے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کی جو مذمت کی ہے، اِس میں اُن جاہل صوفیہ کا رد ہے، جو رقص کرتے ہیں، تالیاں پیٹتے اور بے ہوش ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں''۔

(الجامع الاحکام القرآن، جز9،ص:399، موسسۃ الرسالہ، بیروت)

شریعت مُطہّرہ میں تالیاں بجانے کو مکروہ عمل فرمایا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (وَكُرِهَ كُلُّ لَهْوٍ) أَيْ كُلُّ لَعِبٍ وَعَبَثٍ، فَالثَّلَاثَةُ بِمَعْنًى وَاحِدٍ كَمَا فِي ''شَرْحِ التَّأْوِيلَاتِ''، وَالْإِطْلَاقُ شَامِلٌ لِنَفْسِ الْفِعْلِ، وَاسْتِمَاعِهِ كَالرَّقْصِ وَالسُّخْرِيَةِ وَالتَّصْفِيقِ وَضَرْبِ الْأَوْتَارِ مِنَ الطُّنْبُورِ وَالْبَرْبَطِ وَالرَّبَابِ وَالْقَانُونِ وَالْمِزْمَارِ وَالصَّنْجِ وَالْبُوقِ، فَإِنَّهَا كُلَّهَا مَكْرُوهَةٌ لِأَنَّهَا زِيُّ الْكُفَّارِ،

ترجمہ: ''(ہر بیہودہ کھیل مکروہ ہے) یعنی ہر لہو ولعب اور عَبَث (بے مقصد کام) تینوں (یعنی لَہو، لَعب اور عبث) معنیٰ ایک ہیں، جیسا کہ ''شرح التاویلات'' میں ہے۔ لہو کو مطلق (یعنی

کسی قید کے بغیر) ذکر کرنا نفسِ فعل اور اس کی توجہ سے سماعت کو شامل ہے، جیسے رقص کرنا، مذاق کرنا اور تالیاں بجانا، ڈھول بجانا، ستار بجانا، سارنگی بجانا، چنگ بجانا، قانون (ایک تار والا باجا) بجانا، مزامیر کا استعمال، جھانجھ (مجیرا) بجانا اور بگل بجانا، یہ سب مکروہ ہیں کیونکہ یہ عاداتِ کفار ہیں''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9،ص:481)

تلاوتِ قرآن مجید، حمد ونعت سنتے وقت ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پوری طرح سے مُتوجہ ہو کر غور سے سنے اور اگر کہیں تحسین کرنا چاہتا ہو تو ''سبحان اللہ، ماشاءاللہ'' کہہ سکتا ہے۔ لیکن تالیاں بجا کر دینی ماحول کو لغویات وخرافات سے آلودہ کرنا اور نیکی کمانے کے بجائے الٹا گنہگار ہونا عقل ودانش کے خلاف ہے۔

آج کل دنیاوی مجالس میں کسی کو داد دینے اور تحسین وستائش کے لیے تالیاں بجائی جاتی ہیں، یہ اگرچہ پسندیدہ چیز نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ ہمارے معاشرے میں اور عالمی سطح پر بھی عرف بن چکا ہے، اس لیے اسے مباح ہی سمجھا جائے گا، کیونکہ یہ کسی کا مذہبی شِعار نہیں ہے۔

محافلِ میلاد میں منکرات کا ارتکاب

سوال:

میلاد شریف کے جلسوں میں دَف کا اہتمام کیا جانا اور جشنِ میلاد شریف کے جلوسوں میں تالیاں بجانا، ڈھول اور رقص پر اصرار کیا جانا، شریعتِ مُطہرہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے، کیا کہیں کوئی جواز کی صورت ہے یا دودھ وشہد میں نجاست و پلیدی ڈالنا اور حلال کو حرام کرنا ہے؟۔ دَف والی حدیث کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے، اس حدیث کی روشنی میں مباح سمجھا جائے یا حدیث کو منسوخ سمجھا جائے یا پھر خصوصیت پر محمول کیا جائے؟۔ بعض حضرات صوفیہ کے سازوں کے ساتھ قوالی سننے کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں،

(تنظیمات اہل السنۃ والجماعۃ، سرگودھا)

جواب:

میلاد النبی ﷺ کے جلسوں اور جلوس کا محرمات، مکروہات سے پاک ہونا ہی

رسول اللہ ﷺ سے حقیقی محبت کا ثبوت ہے کہ آپ کی بعثتِ مبارکہ کا مقصد ظلمت و جہالت کو دور کرنا اور اَحکامِ الٰہی کا پابند بنانا ہے، لوگوں کی رذیل صفات کو حسنِ اَخلاق میں بدل دینا ہے۔ رسالت مآب ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے دن کا اکرام اُنہی شرعی تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے، جو رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام علیہم الرضوان کی مجالس میں نظر آتے ہیں۔ اُس سے ہٹ کر کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب دعویٔ عشق و محبت رسول ﷺ کے خلاف ہے۔ میلاد النبی ﷺ کے جلوس نہ ضروریاتِ دین سے ہیں اور نہ ہی ضروریاتِ مسلک اہل السنۃ والجماعہ سے، البتہ یہ برصغیر میں شعائرِ اہلسنّت سے ہیں، یہ اگر محرمات، بدعات اور مُنکَرات سے پاک ہوں تو زیادہ سے زیادہ استحباب واستحسان کے درجے میں قرار دیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ۔

ترجمہ: ''تم میں سے کوئی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اُس کی خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہوجائے، (شرح السنۃ للبغوی، رقم الحدیث: 104)''۔ حدیث کا واضح مفہوم یہی ہے کہ کامل ایمان کی علامت یہ ہے کہ انسان کا ہر قول وفعل، معاملات ومعمولات اور خواہشات رسول اللہ ﷺ کے اَحکام کے مطابق ہونی چاہییں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے دینی امور کو قرآن وسنّت میں بیان کردہ حقائق کی روشنی میں طے کرنے کے بجائے اپنی وضع کردہ عقیدتوں اور خواہشات کی نذر کردیے ہیں اور عقیدے وعقیدت کا تعین ایک ایسا طبقہ کرتا ہے، جو دینی فہم سے عاری ونابلد ہے۔

محافل میلاد کے نام پر مُقدّس محافل کی آڑ میں بڑے بڑے کاروبار کیے جارہے ہیں، بعض مقامات پر نعت خوانوں اور شعلہ بیان مقررین (جن کی اکثریت موضوع روایات کا سہارا لیتی ہے) کی ایجنٹوں کے ذریعے لاکھوں میں بکنگ ہورہی ہے، کسی زمانے میں شہر بھر میں سیاسی لیڈروں کی بڑی بڑی قدآور تصاویر لگائی جاتی تھیں، اب واعظین اور نعت خواں

حضرات کی تصاویر صرف بازاروں اور چوراہوں تک محدود نہیں بلکہ مساجد کے صدر دروازوں پر بھی آویزاں نظر آتی ہیں۔ انگلینڈ سے فون آیا کہ اب پیر صاحبان کی تصاویر مساجد کے اندر آویزاں کی جارہی ہیں۔

ہمیں حال ہی میں سوشل میڈیا پر ایک باریش پیر کو جُبّے قُبّے کے ساتھ غیر محرم جوان عورتوں کے ساتھ بلاحجاب رقص کرتے ہوئے دکھایا، وہ ان کے ہاتھ پکڑے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی وہ انہیں بوسہ دیتی ہیں، یہ حرام ہے۔ جب ابتذال اس حد تک پہنچ جائے تو علماءِ کرام کو تمام مصلحتوں سے بالاتر ہوکر شدت کے ساتھ اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔

کفار بیت اللہ شریف کے پاس تالیاں بجاتے اور اسے عبادت شمار کرتے تھے، قرآن مجید میں اسے کفر قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۝

ترجمہ: ''اور بیت اللہ کے پاس اُن کی نماز اس کے سوا کیا تھیں کہ یہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، سو اب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے''۔(الانفال:35)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں: قرآن مجید نے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کی جو مذمت کی ہے، اس میں اُن جاہل صوفیہ کا رد ہے، جو رقص کرتے ہیں، تالیاں پیٹتے اور بے ہوش ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں (جسے وَجد نہیں بلکہ تواجد سے تعبیر کیا گیا ہے)''۔

(الجامع الاحکام القرآن، جز9 ص: 399، موسسۃ الرسالہ، بیروت)

شریعت مُطَہّرہ میں تالیاں بجانے کو مکروہ عمل فرمایا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (وَكُرِهَ كُلُّ لَهْوٍ) أَيْ كُلُّ لَعِبٍ وَعَبَثٍ، فَالثَّلَاثَةُ بِمَعْنًى وَاحِدٍ كَمَا فِي ''شَرْحِ التَّأْوِيلَاتِ''، وَالْإِطْلَاقُ شَامِلٌ لِنَفْسِ الْفِعْلِ، وَاسْتِمَاعِهِ كَالرَّقْصِ وَالسُّخْرِيَةِ وَالتَّصْفِيقِ وَضَرْبِ الْأَوْتَارِ مِنَ الطُّنْبُوْرِ وَالْبَرْبَطِ وَالرَّبَابِ وَالْقَانُوْنِ وَالْمِزْمَارِ وَالصَّنْجِ وَالْبُوْقِ، فَإِنَّهَا كُلَّهَا مَكْرُوْهَةٌ لِأَنَّهَا زِيُّ الْكُفَّارِ،

ترجمہ: ''(ہر بیہودہ کھیل مکروہ ہے) یعنی ہر لہو ولعب اور عَبَث (بے مقصد کام) تینوں (یعنی

لہو، لَعِب اور عبث) کے معنیٰ ایک ہیں، جیسا کہ "شرح التاویلات" میں ہے۔ لہو کو مطلق (یعنی کسی قید کے بغیر) ذکر کرنا نفسِ فعل اور اس کی توجہ سے سماعت کو شامل ہے، جیسے رقص کرنا، مذاق کرنا اور تالیاں بجانا، ڈھول بجانا، ستار بجانا، سارنگی بجانا، چنگ بجانا، قانون (ایک تار والا باجا) بجانا، مزامیر کا استعمال، جھانجھ (مجیرا) بجانا اور بگل بجانا، یہ سب مکروہ ہیں کیونکہ یہ عاداتِ کفار ہیں"۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 481)

گانے کی دھن پر بنائی گئی موسیقی اور آلاتِ موسیقی کے ساتھ نعت پڑھنا، پڑھوانا اور سننا سب ناجائز ہے، علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ الباری لکھتے ہیں:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ عَلٰی ضَرْبِ الدَّفِّ وَالْقَضِیْبِ یَکْفُرُ. قُلْتُ وَیَقْرُبُ مِنْهُ ضَرْبُ الدَّفِّ وَالْقَضِیْبِ مَعَ ذِکْرِ اللهِ تَعَالٰی وَنَعْتِ الْمُصْطَفٰی صلی اللہ علیہ وسلم،

ترجمہ: "جس نے دَف اور ڈانڈیا کے ساتھ قرآن کی تلاوت کی (وہ توہینِ قرآن کی وجہ سے) کفر کا مرتکب ہوا، میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں: اسی حکم کے قریب دَف اور ڈانڈیا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر یا نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنا بھی ہے"۔ (الفقہ الاکبر: 167)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ مکمل ضابطہ اور دستور ہے، احادیثِ مبارکہ میں صرف چند مواقع ایسے ملتے ہیں، جہاں دف بجائی جارہی تھی، آپ نے اُن مواقع پر کسی خاص سبب سے اعراض نہ کیا۔ لیکن آج تسکینِ نفس کی تکمیل کے لیے ہر شخص اسے سنت سے ثابت کرنے پر تلا رہتا ہے، جبکہ حدیث پاک میں ہے: "بُعِثْتُ بِکَسْرِ الْمَزَامِیْرِ (یعنی مجھے آلاتِ موسیقی کو توڑنے والا بناکر بھیجا گیا) کے کلمات بھی آئے ہیں"۔

(کنزالعمال: 40689)

(۱) حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک معرکہ سے واپس لوٹے تو ایک سیاہ رنگ کی بچی آکر کہنے لگی: یَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنِّیْ کُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ رَدَّكَ اللهُ سَالِمًا اَنْ اَضْرِبَ بَیْنَ یَدَیْكَ بِالدُّفِّ وَاَتَغَنّٰی؟، فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنْ کُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِیْ وَاِلَّا فَلَا، فَجَعَلَتْ تَضْرِبُ فَدَخَلَ اَبُوْبَکْرٍ وَهِیَ تَضْرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ

عَلِيٌّ وَهِيَ تَضرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ عُثمَانُ وَهِيَ تَضرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَأَلقَتِ الدُّفَّ تَحتَ استِهَا، ثُمَّ قَعَدَت عَلَيهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنَّ الشَّيطَانَ لَيَخَافُ مِنكَ يَا عُمَرُ إِنِّي كُنتُ جَالِسًا وَهِيَ تَضرِبُ فَدَخَلَ أَبُوبَكرٍ وَهِيَ تَضرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ وَهِيَ تَضرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ عُثمَانُ وَهِيَ تَضرِبُ، فَلَمَّا دَخَلتَ أَنتَ يَا عُمَرُ أَلقَتِ الدُّفَّ۔

ترجمہ: ''یارسول اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح سلامت لوٹا دے تو میں آپ کے سامنے دف بجاؤں گی اور گیت گاؤں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم نے نذر مانی تھی تو تو پھر دف بجالو ورنہ نہیں۔ وہ لڑکی دف بجانے لگی، اس اثنا میں حضرت ابوبکر تشریف لائے، وہ دف بجاتی رہی، پھر حضرت علی تشریف لائے، وہ دف بجاتی رہی، پھر حضرت عثمان تشریف لائے، وہ تب بھی دف بجاتی رہی۔ پھر حضرت عمر داخل ہوئے تو وہ دف کو اپنے سرین کے نیچے چھپا کر اُس پر بیٹھ گئی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: اے عمر! تم سے شیطان ڈرتا ہے، میں بیٹھا تھا، یہ دف بجاتی رہی، پھر ابوبکر آئے، یہ دف بجاتی رہی، پھر علی آئے، یہ دف بجاتی رہی، پھر عثمان آئے یہ دف بجاتی رہی اور پھر اے عمر جب تم آئے تو اس نے دف رکھ دی''۔ (سُنن ترمذی: 3690)

(۲) قَالَتِ الرُّبَيِّعُ بِنتُ مُعَوِّذِ بنِ عَفرَاءَ: جَاءَ النَّبِيُّ ﷺ فَدَخَلَ حِينَ بُنِيَ عَلَيَّ، فَجَلَسَ عَلَى فِرَاشِي كَمَجلِسِكَ مِنِّي، فَجَعَلَت جُوَيرِيَاتٌ لَنَا، يَضرِبنَ بِالدُّفِّ وَيَندُبنَ مَن قُتِلَ مِن آبَائِي يَومَ بَدرٍ، إِذ قَالَت إِحدَاهُنَّ: وَفِينَا نَبِيٌّ يَعلَمُ مَا فِي غَدٍ، فَقَالَ: دَعِي هٰذِهِ، وَقُولِي بِالَّذِي كُنتِ تَقُولِينَ۔

ترجمہ: ''ربیع بنت معوذ بن عفراء بیان کرتی ہیں کہ جب میں دلہن بنا کر بٹھائی گئی تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، آپ بستر پر ایسے تشریف فرما ہوئے جیسے تم لوگ بیٹھتے ہو۔ پھر کچھ لڑکیاں دف بجانے لگیں اور میرے والد اور چچا جو جنگِ بدر میں شہید ہوئے تھے، اُن کی تعریف کرنے لگیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا: ''ہم میں وہ نبی ہیں جو آنے والے کل کی بات جانتے ہیں''، آپ ﷺ نے فرمایا: اسے چھوڑ دو اور وہ گاؤ جو تم پہلے

گا رہی تھیں''۔(صحیح بخاری:5147)

فی نفسہٖ دف بجانا مشروع ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَعْلِنُوا ھٰذَا النِّکَاحَ وَاجْعَلُوْہُ فِی الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْہُ عَلَیْہِ بِالدُّفُوْفِ (اس نکاح کا اعلان کرواور نکاح مساجد میں کرواور اُس پر دف بجاؤ)''۔

(ترمذی:1089)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں:''دَف کہ بے جلاجل یعنی بغیر جھانجھ (اسے جھانجھر بھی کہتے ہیں) کا ہواور تال سر کی رعایت سے نہ بجایا جائے اور بجانے والے نہ مرد ہوں نہ ذی عزت عورتیں، بلکہ کنیزیں یا ایسی کم حیثیت عورتیں اور وہ غیر محل فتنہ میں بجائیں تو نہ صرف جائز بلکہ مستحب ومندوب ہے: لِلْاَمْرِبِہٖ فِی الْحَدِیْثِ وَالْقُیُوْد مَذْکُوْرَۃٌ فِیْ رَدِّالْمُحْتَارِ وَغَیْرِہٖ وَشَرَحْنَاھَافِیْ فَتَاوَانَا۔ ترجمہ:''حدیث میں مشروط دف کے بجانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی تمام قیود کو فتاویٰ شامی وغیرہ میں ذکر کردیا گیا اور ہم نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تشریح کردی ہے''۔اس کے سوا اور باجوں سے احتراز کیا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم،(فتاویٰ رضویہ،جلد 21،ص:643)''۔

دَف اور ڈھولک میں فرق ہے،دَف ایک طرف سے کھلا ہوتا ہے،جبکہ ڈھولک دونوں طرف سے بند ہوتا ہے،لہٰذا دَف سے ڈھولک کا جواز ثابت نہیں کیا جا سکتا اور امام احمد رضا قادری نے دَف کے ساتھ بھی جھانجھر نہ ہونے کی شرط لگائی ہے، جبکہ بعض لوگ جھانجھر والے دَف کے ساتھ نوخیز قریب البلوغ یا بالغہ لڑکیوں سے ٹی وی پر گروپ کی شکل میں نعت پڑھواتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔بعض لوگ ہجرت کے موقع پر قبیلۂ بنونجار کی بچیوں کے ان استقبالیہ اشعار سے استدلال کرتے ہیں:

طَلَعَ الْبَدرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعَا لِلّٰہِ دَاعٍ

(سیرۃ الحلبیہ، ۲/۲۳۵)

یہ "کَلِمَۃُ الْحَقِّ اُرِیْدُ بِهَا الْبَاطِل" کے قبیل سے ہے۔ اولاً تو یہ کہ یہ ابتدائے اسلام کا دور تھا، یہ بچیاں عہدِ اسلام کی تربیت یافتہ نہیں تھیں، بلکہ اُس عہد کے قبائلی رواج کے مطابق انہوں نے ایسا کیا اور وہ بھی ایک دائرے میں تھا، جبکہ مزامیر کو توڑنے کی روایات بعد کی ہیں۔ بعدازاں رسول اللہ ﷺ جنگی فتوحات سے واپس تشریف لائے، کئی خوشی کے مواقع آئے، لیکن آپ ﷺ نے اس شعار کو رائج نہیں کیا اور نہ ہی اس کی ترغیب دی۔

مُغنّیات سے کام لینا مشرکینِ مکہ کا شِعار تھا۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی غزوۂ بدر کے بارے میں امام ابن ہشام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"قریش نے اپنا تمام مال ومتاع داؤ پر لگا کر جنگ کی تیاری کی، جب اُنہوں نے عزمِ سفر کیا تو قریش مکہ کی فوج کی تعداد نو سو پچاس تھی، اُن کے پاس ایک سو گھوڑے تھے، جن پر ایک سو زرہ پوش سوار تھے، پیدل سپاہیوں کے لیے بھی زرہیں مہیا تھیں، اُن کے ساتھ رقص کرنے والی کنیزیں بھی تھیں، جو دَف بجارہی تھیں اور جوشیلے گیت گا کر ان کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا رہی تھیں، سو قریش کا یہ لشکر جرار مٹھی بھر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے بڑے غرور اور تکبر کے ساتھ روانہ ہوا"۔

(تبیان القرآن، جلد دوم، ص: 332)

غزوۂ بدر سے قبل ابوجہل کو بتایا گیا کہ ابوسفیان کے قافلہ نے ساحل کا راستہ اختیار کرلیا ہے اور وہ محفوظ ہو چکا ہے، تم اب اپنے لوگوں کو واپس مکہ لے جاؤ۔ اُس نے کہا: "نہیں خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہوسکتا، حتّٰی کہ ہم اونٹوں کو ذبح کریں گے، شراب پئیں گے اور ہماری باندیاں آلاتِ موسیقی کے ساتھ گانا گائیں گی اور تمام قبائل عرب ہمارے خروج کی خبر سن لیں گے، (سُبُل الہدیٰ والرشاد، جلد رابع، ص: 29)"۔ یعنی اس سے ایک عالَم پر ہماری دہشت قائم ہوجائے گی۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ پنجاب میں میلاد النبی ﷺ کے موقع پر منوں کے حساب سے کیک کاٹے جاتے ہیں، اِس طرح کی حرکات میلاد النبی ﷺ کی تقدیس کے منافی ہیں

اور یہ اس لیے ہو رہا ہے کہ مذہبی معاملات کو جاہل واعظین اور پیروں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور کچھ اہلِ ثروت اپنی تشہیر و نام و نمود کے لیے یہ کارروائیاں کرتے ہیں۔ علماء کی ذمے داری ہے کہ دینی معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں، قوم کی رہنمائی کریں اور مذہبی عنوان سے اس طرح کے اضافات کا راستہ روکیں۔ ہاں! اگر کوئی ایصالِ ثواب کی نیت سے لوگوں کو کیک کھلانا یا تقسیم کرنا چاہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

فکرِ رضا کی روشنی میں

نعت خوانی اور خطابت کے نذرانوں کی جائز و ناجائز صورتیں

سوال:

میت کے ایصالِ ثواب کے لیے پہلے گٹھلیوں پر کلمۂ طیبہ کا ورد کیا جاتا ہے، پھر نعت خوانی ہوتی ہے اور لوگ نعت خوانوں کو پیسے دیتے ہیں۔ پھر ایک یا دو مولانا حضرات جب تک بیان کرتے رہتے ہیں، لوگ اُن کے سامنے بھی پیسے رکھتے رہتے ہیں۔ پھر کئی طرح کے کھانے اور پھلوں سے بھرے تھال رکھ کر ختم پڑھا جاتا ہے، جب تک وہ ختم پڑھتا رہتا ہے، لوگ اُس کے سامنے بھی پیسے رکھتے ہیں، جسے ختم کے بعد وہ اٹھالیتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ سارے اُمور کیا شرعی حیثیت رکھتے ہیں؟۔ (حافظ محمد حسین، کراچی)۔

جواب:

یہ فتویٰ خالصتاً اصلاح کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے، تاکہ اُمت میں پائی جانے والی بے اعتدالیوں کو روکا جاسکے۔ حق کو تسلیم کرلینا اور اُس پر عمل پیرا ہونا مومن کی خوبی ہے، آمادۂ اصلاح ہونے کی بجائے مال کی محبت میں غرق ہوکر الٹی سیدھی تاویلیں پیش کرنا، حق کو جھٹلانا یا علماء کی مخالفت کرنا حرام کو حلال نہیں کرسکتا، بلکہ ہٹ دھرمی کی یہ روش آخرت کی بربادی اور خسارے کا باعث ہوگی۔ اس فتویٰ میں تمام دلائل اور حوالے امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز کے فتاویٰ سے لیے گئے ہیں کہ ہمارے اس خطے میں لوگ مسلک اہلسنّت کو امام احمد رضا بریلوی کی نسبت سے جانتے ہیں اور اس میں

لوگوں نے جومن پسند اضافات کیے ہیں، وہ آپ کی طرف منسوب کردیے جاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز کے فتاویٰ سے یہ ظاہر وعیاں ہوتا ہے کہ آپ کی اصل تعلیمات اور فتاویٰ کیا تھے اور انہیں بدل کر اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے والا طبقہ کیا چاہتا ہے۔ ذاتی مفاد کے لیے امام اہلسنت کی تعلیمات کی من مانی تاویلات کرنے والے اُن کے سچے پیروکار کہلانے کے حق دار نہیں ہوسکتے، اس طبقے کی حوصلہ شکنی کرنا علماء حق پر لازم ہے۔

ایصالِ ثواب کی محافل میں نعت خوانوں، واعظوں اور فاتحہ پڑھنے والوں کے لیے نذرانوں کا اہتمام کیا جانا ایصالِ ثواب کا حصہ نہیں ہے اور اسے دین سے منسلک کرنا زیادتی ہے۔ ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعائے مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوتِ قرآنِ پاک، اذکار وتسبیحات اور درود پاک وغیرہ۔ میت کو قرآن خوانی وکلمۂ طیبہ ودیگر عبادات کا ثواب پہنچایا جاسکتا ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْاَصْلُ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ اَنَّ الْاِنْسَانَ لَہٗ اَنْ یَّجْعَلَ ثَوَابَ عَمَلِہٖ لِغَیْرِہٖ صَلَاۃً کَانَ اَوْ صَوْمًا اَوْ صَدَقَۃً اَوْ غَیْرَھَا کَالْحَجِّ وَقِرَاءَۃِ الْقُرْاٰنِ وَالْاَذْکَارِ وَزِیَارَۃِ قُبُوْرِ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَالشُّھَدَاءِ وَالْاَوْلِیَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ وَتَکْفِیْنِ الْمَوْتٰی وَجَمِیْعِ اَنْوَاعِ الْبِرِّ کَذَا فِیْ ''غَایَۃِ السُّرُوْجِیِّ شَرْحِ الْھِدَایَۃِ''۔

ترجمہ: ''قاعدہ یہ ہے کہ انسان اپنے عمل کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچا سکتا ہے، خواہ وہ نماز یا روزہ یا مالی صدقہ یا کوئی بھی نیک عمل ہو، جیسے حج اور قرآن مجید کی تلاوت اور اذکار اور انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت اور شہداء اور اولیاء اور صالحین کی قبروں کی زیارت اور مردوں کو کفن دینا اور دیگر تمام نیکی کے کام، ''غایۃ السُّرو جی شرح ہدایہ'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ،ص: 257، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز سے سوال کیا گیا: ''ہمارے یہاں

ملک بنگالہ میں جب کسی نے برائے ثواب رسانی اپنے میت کے مُلّاؤں یا طلباؤں سے قرآن شریف پڑھوایا، یا بعدان کو کچھ دیا جاتا ہے، وہ خود نہیں مانگتے بلکہ خود پڑھوانے والا اُن کو دیتا ہے، یہ طریقہ ہمارے یہاں عام رواج ہے، تو یہ لینا دینا جائز ہے یا نہیں؟۔ اگر جائز ہے تو کس طریقہ پر اور ایسے ہی بعد پڑھوانے مولود شریف کے جو کچھ دیا جاتا ہے بغیر طلب کرے، مولود خواں کے لیے یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''اصل یہ ہے کہ طاعت وعبادات پر اجرت لینا دینا (سوائے تعلیمِ قرآنِ عظیم وعلومِ دین واذان وامامت وغیرہا معدودے چند اشیاء کہ جن پر اجارہ کرنا متاخرین نے بہ ناچاری ومجبوری بنظر حال زمانہ جائز رکھا) مطلقاً حرام ہے اور تلاوتِ قرآن عظیم بغرض ایصالِ ثواب وذکر شریف میلاد پاک حضور سید عالم ﷺ ضرور منجملہ عبادات وطاعت ہیں، تو ان پر اجارہ بھی ضرور حرام ومحذور، کَمَاحَقَّقَهُ السَّيِّدُ الْمُحَقِّقُ مُحَمَّدُ بْنُ عَابِدِيْنَ الشَّامِيِّ فِي رَدِّ الْمُحْتَارِ عَلَى الدُّرِّ الْمُخْتَار. وَلَهُ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى رِسَالَةٌ مُسْتَقِلَّةٌ فِي تَحَقُّقِ الْمَسْئَلَةِ سَمَّاهَا'' شِفَاءُ الْعَلِيْلِ وَبَلُّ الْغَلِيْلِ فِي حُكْمِ الْوَصِيَّةِ بِالْخَتَمَاتِ وَالتَّهَالِيْل '' قَالَ وَاطَّلَعَ عَلَيْهَا مُحَشِّيْ هٰذَا الْكِتَابِ (يَعْنِي الدُّر) فَقِيهُ عَصْرِهٖ وَوَحِيدُ دَهْرِهٖ السَّيِّدُ اَحْمَدُ الطَّحْطَاوِي مُفْتِي مِصْرَ سَابِقًا فَكَتَبَ عَلَيْهَا وَاَثْنٰى الثَّنَاءَ الْجَمِيْلَ فَاللّٰهُ يُجْزِيْهِ الْاَجْرَالْجَزِيلَ وَكَتَبَ عَلَيْهَا غَيْرُهٗ مِنْ فُقَهَاءِ الْعَصْرِ، قُلْتُ وَقَدْ تَشَرَّفَ الْفَقِيرُ بِمُطَالَعَتِهَا فَوَجَدْتُهٗ بِحَمْدِ اللّٰهِ تَعَالٰى كَفٰى وَشَفٰى وَصَفَا وَوَفٰى فَرَحِمَنَا اللّٰهُ وَاِيَّاهُ وَالْمُسْلِمِيْنَ بِعِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، آمین۔

ترجمہ: '' سید محقق محمد بن ابن عابدین شامی نے درمختار کے حاشیہ ردالمحتار میں جیسا کہ اس کی تحقیق فرمائی، اس مسئلہ میں ان کا ایک مستقل رسالہ ہے، جس کا نام '' شِفَاءُ الْعَلِيلِ وَبَلُّ الْغَلِيلِ فِي حُكْمِ الْوَصِيَّةِ بِالْخَتَمَاتِ وَالتَّهَالِيْل '' رکھا ہے، اُنہوں نے خود فرمایا کہ درمختار کے محشی اپنے زمانہ کے فقیہہ العصر، وحید دہر سید احمد طحطاوی سابق مفتی مصر نے اس رسالہ کا مطالعہ فرماکر اس پر تقریظ لکھی اور تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم سے

نوازے اور دیگر فقہاءِ عصر نے بھی تقریظات لکھی ہیں۔ میں کہتا ہوں اس فقیر نے اس کے مطالعے کا شرف حاصل کیا ہے، تو میں نے بحمدللہ تعالیٰ اس کو کافی شافی اور بھرپور صاف پایا، تو اللہ تعالیٰ ہم پر اور ان پر، تمام مسلمانوں اور اپنے تمام اہل دین بندوں پر رحم فرمائے آمین"۔

اور اجارہ جس طرح صریح عقدِ زبان سے ہوتا ہے، عرفاً معروف ومعہود سے بھی ہو جاتا ہے مثلاً پڑھنے، پڑھوانے والوں نے زبان سے کچھ نہ کہا مگر جانتے ہیں کہ دینا ہوگا، وہ سمجھ رہے ہیں کہ کچھ ملے گا، انہوں نے اس طور پر پڑھا، انہوں نے اس نیت سے پڑھوایا، اجارہ ہو گیا اور اب دو وجہ سے حرام ہوا، ایک تو طاعت پر اجارہ یہ خود حرام، دوسرے اجرت اگر عرفاً معین نہیں تو اس کی جہالت سے اجارہ فاسدہ، یہ دوسرا حرام۔

أَیْ أَنَّ الْإِجَارَۃَ بَاطِلَۃٌ وَعَلٰی فَرْضِ الْاِنْعِقَادِ فَاسِدَۃٌ فَلِلتَّحْرِیْمِ وَجْهَانِ مُتَعَاقِبَانِ. وَذٰلِكَ لِمَا نَصُّوْا قَاطِبَةً أَنَّ الْمَعْهُوْدَ عُرْفًا كَالْمَشْرُوْطِ لَفْظًا۔

ترجمہ: "یعنی اجارہ باطل ہے اور انعقاد کی صورت میں وہ فاسد ہے، تو اس کے حرام ہونے کی یکے بعد دیگرے دو وجہیں ہیں اور یہ اس لیے کہ تمام فقہاء کی نص ہے کہ جو چیز عرف میں مشہور ومسلم لفظوں میں مشروط کی طرح ہے"۔ پس اگر قرارداد کچھ نہ ہو، نہ وہاں لین دین معہود ہوتا ہو تو بعد کو بطور صلہ وحُسنِ سلوک کچھ دے دینا جائز بلکہ حَسن ہوتا، هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ۝ (احسان کی جزا صرف احسان ہے) وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝ (اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)۔

مگر جبکہ اس طریقہ کا وہاں عام رواج ہے، تو صورت ثانیہ میں داخل ہو کر حرام محض ہے، اب اس کے حلال ہونے کے دو طریقے ہیں: اول: یہ کہ قبلِ قراءت پڑھنے والے صراحۃً کہہ دیں کہ ہم کچھ نہ لیں گے، پڑھوانے والے صاف انکار کر دیں کہ تمہیں کچھ نہ دیا جائے گا، اس شرط کے بعد وہ پڑھیں اور پھر پڑھوانے والے بطور صلہ جو چاہیں دے دیں، یہ لینا دینا حلال ہوگا۔

لِانْتِفَاءِ الْإِجَارَۃِ بِوَجْهَيْهَا، أَمَّا اللَّفْظُ فَظَاهِرٌ وَأَمَّا الْعُرْفُ فَلِأَنَّهُمْ نَصُّوْا عَلٰى نَفْيِهَا

وَالصَّرِیْحُ یَفُوْقُ الدَّلَالَۃَ،فَلَمْ یُعَارِضْہُ الْعُرفُ الْمَعْھُوْدُ کَمَانَصَّ عَلَیْہِ الْاِمَامُ فَقِیْہُ النَّفْسِ ''قَاضِی خَان رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی''فِی الْخَانِیَۃِ وَغَیْرُہٗ فِی غَیْرِھَامِنَ السَّادَۃِ الرَّبَّانِیَۃِ

ترجمہ:''دو وجہ سے اجارہ نہ ہونے کی وجہ سے،ایک لفظ کے اعتبار سے تو ظاہر ہے،دوسرا عرف کی وجہ سے کیونکہ انہوں نے اس وجہ کی نفی پر نص کر دی ہے اور صریح بات فائق ہوتی ہے،تو عرف معہود اس کے معارض نہ ہو سکے گا جیسا کہ''امام فقیہ النفس قاضی خان'' نے اس پر اپنے فتاویٰ اور دیگر فقہاء نے دوسری کتب میں نص فرمائی ہے''۔

دوم: پڑھوانے والے پڑھنے والوں سے یہ بہ تعیینِ وقت و اُجرت ان سے مطلق کارِ خدمت پر پڑھنے والوں کو اجارے میں لے لیں،مثلاً یہ اُن سے کہیں:''ہم نے کل صبح سات بجے تک بعوض ایک روپیہ کے اپنے کام کاج کے لیے اجارہ میں لیا،وہ کہیں ہم نے قبول کیا''۔ اب یہ پڑھنے والے اتنے گھنٹوں کے لیے ان کے نوکر ہو گئے،وہ جو کام چاہیں لیں،اس اجارہ کے بعد وہ ان سے کہیں،اتنے پارے کلام اللہ شریف کے پڑھ کر ثواب فلاں کو بخش دو،یا مجلس میلادِ مبارک پڑھ دو،یہ جائز ہوگا اور لینا دینا حلال،لِاَنَّ الْاِجَارَۃَ وَقَعَتْ عَلٰی مَنَافِعِ اَبْدَانِھِمْ لَاعَلَی الطَّاعَاتِ وَالْعِبَادَاتِ،وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعلَم۔

ترجمہ:''کیونکہ یہ اجارہ ان کے ابدان سے انتفاع پر ہوا ہے نہ کہ ان کی عبادات اور طاعات پر ہوا ہے''۔(فتاویٰ رضویہ،جلد 19،ص:488-486)

مزید سوال ہوا:''یہاں احمد آباد شہر میں بعض حافظ القرآن حضرات اہلسنّت و جماعت کے مکانوں پر سوم و چہلم منانے جاتے ہیں اور کلام مجید پڑھ کر اَموات کی خدمت میں ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور وہاں سے اجرت لیتے ہیں اور اس میں جُہلاء بہت ثواب سمجھتے ہیں،آیا یہ ایصالِ ثواب کر کے اجرت لینا جائز ہے یا حرام ہے،اجرت لے کر ایصالِ ثواب کرے تو اموات کی خدمات میں ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟''۔آپ نے جواب لکھا:

''اُجرت پر کلام اللہ شریف بغرض ایصالِ ثواب پڑھنا،پڑھوانا دونوں ناجائز اور پڑھنے

والا اور پڑھوانے والا دونوں گنہ گار اور اس میں میت کے لیے کوئی نفع نہیں بلکہ اس کی مرضی وصیت سے ہو تو وہ بھی وبال میں گرفتار، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِی ثَمَنًا قَلِیْلًا (اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو) اور یہ کہنا کہ ہم اللہ کے لیے پڑھتے ہیں اور دینے والے بھی ہمیں اللہ کے لیے دیتے ہیں، محض جھوٹ ہے، اگر یہ نہ پڑھیں تو وہ ایک حبہ اُن کو نہ دیں اور اگر وہ نہ دیں تو یہ ایک صفحہ نہ پڑھیں اور شرعِ مطہر کا قاعدہ کلیہ اَلْمَعْرُوْفُ کَالْمَشْرُوْطِ (معروف مشروط کی طرح ہے) بلکہ اس ظاہری شرط نہ کرنے سے ایک اور خباثت بڑھ جاتی ہے، اجارہ جو امر جائز پر ہو وہ بھی اگر بے تعین اجرت ہو تو بوجہ جہالت اجارہ فاسد اور عقدِ حرام ہے، نہ کہ وہ اجارہ کہ خود ناجائز تھا، وہ تو حرام در حرام ہو گیا''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 19، ص:528)

سوال: میلاد شریف جس کے یہاں ہو وہ پڑھنے والے کی دعوت کرے تو پڑھنے والے کو کھانا چاہیے یا نہیں اور اگر کھایا تو پڑھنے والے کو کچھ ثواب ملے گا یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''پڑھنے کے عوض کھانا کھلاتا ہے تو یہ کھانا نہ کھلانا چاہیے اور اگر کھائے گا تو یہی کھانا اس کا ثواب ہو گیا اور ثواب کیا چاہتا ہے بلکہ جاہلوں میں جو یہ دستور ہے کہ پڑھنے والوں کو عام حصوں سے دونا دیتے ہیں اور بعض احمق پڑھنے والے اگر اُن کو اوروں سے دونا نہ دیا جائے تو اس پر جھگڑتے ہیں، یہ زیادہ لینا دینا بھی منع ہے اور یہی اس کا ثواب ہو گیا، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِی ثَمَنًا قَلِیْلًا (اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو)''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 21، ص:663)

امام احمد رضا قادری سے ایک شخص (بنام زید) کے بارے میں سوال کیا گیا کہ ''زید نے اپنے پانچ روپے فیس مولود شریف کی پڑھوائی مقرر کر رکھے ہیں، بغیر پانچ روپیہ فیس کے کسی کے یہاں جاتا نہیں اور وقت نماز سب سے پہلے سبقت امامت کی کرتا ہے اور اپنے آپ کو مولوی صاحب کے لفظوں سے اپنے قلم سے لکھتا ہے اور کچھ معمولی روایتیں علماء دین سے یاد کر لی ہیں اور جمعہ کے روز مسجد میں منبر پر بیٹھ کر وعظ پڑھتا ہے اور پیری مریدی بھی

کرتا ہے''۔آپ نے جواب میں لکھا:''زید نے جو اپنی مجلس خوانی خصوصاً راگ سے پڑھنے کی اجرت مقرر کر رکھی ہے، ناجائز وحرام ہے، اس کا لینا اُسے ہرگز جائز نہیں، اس کا کھانا صراحۃً حرام کھانا ہے، اس پر واجب ہے کہ جن جن سے فیس لی ہے، یاد کر کے سب کو واپس دے، وہ نہ رہے ہوں تو ان کے وارثوں کو پھیرے، پتا نہ چلے تو اتنا مال فقیروں پر تصدق کرے اور آئندہ اس حرام خوری سے توبہ کرے تو گناہ سے پاک ہو۔ اوّل تو سید عالم ﷺ کا ذکر پاک خود عمدہ طاعات واَجلِّ عبادات سے ہے اور طاعت وعبادت پر فیس لینی حرام۔ مبسوط پھر خلاصہ پھر عالمگیری میں ہے:

لَایَجُوْزُ الِاسْتِیجَارُ عَلَی الطَّاعَاتِ کَالتَّذْکِیرِ وَلَایَجِبُ الْاَجْرُ

ترجمہ:''نیک کاموں میں اجرت لینا جائز نہیں، جیسے وعظ کرنا اور اجرت واجب نہیں ہوگی''۔

خلاصہ پھر تاتارخانیہ پھر ہندیہ میں ہے:

اَلْوَاعِظُ اِذَا سَأَلَ النَّاسَ شَیْئًا فِی الْمَجلِسِ لِنَفسِہٖ لَایَحِلُّ لَہٗ ذٰلِکَ لِاَنَّہٗ اِکْتِسَابُ الدُّنیَا بِالْعِلْمِ۔

ترجمہ:''جب وعظ کرنے والا مجلس میں اپنے لیے کچھ مانگے تو اس کے لیے ایسا کرنا حلال نہیں کیونکہ اس میں علم کے ساتھ دنیا کا حصول ہے''۔

قُنیہ پھر اَشباہ پھر دُرِمختار میں ہے:

وَنَظْمُ الدُّرِّ اَتَمُّ، اِمَّا (تَقَبُّلٌ) تُسَمّٰی شِرْکَۃَ صَنَائِعَ وَاَعمَالٍ وَاَبدَانٍ (اِنِ اتَّفَقَ) صَانِعَانِ (عَلٰی اَنْ یَّتَقَبَّلَا الْاَعْمَالَ) اَلَّتِی یُمْکِنُ اسْتِحْقَاقُھَا وَمِنْہُ تَعْلِیمُ کِتَابَۃٍ وَقُرْآنٍ وَفِقْہٍ عَلَی الْمُفْتٰی بِہٖ بِخِلَافِ دَلَّالِیْنَ وَمُغَنِّیِیْنَ وَشُھُودِ مَحَاکِمَ وَقُرَّاءِ مَجَالِسِ وَتَعَازٍ وَوُعَّاظٍ وَسُؤَّالٍ۔

ترجمہ:''دُرِمختار کی عبارت زیادہ تام اور مفصل ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:(ایک قسم شرکت تقبل ہے)اور اس کو شرکت صنائع واعمال وابدان بھی کہا جاتا ہے۔اگر دو پیشہ ور اس

بات پر اتفاق کرلیں کہ وہ ایسا کام لیں گے، جس میں استحقاق اجرت ممکن ہے اور اسی شعبہ سے کتابت سکھانا، قرآن مجید اور علمِ فقہ پڑھانا ہے، تو مُفتیٰ بِہٖ قول کے مطابق اس پر اجرت لینا جائز ہے، اس کے برعکس دو دلالوں، دو گویوں، فیصلے کے دو گواہوں، مجلس میں قرآن مجید پڑھنے والوں، ماتم کرنے والوں، وعظ کرنے والوں اور اصرار کے ساتھ دعا مانگنے والوں کی شرکت جائز نہیں ہے (اور ان کے عدمِ جواز کی اپنی اپنی وجوہ ہیں)۔

مُفتیٰ بِہٖ قول: جب کسی مسئلے پر ایک سے زیادہ اَقوال ہوں اور متاخرین فقہائے کرام نے دینی حکمت یا ضرورت کے تحت کسی قول کو ترجیح دی ہو، تو اسے ''مُفتیٰ بِہٖ قول'' کہتے ہیں۔

نوٹ: صنائع صنعت کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں پیشہ اور پیشہ ور کی کارکردگی، اعمال اور ابدان، عمل اور بدن کی جمع ہیں۔ چونکہ اس میں غالباً دونوں افراد کا جسمانی کام ہوتا ہے، اس لیے اس کو یہ نام دیا گیا۔

ثانیاً: بیانِ سائل سے ظاہر کہ وہ اپنی شعر خوانی و زمزمہ سنجی کی فیس لیتا ہے، یہ بھی محض حرام۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

لَاتَجُوزُ الاِجَارَۃُ عَلٰی شَیْئٍ مِنَ الغِنَاءِ وَقِرَاءَۃِ الشِعْرِوَلَااَجْرَفِیْ ذٰلِكَ وَھٰذَا کُلُّهٗ قَوْلُ أَبِی حَنِیفَۃَ وَأَبِی یُوسُفَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَھُمُ اللهُ تَعَالٰی کَذَافِی غَایَۃِ البَیَان، (مختصراً)

ترجمہ: ''گانا اور اشعار پڑھنا (ایسے اعمال ہیں) ان میں سے کسی پر مزدوری اور اجرت لینا جائز نہیں اور نہ ان میں اجرت ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ تینوں کا قول اور فتویٰ ہے، چنانچہ غایۃ البیان میں یونہی مذکور ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 725-724)

ایصالِ ثواب کی فاتحہ کے موقع پر انواع و اقسام کے ماکولات و مشروبات، پھل، کپڑے وغیرہ سب چیزیں سامنے رکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں ریا کا عنصر بھی شامل ہوسکتا ہے۔ سامنے رکھنا شریعت میں اصولی اعتبار سے منع بھی نہیں ہے اور ایسا کرنے پر اصرار بھی درست نہیں ہے۔ ایصالِ ثواب کی اشیاء کو سامنے رکھے بغیر فاتحہ و ایصالِ ثواب

کیا جا سکتا ہے اور کھانے کے بعد بھی فاتحہ پڑھی جا سکتی ہے، امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''وقتِ فاتحہ کھانا سامنے رکھنے کی ممانعت نہیں، مگر اُسے ضروری جاننا یا یہ سمجھنا کہ بے اس کے فاتحہ نہیں ہو سکتی، یا ثواب کم ملے گا، غلط و باطل خیال ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 598)

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا: ''علماء جو وعظ مساجد جامع یا غیر جامع میں کہتے ہیں اور حاضرین کو پند و نصائح سناتے ہیں اور وہ ان کی خدمت و تواضع نقود وغیرہ سے کرتے ہیں، یہ آمدنی ان کو جائز ہے یا ناجائز؟ اور بعضے صرف حمد و نعت پڑھتے ہیں اور سامعین ان کی خدمت گزاری نقد و جنس سے کرتے ہیں یہ امر مساجد و غیر مساجد میں مباح و درست ہے یا نہیں اور یہ آمدنی ان کے واسطے درجہ جواز میں ہے یا عدم جواز میں؟۔ یہ لوگ ماتحت آیہ کریمہ: ''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ'' (یہی وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خرید لیا ہے)'' کے داخل ہیں یا خارج؟ اس سے تین حالین کہ مقصود طرفین الصاع اور انتفاع اور نفع رسانی اور مہمان نوازی اور مسافر پروری ہو، بینوا توجروا (بیان فرمایئے اجر پایئے)''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''اس میں تین صورتیں ہیں: اگر وعظ کہنے اور حمد و نعت پڑھنے سے مقصود یہی ہے کہ لوگوں سے کچھ مال حاصل کریں، تو بیشک اس آیت کریمہ کے تحت میں داخل ہیں اور حکم ''لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ وصول کرو)'' کے مخالف۔ وہ آمدنی ان کے حق میں خبیث ہے، خصوصاً جبکہ ایسے حاجت مند نہ ہوں، جن کو سوال کی اجازت ہے کہ اب تو بے ضرورت سوال دوسرا حرام ہوگا اور وہ آمدنی خبیث تر و حرام مثل غصب ہے، عالمگیریہ میں ہے: مَا جَمَعَ السَّائِلُ بِالتَّكَدِّيْ فَهُوَ خَبِيْثٌ، یعنی سائل نے کد و کاوش سے جو کچھ جمع کیا وہ ناپاک ہے۔

(فتاوٰی ہندیہ، کتاب الکراھیۃ، الباب الخامس عشر، نورانی کتب خانہ پشاور)

دوسرے یہ کہ وعظ حمد و نعت سے ان کا مقصود محض اللہ ہے اور مسلمان بطور خود ان کی خدمت

کریں تو یہ جائز ہے اور وہ مال حلال، تیسرے یہ کہ وعظ سے مقصود تو اللہ ہی ہو مگر ہے حاجتمند اور عادۃً معلوم ہے کہ لوگ خدمت کریں گے، اُس خدمت کی طمع بھی ساتھ لگی ہوئی ہے، تو اگرچہ یہ صورت دوم کے مثل محمود نہیں مگر صورتِ اُولیٰ کی طرح مذموم بھی نہیں، جسے درمختار میں فرمایا: اَلوَعظُ لِجمعِ المَالِ مِن ضَلالَةِ الیَهُودِ وَ النَّصَارىٰ۔ ترجمہ: ''مال جمع کرنے کے لیے وعظ کہنا یہود و نصاریٰ کی گمراہیوں سے ہے''۔ (درمختار، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع)۔ یہ تیسری صورت بین بین ہے اور دوم سے بہ نسبت اولیٰ کے قریب تر ہے، جس طرح حج کو جائے اور تجارت کا کچھ مال بھی ساتھ لے جائے، جسے ''لَیسَ عَلَیْكَ جُنَاحٌ اَن تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ'' (تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی رزق حلال) تلاش کرو۔ لہٰذا فتویٰ اس کے جواز پر ہے: اَفْتٰی بِهٖ الْفَقِیهُ اَبُوالَّلیْثِ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی کَمَا فِی الْخَانِیَةِ وَالْهِندِیَةِ وَغَیْرِهِمَا وَالَّذِی ذَکَرْتُهٗ تَوفِیقٌ بَینَ الْقَولَینِ وَبِاللّٰهِ التَّوفِیقُ وَاللهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

ترجمہ: ''حضرت فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ عالمگیری وغیرہ میں مذکور ہے اور جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، یہ دو قولوں کے درمیان موافقت پیدا کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔

(فتاوی رضویہ، جلد 23، ص: 377)

خلاصۂ کلام یہ کہ آپ نے سوال میں ایصالِ ثواب کے موقع پر نعت خوانوں، واعظین اور قُرّاء حضرات کے لیے جس اہتمام کا ذکر فرمایا، اہتمام کرنے والوں کا اِسے ضروریات میں شمار کرنا غلط ہے، شریعت کی رُو سے درست اور پسندیدہ صورت تو یہ ہے کہ اس رقم کو صدقاتِ جاریہ کی مد میں صرف کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے انفاق فی الخیر میں صدقاتِ جاریہ کو ترجیح دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ :اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ اَوْ عِلْمٍ یُنْتَفَعُ

بِہٖ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْالَہٗ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں لیکن تین عمل منقطع نہیں ہوتے ،صدقۂ جاریہ،علم نافع اور نیک اولاد جو اُس کے لیے دعا کرتی ہے''۔

(سُنن ابوداؤد:2877)

صدقۂ جاریہ سے ایسا عمل خیر مراد ہے،جس کے اجر وفیضان کا سلسلہ متصدِّق کی موت کے ساتھ منقطع نہ ہوجائے بلکہ اس کا فیضان تادیر جاری وساری رہے،بقول شاعر:

خیر گر چاہے، پھر فیض کے اسباب بنا

پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

جیسے کسی نے مسجد بنائی یا تعمیر میں حصہ لیا یا مدرسہ بنایا یا انسانی فلاح کا کوئی کام کیا،تو جب تک وہ مسجد،مدرسہ یا کنواں وغیرہ باقی ہیں،ان کے بانی یا ان میں حصہ لینے والوں کو ثواب ملتا رہے گا۔اسی طرح کسی نے دینی طالب علم یعنی زیرِ تعلیم کسی حافظ یا عالم کی کفالت اپنے ذمے لی تو حافظِ قرآن یا عالم ومبلغ اور مدرّس بن کر جب تک وہ دین کی خدمت کرتا رہے گا،اس شخص کو ثواب ملتا رہے گا اور اگر اس کے شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے دین کا کام جاری رہا تو اس کا ثواب بھی اسے ملتا رہے گا۔

نعت خوانوں اور واعظوں وخطبات کے نذرانوں کی ایک صورت کو امام اہلسنّت امام احمد رضا قادری نے جائز کہا ہے،وہ یہ کہ یہ حضرات اپنے وقت کا اجارہ پروگرام کے منتظم کے ساتھ طے کرلیں اور اس وقت وہ ان سے کہے کہ آپ نعت پڑھیں یا خطاب کریں،تو یہ جائز ہے،کیونکہ یہ اجارہ ان کی ذات سے انتفاع کی اجرت ہے نہ کہ عبادات وطاعات کی اجرت ہے۔

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا:''ہندہ سنی حنفی پابند صوم وصلوٰۃ جو پندرہ بیس برس ہوئے کہ اپنے مادری پیشہ کسب سے توبہ کرچکی ،اپنی مقبوضہ کل جائداد واملاک جو اس کی ماں

اور نانی کی متروکہ اور ان کو ان کے آشناؤں کی ہبہ کی ہوئی ہے، مدرسہ دینیہ کی تعلیم میں یا اس کے یتیم و مفلس طلبہ کی خورد و نوش کی صرف میں لانے کی غرض سے وقف کرنا چاہتی ہے، پس سوال حضرات مفتیان شرع شریف سے یہ ہے کہ منتظمین مدرسہ کو یہ جائداد اپنے قبضہ میں لا کر اس کے محاصل کو ہندہ کی خواہش کے موافق صرف میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''جو روپیہ بعوض زنا و غنا حاصل کیا مثل غصب حرام مطلق ہے کہ کسی طرح اس کی ملک نہیں ہوسکتا ہے، وہ جائدادیں جو آشناؤں نے زانیات کو ہبہ کیں وہ ہبہ بھی محض باطل ہے، وہ اصل دینے والوں کی ملک پر رہیں ان کی ملک میں نہیں آسکتیں، قنیہ و در مختار میں ہے: مَایَدْفَعُهُ الْمُتَعَاشِقَانِ فَهُوَ رِشْوَةٌ۔ ترجمہ: ''عشق بازی کرنے والے ایک دوسرے کو جو دیں وہ رشوت ہے۔

(فتاویٰ ہندیہ بحوالہ القنیۃ، کتاب الہبۃ، الباب الحادی عشر فی المتفرقات)

ہاں جو جائداد زانیہ نے خریدی ہو اور اس کے شراء میں عقد و نقد دونوں زرِ حرام پر جمع نہ ہوئے ہوں، مثلاً روپیہ پیشگی دے کر کہا کہ اس روپے کے عوض جائداد دے دے بائع نے اس کے عوض بیع کر دی یہ تو حرام پر عقد ہوا، اور وہی روپیہ زرِ ثمن میں دیا گیا یہ حرام کا نقد ہوا دونوں جمع ہو گئے اس صورت میں بھی وہ جائداد ان کی ملک نہ ہوگی ہاں اگر زرِ حرام پر عقد و نقد دونوں جمع نہ ہوئے ہوں مثلاً جائداد خریدی اس وقت ثمن کی تعین خاص مال حرام سے نہ تھی، نہ وہ دکھایا گیا، نہ پیشگی دیا گیا، مطلق روپے کے بدلے خریدی، تو یہ جائداد اس خریدنے والے کی ملک صحیح و حلال ہو جائے گی، اب زرِ ثمن اس حرام مال سے ادا کیا گیا تو یہ گناہ ہوا اور بائع کو اس کا لینا حرام تھا، مگر جائداد اس کی ملک میں آگئی۔ اسی طرح جو کچھ اُن کو اُجرت و رشوت کے علاوہ ناچ گانے میں بطور انعام دیا جاتا ہے، جسے 'بیل' کہتے ہیں، وہ ان پر حرام نہیں، کَمَا نَصَّ عَلَیهِ فِی الْهِندِیَة (جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ میں اس پر نص کی گئی ہے)۔ غرض جن صورتوں میں جائداد اس کی ملک ہے، اسے وقف کر سکتی ہے، مدارس کے

مہتمم اُسے لے سکتے ہیں اور جس صورت میں جائداد اُس کی ملک نہیں، وہ اسے وقف نہیں کرسکتی، نہ اس کے وقف کرنے سے وقف ہوا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جائیداد کسی فقیر محتاج مسلمان کو ہبہ کر کے قبضہ کرادے اگرچہ اپنے کسی عزیز قریب مثل ماں بہن وغیرہ کو، اور وہ وقف کردے یا یہ اس سے خرید کرا گرچہ ایک پیسے کو یا اس سے اپنے نام ہبہ کرا کے قبضہ میں کر کے خود وقف کردے، اب یہ وقف صحیح ہوگا اور مدرسہ میں اس کا صرف حلال۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاوی رضویہ، جلد 16، ص:122-121)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی نعت خواں یا واعظ پر جو لوگ پیشگی طے کیے بغیر رضا کارانہ طور پر پیسہ نچھاور کرتے ہیں، وہ اُن کے لیے حرام نہیں ہے۔

عام لنگر پر صدقاتِ واجبہ کی رقم نہیں لگائی جاسکتی

سوال:

آج کل بہت سارے ادارے لوگوں کو مفت کھانا کھلانے کا کام کر رہے ہیں، زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ کھانا کھانے والوں میں لوگوں کی بڑی تعداد مستحق بھی نہیں ہوتی، یہ لوگ کام کر کے کھانے کے بجائے ایسی جگہوں سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے کھانا کی ضرورت پوری کرتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ ایسا عمل جو بظاہر نیک ہو، لیکن معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہو تو کیا یہ عمل درست ہے؟۔ کیا ایسے ادارے ہونے چاہییں اور کیا ایسا عمل سنت سے ثابت ہے؟

(فرخ خان، شاہ فیصل ٹاؤن)

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۙ﴿۳۸﴾ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۛ﴿ؔ۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ۟ يَتَسَآءَلُوْنَ ۙ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۙ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ﴿۴۶﴾ حَتّٰۤى اَتٰىنَا

الْيَقِيْنُ ؁

ترجمہ:''ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے، سوائے دائیں طرف والوں کے، وہ جنتوں میں (رہیں گے)، وہ مجرموں سے سوال کریں گے کہ کون سی بات تمہیں جہنم میں لے گئی، وہ کہیں گے: ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہم بے ہودہ کاموں میں مشغول رہتے تھے اور ہم یومِ جزا کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ موت آگئی''۔(المدثر:47-38)

(۲) فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ؁ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؁ فَكُّ رَقَبَةٍ ؁ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ؁ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ؁ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ؁

ترجمہ:''پھر وہ بے تامل گھاٹی میں کیوں نہ داخل ہوا اور آپ کیا سمجھے کہ وہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟، (قرض یا غلامی سے) کسی کی گردن آزاد کرانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا، ایسے یتیم کو جو قرابت دار بھی ہو یا ایسے مسکین کو جو افتادۂ خاک ہو''۔(البلد:16-11)

(۳) اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ؁ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ؁ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؁

ترجمہ:''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا''۔(الماعون:3-1)

ان آیاتِ مبارکہ سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

(الف) ان اُمور میں سے، جو جہنمیوں کے جہنّم میں جانے کا سبب بنیں گے، ایک مسکینوں کو کھانا نہ کھلانا ہے۔

(ب) یہ کہ آخرت کی دشوار گزار منزل سے کامیابی سے گزرنا اُن لوگوں کے لیے آسان ہوگا، جو

(۱) طوقِ غلامی یا بارِ قرض یا تاوان سے کسی مصیبت میں مبتلا شخص کی گردن چھڑائے،

(۲) کسی افلاس زدہ مسکین کو کھانا کھلائے، خواہ وہ قرابت دار مسکین ہو یا افتادۂ خاک مسکین

ہو۔

(ج) یتیم پر ترس کھانا اور رحم کرنا۔

کھانا کھلانا فی نفسہٖ ایسا ثوابِ جاریہ ہے جسے شریعتِ مطہرہ میں باعثِ اجر بیان فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰى جُوْعٍ أَطْعَمَهُ اللهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ، وأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰى مُسْلِمًا عَلٰى ظَمَأٍ سَقَاهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الرَّحِيْقِ الْمَخْتُوْمِ۔

ترجمہ: ''جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو بھوک کے وقت کھانا کھلائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھلوں (نعمتوں) سے کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو سخت پیاس کے وقت پانی پلائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی مہر بند شرابِ طہور پلائے گا''۔

(سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:1679)

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''پانی یا شربت کی سبیل لگانا، جب کہ بہ نیت محمود اور خالصاً لوجہ اللہ ثواب رسانی ارواحِ طیبہ ائمۂ اَطہار مقصود ہو، تو بلاشبہ بہتر و مستحب و کارِ ثواب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان عالی شان ہے:

اِذَا کَثُرَتْ ذُنُوْبُکَ فَاسْقِ الْمَآءَ عَلَی الْمَآءِ تَتَنَاثَرُ کَمَا یَتَنَاثَرُ الْوَرَقُ مِنَ الشَّجَرِ فِی الرِّیْحِ الْعَاصِفِ، رَوَاہُ الْخَطِیْبُ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

ترجمہ: ''جب تیرے گناہ زیادہ ہوجائیں تو (پیاسوں کو) بہ کثرت پانی پلا، اس طرح تیرے گناہ جھڑ جائیں گے جیسے سخت آندھی میں درخت کے پتے جھڑتے ہیں''۔

(رواہ الخطیب عن انس بن مالک)

اسی طرح کھانا کھلانا، لنگر بانٹنا بھی باعثِ اجر ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یُبَاھِیْ مَلٰٓئِکَتَہٗ بِالَّذِیْنَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ مِنْ عَبِیْدِہٖ، رَوَاہُ اَبُو الشَّیْخِ فِی الثَّوَابِ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا۔

ترجمہ: ''بے شک، اللہ تعالیٰ اُن (فیاض بندوں) پر فرشتوں کے سامنے فخر و مسرت کا اظہار

فرماتا ہے، جو اس کے (محتاج) بندوں کو (بھوک کی حالت میں) کھانا کھلاتے ہیں، (رواہ ابو الشیخ فی الثواب عن الحسن مرسلا)۔ مگر لنگر لٹانا جس میں لوگ چھتوں پر بیٹھ کر روٹی وغیرہ پھینکتے ہیں، کچھ ہاتھوں میں جاتی ہیں، کچھ زمین پر گرتی ہیں اور کچھ پاؤں کے نیچے آتی ہیں، یہ منع ہے کہ اس میں رزقِ الٰہی کی بے تعظیمی ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 24، ص: 520،521، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن)

آج کل چوکوں اور چوراہوں پر بالخصوص رمضان المبارک کے مہینے میں بعض لوگ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ وغیرہ کی رقوم سے عام لنگر کھلاتے ہیں، جس میں اس بات کی کوئی تمیز نہیں ہوتی کہ یہ لوگ مستحقِ زکوٰۃ ہیں یا نہیں؟، اس میں غیر مسلم بھی آکر شامل ہو سکتے ہیں جبکہ وہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں بن سکتے۔ اگر بالفرض سبھی لنگر کھانے والے مستحق ہوں تو بھی اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے محض اباحت (یعنی کسی چیز کو کسی مستحق کے استعمال کے لیے مباح کردینا) کافی نہیں بلکہ اس کو مالک بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کے ادا کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے اور اس طرح سے زکوٰۃ دینے والے اپنے فرض سے بری نہیں ہوں گے۔ اور جو تنظیمیں اس طرح کا نظام چلاتی ہیں، وہ بھی عنداللہ جوابدہ ہوں گی، البتہ اگر نفلی خیرات (Charity) کے طور پر کوئی یہ لنگر چلا رہا ہے تو نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ ہے۔ ویسے ہمارے نزدیک یہ طریقہ احترامِ انسانیت کے منافی ہے۔

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا رُكْنُهَا فَالتَّمْلِيكُ لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: ''أَدُّوا عَنْ كُلِّ حُرٍّ وَعَبْدٍ'' الحديث، وَالْأَدَاءُ هُوَ التَّمْلِيكُ فَلَا يَتَأَدَّى بِطَعَامِ الْإِبَاحَةِ وَبِمَا لَيْسَ بِتَمْلِيكٍ أَصْلًا وَلَا بِمَا لَيْسَ بِتَمْلِيكٍ مُطْلَقٍ، وَالْمَسَائِلُ الْمَبْنِيَّةُ عَلَيْهِ ذَكَرْنَاهَا فِي زَكَاةِ الْمَالِ، وَشَرَائِطُ الرُّكْنِ أَيْضًا مَا ذَكَرْنَا هُنَاكَ، غَيْرَ أَنَّ إِسْلَامَ الْمُؤَدَّى إِلَيْهِ هٰهُنَا لَيْسَ بِشَرْطٍ لِجَوَازِ الْأَدَاءِ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٍ فَيَجُوزُ دَفْعُهَا إِلَى أَهْلِ الذِّمَّةِ، وَعِنْدَ أَبِي يُوسُفَ وَالشَّافِعِيِّ شَرْطٌ،

وَلَایَجُوزُ الدَّفعُ اِلَیھِم،

ترجمہ:''صدقۂ فطر کا ایک رکن تملیک (یعنی فقیر کو مالک بنا دینا) ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے:''ہر آزاد اور غلام کی طرف سے ادا کرو''۔ اور ادا کے معنی ہیں مالک بنا دینا، لہٰذا اگر فقیر کے لیے کھانا مباح کردیا جائے (یعنی اسے کہا جائے کہ بیٹھ کر کھالو، لیکر جانے کی اجازت نہیں) تو صدقۂ فطر ادا نہیں ہوگا، اسی طرح ہر اُس صورت میں ادا نہیں ہوگا جس میں اصلاً تملیک نہ ہو یا مطلقاً نہ ہو۔ اس پر جو مسائل مبنی ہیں، وہ ہم نے''زکوٰۃ المال'' میں لکھ دیے ہیں اور وہاں پر رکنِ تملیک کی شرائط بھی لکھ دی ہیں، سوائے اس کے کہ جسے صدقۂ فطر دیا جارہا ہے، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا ذمی کو بھی دے سکتے ہیں اور امام ابو یوسف اور امام شافعی کے نزدیک مُؤدّٰی (یعنی جسے صدقۂ فطر دیا جارہا ہے) کا مسلمان ہونا شرط ہے اور ذمیوں کو دینا جائز نہیں ہے''۔ (بدائع الصنائع، جلد:2، ص:112)

ان اداروں کو چاہیے کہ عام لنگر کھلانے کے لیے زکوٰۃ یا فطرہ کی رقم صرف نہ کریں بلکہ نفلی صدقات سے یہ لنگر چلائیں یا اس مقصد کے لیے علیحدہ سے خیراتی فنڈ قائم کریں۔ بھوکے اور ضرورت مند کو کھانا کھلانے سے معاشرے میں کون سا فساد برپا ہورہا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں اور نہ ہی سائل نے اس کی تشریح کی ہے۔ ممکن ہے اُن کا یہ گمان ہو کہ لوگ محنت سے جی چرائیں گے اور مفت خورے بن جائیں گے، بہرحال عام لنگر میں یہ امکان تو رہتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ٘ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْۚ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًاؕ

ترجمہ:''(صدقات کا مال) ان فقراء کے لیے ہے، جنہیں اللہ کی راہ میں روک دیا گیا ہو (جیسے مجاہد یا دین کا طالب عالم اپنی روزی کی تلاش میں) زمین میں چل پھر نہیں سکتے، ان (کی حقیقتِ حال) سے ناواقف شخص (اُن کی عزتِ نفس کی وجہ سے) انہیں مال دار سمجھے گا،

آپ انہیں ان کی نشانیوں سے پہچان لیں گے، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے''۔

(بقرہ:273)

خیر کے کام میں اگر کسی خرابی کا احتمال ہو تو اُس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، نہ یہ کہ بھلائی کو مٹانے کے درپے ہو جائے، وہ لوگ جو ''تَعَاوُنْ عَلَی الْبِرّ'' نہیں کرتے، وہ ''مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ'' (خیر کے کاموں میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے) بھی نہ بنیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 80 کروڑ لوگ غذائی قلت کا شکار ہیں، تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ دنیا بھر میں تقریباً ایک ارب تیس کروڑ ٹن خوراک یومیہ ضائع ہوتی ہے، تقاریب میں جس قدر کھانا ضائع کیا جاتا ہے، کبھی اُس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی۔

ڈاکوؤں سے مزاحمت میں مارا جانا

سوال:

اگر کسی شخص کے ساتھ خدانخواستہ ڈکیتی ہو تو کیا وہ اپنی چیز بچانے کے لیے مزاحمت کر سکتا ہے؟ جبکہ اسے اس بات کا علم بھی ہو کہ ڈاکو کے پاس ہتھیار ہے اور وہ اسے نقصان پہنچا سکتا ہے، اگر انسان ڈاکوؤں سے مزاحمت پر قتل ہو جائے تو کیا یہ خودکشی کے مترادف تو نہیں؟، (محمد اکرام، فیصل آباد)۔

جواب:

انسانی جان اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، ہمیں اس کے استعمال کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ہم اپنی جان کے مالک نہیں ہیں، اس لیے ہمیں خود اپنی جان یا کسی عضو کو بھی ہلاک کرنے یا تلف کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيدَةٍ فَحَدِيدَتُهُ فِي يَدِهِ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ شَرِبَ سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ تَرَدَّى مِنْ جَبَلٍ

فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَرَدَّى فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی ہتھیار سے اپنے آپ کو ہلاک کرے گا تو وہ ہتھیار اس شخص کے ہاتھ میں ہوگا اور اس ہتھیار کو جہنم میں اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا اور ہمیشہ اسی کیفیتِ عذاب میں رہے گا۔ جو شخص زہر پی کر اپنے آپ کو ہلاک کرے گا تو وہ جہنم میں ہمیشہ زہر کھانے کی اذیت میں مبتلا رہے گا اور جو شخص پہاڑ سے گر کر اپنے آپ کو ہلاک کرے گا تو وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ لڑھکتا رہے گا''۔ (صحیح مسلم:109)

اسی طرح ہم پر لازم ہے کہ دوسروں کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کریں اور حدیث پاک میں شرک کے بعد قتلِ ناحق کو سب سے بڑا کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قتلِ ناحق کرنے والے کو آخرت کے دائمی عذاب کا حق دار قرار دیا ہے اور دنیا میں ہر جرم کی طرح عدالت میں قتلِ ناحق کے ثابت ہونے کے دو طریقے ہیں: (۱) اقرارِ جرم، (۲) ایسے دو گواہ جو عدالت کے معیار پر پورا اترتے ہوں۔

ہر انسان پر اپنی جان، مال اور آبرو کا تحفظ لازم ہے۔ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے سے منع کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ترجمہ: ''اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، (البقرہ:195)''۔ اس سے مراد اپنے آپ کو ایسے حالات سے دوچار کرنا یا ایسے طریقے اختیار کرنا کہ جن میں جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو۔

آج کل ڈکیتی کا کلچر عام ہے۔ اسلام میں اور جدید قانون میں ہر شخص کو اپنے تحفظ (Self Defence) کا حق حاصل ہے۔ اگر صورتِ حال ایسی ہے کہ ڈاکو کے پاس ہتھیار ہے، خواہ وہ تیز دھار خنجر ہو یا ٹی ٹی اور بندوق ہو یا کلاشنکوف ہو اور ایک شخص نہتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور مقابلے کا استحقاق رکھنے کے باوجود عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی جان بچائے، تاہم اگر کوئی مسلمان اپنے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا، تو وہ شہید کے حکم میں ہے، حدیث پاک میں ہے: عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى

اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِہِ فَھُوَ شَھِیدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُونَ أَھْلِہِ، أَوْ دُونَ دَمِہِ، أَوْ دُونَ دِینِہِ فَھُوَ شَھِیدٌ

ترجمہ: ''نبی ﷺ سے روایت ہے: جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے اور جو شخص اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی جان یا دین کی حفاظت میں مارا گیا، وہ بھی شہید ہے''۔ (سنن ابوداؤد: 4757)''۔

تاہم اگر کوئی نہتا شخص کسی مسلح ڈاکو کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا، تو وہ ظلماً اور ناحق مارا گیا اور شہید کے حکم میں ہے اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ اُس نے اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالا یا خدانخواستہ خودکشی کی۔

داڑھی کا مذاق اڑانا

سوال:

اگر کوئی شخص داڑھی کا مذاق اڑائے اور کہے: ''تمہاری داڑھی سکھوں کی طرح ہے''، اس کے لیے کیا حکم ہے؟۔ (محمد ناصر خان چشتی، تونسہ شریف)

جواب:

اگر کوئی شخص داڑھی کو سنتِ رسول سمجھتے ہوئے اس کی تحقیر واہانت کرے تو اسے فقہائے کرام نے فعلِ کفر قرار دیا ہے، ایسے شخص کو توبہ کر کے تجدیدِ ایمان کرنی چاہیے، اس لیے کہ داڑھی اسلام کا شعار ہے اور سنتِ رسول ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص سنت سے قطع نظر کسی شخص کی داڑھی کی خاص وضع کا مذاق اڑاتا ہے، تو یہ اگرچہ انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، لیکن کفر نہیں ہے، علامہ علی القاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں:

وَفِی الْجَوَاھِرِ أَوْقَالَ: صَوْتٌ طَرْفَۃٌ حِیْنَ سَمِعَ الأَذَانَ أَوْ قِرَاءَ ۃَ الْقُرآنِ اِسْتِھْزَاءً کَفَرَ، وقولہ: اِسْتِھْزَاءً یُفِیْدُ مَا قَرَّرْنَا سَابِقًا حَیْثُ أَطْلَقَہ، وَفِی التَّتِمَّۃِ أَوْقَالَ لِمُؤَذِّنٍ یُؤَذِّنُ اِسْتِھْزَاءً بِأَذَانِہٖ: مَنْ ھٰذَا الْمَحْرُوْمُ الَّذِیْ یُؤَذِّنُ، وَفِی ''الْمُحِیْطِ''، أَوْقَالَ: ھٰذَا صَوْتٌ غَیْرُ الْمُتَعَارِفِ أَوْ صَوْتُ الأَجَانِبِ کَفَرَ فِی الْکُلِّ۔ أقُوْلُ: فَإِذَا سَمِعَ صَوْتَ مُؤَذِّنٍ غَرِیْبٍ

فَقَالَ: هٰذَا صَوْتُ أَجْنَبِيٍّ، أَوْغَيْرُ مَعْرُوْفٍ لَايَكْفُرْ، وَيُرِيْدُ مَاقَرَّرْنَا، قَوْلُهٗ: وَإِنْ قَالَ لِغَيْرِ الْمُؤَذِّنِ لَا يَكْفُرُ، يَعْنِيْ إِذَا أَذَّنَ بِغَيْرِ وَقْتٍ اِسْتِهْزَاءً، فَقَالَ لَهٗ هٰذِهِ الْأَلْفَاظُ لَا يَكْفُرْ۔

ترجمہ: ''اور ''جواہر'' میں ہے: یا مؤذن کی اذان سن کر استہزاء اور مذاق کے طور پر کہا: عجیب ہی آواز ہے یا تلاوتِ قرآن کا مذاق اڑایا، اس نے کفر کیا یا مذاق کے طور پر مؤذن کی اذان سن کر کہا: یہ کون مسکین (محروم) اذان دے رہا ہے اور ''محیط'' میں ہے: یا کہا: یہ تو عجیب سی غیر معروف آواز ہے، ان تمام صورتوں میں اس نے کفر کیا، (شرح ملا علی القاری علی الفقہ الاکبر: 303)''۔ فقہائے کرام نے زجر وتوبیخ اور وعید کے طور پر شعائرِ اسلام کے استخفاف، اہانت اور استہزاء کو کفر قرار دیا ہے اور اس سے اجتناب لازم قرار دیا ہے۔

ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون کے استعمال کا شرعی حکم

سوال:

حالیہ دنوں میں ایک سعودی اسکالر نے فتویٰ دیا ہے کہ ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون کا استعمال حرام ہے، اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ (گلفام احمد، لاہور)

جواب:

انسان پر اپنی اور دوسروں کی جان کا تحفظ لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ

ترجمہ: ''اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔ (بقرہ:195)

شریعت میں ایک حرام قطعی ہوتا ہے، یعنی وہ اُمور جنہیں اللہ عزّوجلّ یا اس کے رسول مکرم ﷺ نے حرام قرار دیا ہو اور وہ ایسی شرعی دلیل سے ثابت ہو جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے اور جو قطعیُ الثبوت اور ظنّی الدلالت یا اُس کے برعکس ہو، اُسے مکروہِ تحریمی کہتے ہیں۔

ڈرائیونگ میں بے احتیاطی سے حادثے کا رونما ہونا ایک ظنّی امر ہے، لہٰذا ایسے اُمور کو کُتبِ فقہ میں ''محظورات وممنوعات'' (Forbidden) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ڈرائیونگ

کے دوران ذراسی بے توجہی خدانخواستہ کسی حادثے کا سبب بن سکتی ہے، خاص طور پر ہائی وے اور موٹروے پر جہاں ٹریفک کی رفتار عام طور پر انتہائی حد پر یا بعض اوقات اُس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا احتیاطی تدبیر کے طور پر ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون استعمال کرنے پر پابندی کا قانون درست ہے، کیونکہ اسلام کا ایک اصول ''سدِّ ذرائع'' ہے، یعنی خطرات یا برائی کے امکانات کا سدِّ باب کرنا۔ ہمارے مالیاتی اداروں اور بنکوں میں اسے Risk Control Management کہتے ہیں۔ سعودی مفتی/اسکالر نے جوفتویٰ دیا ہے، اُس کی تفصیلات ہماری نظر سے نہیں گزریں، اس لیے بطورِ خاص اس کے مندرجات یا پیش کردہ دلائل اُس کے بارے میں رائے دینا، اُس کا جائزہ لیے بغیر مناسب نہیں ہے۔ تاہم اس حوالے سے حکومت کو تعزیری قانون بنانے اور اُس کو نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہے اور اگر قانون پہلے سے موجود ہے، تو قانون شکنی انسان کے لیے بے توقیری کا باعث ہوتی ہے اور مسلمان کے لیے اپنی عزتِ نفس کا تحفظ بھی لازم ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَهٗ. قَالُوْا: وَکَیْفَ یُذِلُّ نَفْسَهٗ؟ قَالَ: یَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا یُطِیْقُ۔

ترجمہ:''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خود کو بے توقیر کرے، صحابہ کرام نے عرض کی: وہ خود کو کیسے بے توقیر کرے گا؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے آپ کو ایسی مصیبت میں مبتلا کرنا جس کے تحمّل کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو''۔ (سُنن ترمذی: 2254)

ظاہر ہے کہ قانون شکنی کرکے بندہ اپنے آپ کو بے توقیر کرتا ہے، خود اپنے لیے مصیبت کو دعوت دیتا ہے اور اس کو حدیث مبارک میں ''تذلیل'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت

سوال:

ایک حدیث ہے: ''جس نے مجھے خواب میں دیکھا، وہ جہنم میں نہیں جائے گا''، حدیث بیان کرنے میں اگر کوئی کمی بیشی ہوئی تو اللہ معاف فرمائے۔ میں نے ایک عالم سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر اعمال اچھے ہوں تو جہنم میں نہیں جائے گا، ورنہ صرف خواب میں زیارت ہونے سے جہنم سے نجات نہیں ملے گی۔ آپ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (فرحان انجم)۔

جواب:

آپ نے جو حدیث نقل کی ہے، اس طرح کی کوئی حدیث ہمارے علم میں نہیں، البتہ یہ حدیث تو ہے:

وَمَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِیْ، فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ فِیْ صُوْرَتِیْ، وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''جس نے خواب میں مجھے دیکھا، اُس نے مجھے ہی دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا اور جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 110، 6197)

اس حدیث مبارک سے یہ امر ثابت ہے کہ سعادت مند مومن کو ہی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت رضامندی کی حالت میں ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے اُس کے جنتی ہونے اور حسنِ عاقبت کے بارے میں اچھا گمان کیا جا سکتا ہے اور اس کے شواہد اس کی زندگی میں نظر آنے چاہییں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ ہماری نماز مقبول ہوگئی؟، آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ

ترجمہ: ''بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے''۔ (عنکبوت: 45)

سو اگر نمازی اس آیت کا مصداق بنتا ہے، تو یہ اس کی نماز کے مقبول ہونے کی ظاہری علامت ہے، غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

وسوسے کا علاج

سوال:

میں پنج وقتہ نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہوں، لیکن شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے، ہر وقت گندی سوچ اور برے خیالات آتے ہیں، میں بچنا چاہتا ہوں، مجھے کوئی ورد بتادیں۔ (جہانگیر، کراچی)

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○

ترجمہ: ''اگر شیطان تمہیں کوئی وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ طلب کرو، بے شک وہ بہت سننے والا، جاننے والا ہے''۔ (اعراف: 200)

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب شیطان انسان کو برائی کی طرف راغب کرے تو انسان کو شیطان کے وسوسوں سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں شیطانی وسوسوں سے پناہ مانگنے کا طریقہ ''سورۃ النّاس'' میں بیان کیا گیا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِکِ النَّاسِ ۙ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ○

ترجمہ: ''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمائیے! میں سب لوگوں کے رب کی پناہ لیتا ہوں، سب لوگوں کے بادشاہ کی، سب لوگوں کے معبود کی (پناہ لیتا ہوں) پیچھے ہٹ کر چھپ جانے والے کے وسوسہ ڈالنے کے شر سے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، جو جنات اور انسانوں میں سے ہے، (الناس: 4تا6)''۔ یعنی شیطانی وسوسوں اور برے خیالات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ الشَّیْطَانَ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ کَذِئْبِ الْغَنَمِ یَاْخُذُ الشَّاذَّةَ وَالْقَاصِیَةَ وَالنَّاحِیَةَ وَاِیَّاکُمْ وَالشِّعَابَ وَعَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شیطان آدمی کا بھیڑیا ہے، جیسے بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے، جو ریوڑ سے الگ ہوجانے والی، دور رہ جانے والی اور کسی جانب الگ چلے جانے والی بکری کو پکڑ (کر شکار کر) لیتا ہے، پس تم گھاٹیوں سے بچو اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ وابستہ رہو، (یعنی دین میں اجماعِ اُمت سے الگ راہ اختیار نہ کرو)''۔ (مشکوٰۃ المصابیح، ص: 31)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَسَاَلُوْهُ: اِنَّا نَجِدُ فِیْ اَنْفُسِنَا مَا یَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ یَتَکَلَّمَ بِهٖ، قَالَ: اَوَ قَدْ وَجَدْتُمُوْهُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ، قَالَ: ذَاكَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بعض صحابہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ ہمارے دلوں میں بعض اوقات ایسے گندے خیالات آتے ہیں، جن کا بیان کرنا بھی ہم بڑا گناہ سمجھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں واقعی ایسے خیالات آتے ہیں؟، اُنہوں نے عرض کیا: جی ہاں!، فرمایا: یہ تو عین ایمان ہے''۔ (صحیح مسلم: 338)

اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کا وسوسے ڈالنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے، کیونکہ شیطان ایمان کا ڈاکو ہے اور یہ وہیں ڈاکا ڈالتا ہے، جہاں اُسے مطلوبہ دولت ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: سُئِلَ النَّبِیُّ ﷺ عَنِ الْوَسْوَسَةِ؟، قَالَ: تِلْكَ مَحْضُ الْاِیْمَانِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے

وسوسہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایمانِ خالص (کی نشانی) ہے''۔
(صحیح مسلم:340)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : لَا یَزَالُ النَّاسُ یَتَسَاءَلُوْنَ حتّٰی یُقَالَ: هٰذَا، خَلَقَ اللهُ الْخَلْقَ، فَمَنْ خَلَقَ اللهَ؟، فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَیْئًا فَلْیَقُلْ: آمَنْتُ بِاللهِ۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگ ایک دوسرے سے مسلسل اس طرح کے سوالات کرتے رہیں گے حتیٰ کہ یہ کہا جائے گا کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟، جس شخص کو اس بارے میں کوئی تردد ہو وہ یوں کہے: میں اللہ پر ایمان لایا ہوں''۔ (صحیح مسلم:343)

علامہ یحییٰ بن شرف النووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

قَالَ الْاِمَامُ الْمَازِرِیُّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی: ظَاهِرُ الْحَدِیْثِ اَنَّه ﷺ اَمَرَهُمْ اَنْ یَدْفَعُوْا الْخَوَاطِرَ بِالْاِعْرَاضِ عَنْهَا، وَالرَّدِّ لَهَا مِنْ غَیْرِ اسْتِدْلَالٍ وَلَا نَظْرٍ فِیْ اِبْطَالِهَا۔

ترجمہ:'' علامہ مازری نے کہا ہے کہ ظاہر حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے وساوس کو دفع کرنے کے لیے ان سے اعراض (یعنی توجہ ہٹانے) کا حکم دیا ہے اور یہ کہ کسی دلیل یا غور وفکر کے بغیر فوراً ایسے برے خیالات کو رد کر دیا جائے''۔

(شرح مسلم للنووی، جلد1، ص:364)

اعراض سے مراد یہ ہے کہ ان وسوسوں کو دل ودماغ میں جگہ دے کر اُن پر غور وفکر کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے، بلکہ ان وسوسوں کو پہلے ہی مرحلے میں دماغ سے جھٹک کر دل کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مکرم ﷺ کے ذکر وفکر میں مشغول رکھنا چاہیے۔ یہی طریقہ برے خوابوں کے بارے میں اختیار کرنا چاہیے کہ اُنہیں جھٹک دے، یہ نہیں کہ دنیا بھر کے ماہرین سے ان کی تعبیریں پوچھتا رہے:

عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ یَقُوْلُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ یَقُوْلُ: اَلرُّؤْیَا مِنَ اللهِ وَالْحُلُمُ

مِنَ الشَّیْطَانِ فَاِذَا رَاٰی اَحَدُکُمْ شَیْئًا یَکْرَھُہٗ فَلْیَنْفُثْ عَنْ یَسَارِہٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلْیَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّھَا فَاِنَّھَا لَنْ تَضُرَّہٗ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے، پس جب تم میں سے کوئی شخص ناگوار خواب دیکھے، تو بائیں جانب تین بار تھتکار دے اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے، پھر اس کو اس خواب سے کوئی ضرر نہیں ہوگا، (یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ ھٰذَا اور لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْم پڑھ لے)''۔
(صحیح مسلم: 2261)